انوارِ ابوالکلام

انوارِ ابوالکلام

مُرتّبہ

علی جواد زیدی

ثقافتی سب کمیٹی ـ جشن بہارِ کشمیر ـ سری نگر ـ کشمیر

حرفِ آغاز

مئی ۱۹۵۸ء میں "خالدِ کشمیر" عالی جناب غلام محمد بخشی، وزیر اعظم جموں و کشمیر کی رہبری میں "جشنِ بہار کشمیر" کا ایک شاندار پروگرام مرتب ہوا، اور پندرہ دنوں تک سری نگر ہی میں نہیں بلکہ ریاست کے گوشے گوشے میں ثقافتی تفریحی اور ادبی چہل پہل رہی۔ بخشی صاحب کا یہ بھی خیال تھا کہ اس موقع پر کچھ کام کی بات بھی ہونی چاہیئے۔ چنانچہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے علمی، صحافتی، سیاسی اور سماجی خدمات اور اُن کے سوانح و نظریات کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے خیال سے ایک بزمِ مباحثہ "آزاد سیمنار" کے نام سے منعقد ہوئی۔ اس کے اجلاس لگاتار سات دنوں تک ہوتے رہے اور ایس۔ پی کالج کے وسیع ہال میں طلباء، اساتذہ، ادیب اور شاعر جمع ہو کر ہندستان ہی نہیں بلکہ ایشیا کی اس غیر معمولی شخصیت کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے رہے۔

اجلاس کا آغاز جنابِ خالدِ کشمیر نے ایک مختصر مگر دلپذیر استقبالیہ سے کیا اور رسمِ افتتاح جنابِ صدرِ ریاست یوراج کرن سنگھ صاحب کے ہاتھوں انجام پائی۔ پہلے اجلاس کی صدارت جناب ڈاکٹر کیسکر صاحب نے فرمائی۔ دوسرے اجلاسوں میں جناب گوپالا ریڈی صاحب (وزیر مالیات) جناب جسٹس جیالال صاحب کلم (سابق جج کشمیر ہائی کورٹ) جناب جسٹس مرتضیٰ افضل علی صاحب (جج کشمیر ہائی کورٹ)، پروفیسر سلطان وانٹ اور جناب شیام لال صراف (وزیر تعلیمات حکومت جموں و کشمیر) نے صدارت کے فرائض انجام دیے۔ آخری جلاس کی صدارت بھی جناب ڈاکٹر کیسکر صاحب (وزیر اطلاعات و نشریات حکومت ہند) کے سپرد ہوئی اور ممدوح نے تمام مباحثوں پر روشنی ڈالی۔ چند ہی اصحاب کے خطبہ ہائے صدارت دستیاب ہو پائے۔ دوسرے بزرگوں نے زبانی تقریریں فرمائیں اور جن کے تفصیلی نوٹ نہیں لئے جا سکے۔

سنہ ۱۹۵۹ء

قیمت سات روپے

ناشر

ثقافتی سب کمیٹی ۔ جشن بہار کشمیر۔ سری نگر ۔ کشمیر

مطبوعہ

نامی پریس لکھنؤ

ہر مقالہ اپنی جگہ پر ایک مبسوط تحقیقی کتاب ہوگا۔ اس جامع صفات شخصیت کے افکار و معتقدات و سوانح پر قلم اٹھانا بیحد مشکل کام ہے۔ لکھتے وقت معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک زخار سمندر کے کنارے بیٹھے سیپیاں جمع کر رہے ہیں، بڑی بڑی لہریں اٹھتی ہیں اور بڑے شور و جوش کے ساتھ سمندر کی طرف بڑھ آتی ہیں اور ہر بار سمندر کی تہوں سے نئی نئی سیپیاں نکال کر ایک ساحل پر بکھیر دیتی ہیں۔ ان سیپیوں کا جمع کرنا وسعت داماں ہی پر نہیں لہروں کے فیض پر بھی منحصر ہے ـــــ اور سمندر تو بہرحال سمندر ہے۔ لیکن اس احساس عظمت کے باوجود مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی باک نہیں ہے کہ یہ مجموعہ اپنی نوعیت میں منفرد ہے اور بہت کی اہم اور ضروری معلومات کا حامل ہے۔

مقالہ نگاروں نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں وہ اُن کے ذاتی خیالات ہیں۔ ان میں سے کچھ خیالات سے مرتب کو بھی اتفاق نہیں ہے لیکن ہر خیال سے ہر فرد کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ ویسے حتی الوسع کوشش یہی رہی ہے کہ بے سود اُلجھنیں اور مباحث نہ پیدا ہوں تو اچھا ہے۔ ایک نشست میں تھوڑی سی گرمی بھی آ گئی تھی اور ایک دلچسپ بحث سُننے میں آئی تھی۔ ڈاکٹر اختر اورینوی نے مولانا آزاد کے فکری رجحانات پر بحث کرتے ہوئے یہ کہہ دیا تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد، میرزا غلام احمد کے خیالات سے بھی متاثر تھے۔ پروفیسر حسن شاہ صاحب نے اس خیال کی تردید کی چند اور مقررین نے بھی دلچسپی لی۔ لیکن گرما گرمی کی یہ فضا ہوا کے تیز جھونکے کی طرح آئی اور نکل گئی۔ اسی طرح معصوم رضا نے مولانا کی سیاسی زندگی کے سلسلے میں مولانا آزاد کے ایک قصیدہ کا ذکر کیا جو بادشاہ کی شان میں تھا۔ اس پر یہ بات واضح کر دی گئی کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب مولانا کی عمر دس گیارہ برس کی تھی۔ اس سے کوئی سیاسی نتیجہ مستنبط نہیں کیا جا سکتا۔ اولاً تو اس سن کی بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی، دوسرے جنگ عظیم کے قبل تک ہندستانی سیاست کا عام رنگ یہی تھا کہ وہ حکومت سے چند اصلاحیں چاہتے تھے اور چند مراعات کے طالب تھے لیکن تاج کی وفاداری کا اظہار بھی کرتے تھے۔ اس لئے اگر بچپن میں کوئی رسمی سا قصیدہ کسی کی فرمائش پر مولانا نے تفریحاً لکھ بھی دیا ہو تو اس سے مولانا کے افکار سیاسی میں کوئی تضاد پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے ملک کے عام سیاسی دھاروں سے پوری طرح متاثر ہو کر ہر دور میں ہندستان کی تحریک آزادی کا ساتھ دیا اور کوئی ایسا اقدام ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں کیا جس سے ہماری تحریک پر

جن لوگوں نے مختلف موضوعات پر مقالے پڑھے وہ یہ ہیں (۱) جناب خواجہ غلام السیدین سابق سکریٹری وزارت تعلیم حکومت ہند (۲) ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پرنسپل چادرگھاٹ گورنمنٹ کالج حیدرآباد (۳) ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، صدر شعبۂ اردو دلی یونیورسٹی (۴) مولانا اختر علی تلہری صاحب (۵) ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی، لکچرار اردو، مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ (۶) ڈاکٹر اختر اورینوی، صدر شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ (۷) جناب علی سردار جعفری اور راقم الحروف، علی جواد زیدی۔ ان مقررین کے علاوہ جناب کمال احمد صدیقی، جناب شمیم احمد شمیم، پروفیسر حسن شاہ صاحب، جناب راہی معصوم رضا، ڈاکٹر اعظمی، علی جواد زیدی، جناب خواجہ غلام السیدین صاحب نے مباحثوں میں بھی حصہ لیا۔ جناب غلام رسول نازکی اور جناب یوسف ٹینگ نے حضرت مولانا کی تحریروں کے اقتباسات پڑھ کر سنائے اور جناب فضا ابن فیضی نے ابوالکلام آزاد کی شان میں عقیدت کا منظوم خراج پیش کیا۔

جیسا کہ اس کتاب سے ظاہر ہوگا، بزم مباحثہ میں حضرت مولنٰا ابوالکلام آزاد کے بارے میں چند اہم موضوعات زیر بحث آئے، مثلاً حضرت مولنٰا کا فلسفۂ تعلیم، ہندستانی ثقافت کی نشاۃ ثانیہ میں ممدوح کا حصہ، مکاتیب آزاد، آزاد کا ذوق جمالیات، سیاسی نظریات و خدمات، آزاد بہ حیثیت مفسر قرآن مجید، آزاد انسان، فلسفی اور سیاسی رہبر۔ آزاد بہ حیثیت صحافی وغیرہ۔ ابوالکلام آزاد پر اُن کے وصال کے بعد کئی اخبارات و رسائل نے ہندستان اور پاکستان میں خاص نمبر نکالے اور مخصوص مضامین شائع کئے۔ آج اسی موضوع پر اُردو میں خاصا لٹریچر تیار ہوگیا ہے، پھر بھی اس ہمہ جہات شخصیت کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے اور اب بھی بہت سے گوشے تشنۂ روشنی ہیں۔ اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ اس بزم مباحثہ میں جو مقالے پڑھے گئے ان کو ایک مجموعے کی شکل میں شائع کرادیا جائے اور وزیر اعظم جموں و کشمیر جناب غلام محمد بخشی صاحب نے مقالوں کی اشاعت کا خاطر خواہ انتظام بھی کرادیا۔

اب یہ مجموعہ آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ اس سے یہ توقع رکھنی تو بے سود ہوگی کہ

حضرت نیاز فتحپوری، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، مولوی محمد اسمٰعیل خاں صاحب وغیرہ اپنی چند دشواریوں کی بنا پر عین وقت پہ نہ آسکے ورنہ اس سمینار میں چند اور مقربین کو بھی سننے کا موقع مل جاتا۔

جناب مولنا کی ذات گرامی کے بارے میں مختصر سے چند صفحات میں لکھنا، آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔ علماء و صلحاء کے ایک نمایاں خانوادے کے ایک فرد کی حیثیت سے آپ نے علوم اسلامی پر اپنے بچپن ہی میں عبور حاصل کرلیا تھا لیکن یہاں بھی مسلک تقلیدی نہیں تھا۔ ہر جادے پر مشعل بدست گئے بلکہ نئے نئے رستوں سے منزل کی طرف بڑھے۔ آزاد خیالی اور تشکیک کی کسوٹیوں پر حقائق اسلامی کو پرکھا اور بہت سے توہمات اور مفروضات کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ تصوف کی مسند اور اس سے متعلق ذرائع آمدنی سے کنارہ کشی اس لئے اختیار کی کہ طبیعت کو اس سے رغبت نہ ہوئی۔ پھر صحافت کی طرف آئے تو اردو کی صحافت میں طرح نو ڈالی اور اپنے قلم کی گرم رفتاری سے دلوں اور دماغوں میں ہلچل پیدا کردی۔ ایسا اسلوب اختیار کیا جس کے نقال تو بہت سے ابھرے لیکن ان کے اسلوب کی کرامتوں کو نہ پاسکے۔ مذہب اور سیاست دونوں ہی میدانوں میں مولانا کی صحافت نے تہلکہ برپا کردیا۔ سیاست کی طرف آئے تو مسلمانوں کی سیاست کا رخ ہی بدل دیا اور سرسید کی بے جان پالیسی کو ختم کرکے ایک نئی جاندار تحریک کی بنیاد ڈالی اور برطانوی سازشوں کا جو جال مشرق وسطیٰ اور ہندستان میں بچھا ہوا تھا اُسکے پردے چاک کرکے رکھ دیے۔ مسلمانوں کو سیاسیات عالم سے روشناس کرایا اور ہند کی جنگ آزادی میں سرِبکف لا کھڑا کیا۔ پھر طرح طرح کے طوفان اُٹھے، مخالفتوں کے زلزلے آئے مگر مولانا قطب کی طرح اٹل رہے۔ مولانا نہ صرف ہند جدید کے معماروں میں ہیں بلکہ تمام عالم اسلامی میں جو آزادی کی تحریکیں اٹھی ہیں اور آج ایشیا کی سرزمین جس طرح بیرونی تسلّط سے آزاد ہوتی جارہی ہے اُس میں مولانا کے علم و عمل اور تبلیغ و تجزیہ کو بڑا دخل ہو وہ صحیح معنوں میں موجودہ ایشیا کے عظیم معماروں میں ہیں۔ ہندستان کی آزادی کے بعد مولنا پر ہندستان کے لئے ایک ایسے طرزِ تعلیم اور فلسفۂ تعلیم کی بنیاد ڈالنے کی ذمہ داری عائد ہوئی جو ہندستان کی موجودہ اور مستقبل کی ضرورتیات کو کافی بھی ہو اور ہندستان کے ان دونوں سمتوں میں انھوں نے مجتہدانہ شان سے کام کیا اور ایسی پالیسیاں

صرف آئے۔ خود گاندھی جی نے پہلی جنگ عظیم میں رضاکارانہ کام کیا لیکن وہ بعد میں ۱۹۴۲ء کے اندولن کے بانی بھی بنے۔ اسی طرح مولانا نے رسم زمانہ کے مطابق بچپن میں ایک رسمی سا قصیدہ بھی لکھا لیکن چند ہی دنوں میں انھوں نے اسی سلطان کی حکومت پر کاری ضربیں بھی لگانا شروع کیں۔

ان دونوں مباحث سے اصل مقالوں میں تفصیلی گفتگو ہوئی ہے، یہاں ان باتوں کا ذکر سرسری طور سے صرف اس لئے کردیا گیا ہے کہ مباحثوں کی تصویر کا یہ رُخ بھی آپ کے سامنے آجائے کہ ہر موضوع پر باقاعدہ اعتراضات اور سوالات کئے گئے اور پوری آزادی اظہار کیا تھا لوگوں نے مسائل کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ اس سے ایک اہم فائدہ یہ بھی ہوا کہ یہی اعتراضات وسوالات جو ممکن ہے کہ اور دلوں میں بھی اُبھرتے اور تشنۂ جواب رہ جاتے وہ اہل علم کے اس مجمع میں اُٹھائے گئے تو اُن کا تشفی بخش جواب بھی مل گیا۔

ایک تو یہ اپنے موضوع پر اس نوعیت کی پہلی تالیف ہے۔ دوسرے اس میں مولانا کی زندگی اور تعلیمات کے تمام اہم پہلو سامنے آگئے ہیں۔ تمام مقالہ نگار مولانا سے خاص علاقہ رکھنے کے علاوہ ادیب بھی ہیں اور ان میں سے کچھ جنگ آزادی کے مختلف ادوار میں مولانا کی قیادت میں کام کرنے کا شرف بھی حاصل کرچکے ہیں۔ مولانا کو زیادہ قریب سے دیکھنے والوں میں خواجہ غلام السیدین صاحب کا اسم گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ موصوف حضرت مولانا کی وزارت میں کافی عرصہ تک جوائنٹ سکریٹری اور سکریٹری کے عہدہ پر فائز رہے ہیں اور اس سے پہلے بھی ان حضرات کے مابین ادبی اور روحانی تعلقات رہے ہیں۔ سیاست میں ڈاکٹر کیسکر، ڈاکٹر گوپالا ریڈی، علی سردار جعفری اور راقم الحروف بھی اپنی اپنی حیثیتوں کے مطابق اس آفتاب سے کسب ضیا کرتے رہے ہیں۔ جناب غلام محمد بخشی صاحب سے تو مولانا کو اُنس خاص تھا اور جناب بخشی صاحب بھی حضرت مولانا کے بیحد گرویدہ اور رشیدا رہے۔ اس آستان صدق وصفا وعلم وعمل پر خلوص ومحبت کا تحفہ لے کر حاضر ہونے والوں میں خالد کشمیر کا نام سرفہرست ہے۔ اس طرح صدارت مقالہ خوانی کے فرائض ایسے ارباب کے سپرد ہوئے تھے جو مولانا کے کارناموں اور ان کے سوانح حیات سے پوری واقفیت رکھتے تھے۔ چند حضرات مثلاً

آخر میں ایک بار خالد کشمیر جناب بخشی غلام محمد صاحب کا شکریہ ادا کرنا بیحد ضروری ہے
جن کی زبردست مالی اور اخلاقی امداد کے بغیر یہ کام سرانجام ہی نہ ہو پاتا۔ ممدوح ہی کی فیاضیوں کی
بدولت یہ مجموعہ کتابی صورت میں آپ حضرات کے سامنے آرہا ہے خدا سے دعا ہے کہ یہ کتاب
اور بہت سی کتابوں کا پیش خیمہ ثابت ہو۔

علی جواد زیدی

مرتّب کرائیں جن پر آج بھی عمل کیا جا رہا ہے اور جس کے نتائج ابھی سے نظر آنے لگے ہیں۔ ادب کے میدان میں مولانا نے ایک شاعر کی حیثیت سے بچپن ہی میں قدم رکھا تھا لیکن زندگی کی ہنگامہ خیزیوں میں اس طرف توجہ دینے کا زیادہ موقع نہ مل سکا۔ پھر بھی آپ کے مکاتیب، تذکرہ، تفسیر اور صحافتی تحریروں میں بے شمار ادب پارے بکھرے پڑے ہیں جن کی تابندگی کو امتداد زمانہ بھی ماند نہیں کر سکتا۔ ایک ادیب کی حیثیت سے بھی مولانا کا مرتبہ عظیم ہے اور اس پر کافی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ پھر اُن کے طرز بود و ماند، نوشت و خواند، فکر و عمل میں جو سنبھلا ہوا، شُستہ مگر بھاری بھرکم احساس جمالیات ملتا تھا اس نے انھیں خانہ نشینی اور گوشہ گیری کے باوجود ایک بزم ہی نہیں ایک ادارہ بنا دیا تھا۔ بہ حیثیت عالمِ دین، اُن کی تفسیر تمام زبانوں کی تفسیروں میں نمایاں ہو۔ اس نے تاریک سے تاریک گوشوں میں روشنی کی شمع روشن کی ہے اور اسلام کی حقیقی اور بنیادی تعلیمات کو روایتی آلائشوں سے پاک کر کے فکر عصر حاضر کا چیلنج قبول کرنے کی ہمت عطا کی ہے۔ غرض جس میدان میں بھی ابوالکلام آزاد نے قدم بڑھائے دھوم مچا دی، ہر جگہ طالبانِ حق کو کچھ نہ کچھ عطا کیا اور عزم و صداقت کے جھنڈے گاڑ دئے۔ لیکن ہم نے اُن کی خاطر خواہ قدر نہیں کی۔ دو قومی نظریے کی تحریک کے زمانہ میں حضرت آزاد کی دل آزاری کا کوئی طریقہ باقی نہیں رکھا گیا اور ممدوح کے دل و دماغ پر بے اصولیوں، کج رویوں اور شر پسندیوں کے گہرے زخم لگائے گئے لیکن حضرت مولانا پہاڑوں کا جلال اور سکوت سینے میں چھپائے رہے اور کسی سے اُلجھے نہ باز پرس کی۔ البتہ اُس راستے سے سر مو نہ ہٹے جو بچپن میں اختیار کر لیا تھا۔ اب اِن اقدار کے مالک کہاں ملتے ہیں؟

اگر آنے والے صفحات میں آپ کو اس عظیم المرتبت شخصیت کا دُھندلا سا پرتو بھی نظر آئے گا تو میں سمجھوں گا کہ یہ سعی رائگاں نہیں گئی۔ مولانا کا پیغام آج بھی زندہ ہے اور ہندستان کو علی العموم اور مسلمانوں اور دوسری مذہبی اور لسانی اقلیتوں کو خصوصاً مولانا کے طرز عمل اور فکر انداز سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ کاش یہ صفحات تجسّس و تحقیق کا یہ جذبہ دلوں میں بیدار کر دیں!

ترتیب

اجلاس اوّل منعقدہ ۲۰ مئی ۱۹۵۸ء

اجلاس دوم منعقدہ ۲۱ مئی ۱۹۵۸ء

اجلاس سوم منعقدہ ۲۲ مئی ۱۹۵۸ء



جناب بخشی غلام محمد صاحب
وزیر اعظم جموں و کشمیر

اجلاس چہارم منعقدہ ۲۳ مئی ۱۹۵۸ء

اجلاس پنجم منعقدہ ۲۵ مئی ۱۹۵۸ء

اجلاس ششم منعقدہ ۲۶ مئی ۱۹۵۸ء

اجلاس ہفتم منعقدہ ۲۷ مئی ۱۹۵۸ء

خطبۂ استقبالیہ

عالی جناب بخشی غلام محمد صاحب، وزیر اعظم جموں و کشمیر

جناب یوراج صاحب، ڈاکٹر کیسکر صاحب، ادیبو اور عزیزو!

میں آپ سب حضرات کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے میری آواز پر لبیک کہی اور دور دراز مقامات سے تشریف لاکر ہماری عزت افزائی فرمائی۔ میں جانتا ہوں کہ آپ نے جس آمادگی اور شفقت کا اظہار کیا ہے اُس میں آپ کے اُس خلوص کو بھی بڑا دخل ہے جو آپ کو حضرت مولٰینا کی ذات گرامی سے ہے اور اسی لئے مجھے امید ہے کہ آپ ہماری کوتاہیوں پر نظر نہ رکھیں گے اور جو تکلیفیں ہوں گی انھیں نظر انداز کردیں گے۔ آپ ہی کی طرح میں بھی حضرت مولٰینا کے حلقہ بگوشوں میں ہوں اور اسی لئے آپ سب حضرات کو اپنی ہی طرح ایک عظیم الشان برادری ــــ ابوالکلامی برادری ــــ کا ایک رُکن سمجھتے ہوئے رسمیات اور تکلفات سے احتراز کرتا ہوں۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ حضرت مولٰینا کے بارے میں آپ سے کیا کہوں۔ اظہار خیالات کے لئے الفاظ نہیں مل پاتے کیونکہ جب کچھ سوچنا چاہتا ہوں تو تخیل کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آتی ہیں اور میں کچھ جذباتی سا ہوجاتا ہوں ــــ وہ میرے لئے صرف ایک سیاسی لیڈر نہیں تھے، صرف ایک عالم دین بھی نہیں تھے بلکہ بہت کچھ تھے۔ مجھے اُن سے وہی عقیدت تھی جو ایک نیاز مند مرید کو پیر و مرشد سے ہوسکتی ہے۔ افسوس کہ وہ صحبتیں اور اس بارگاہ علم و عمل کی محفلیں اب ہمیشہ کے لئے خواب خیال ہوچکی ہیں اور ہم اُس فضا کو اُس ماحول کو پھر واپس نہیں لاسکتے۔ جن لوگوں کو ان صحبتوں میں نیازمندانہ شریک ہونے کا فخر حاصل نہیں ہوا ہے اُن کے لئے یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اِن میں کتنی گزری ہوئی اور آنیوالی صدیوں کی پرچھائیاں تھیں اور کتنی بارگاہوں کی رونقیں تھیں اور آج کتنا عظیم خلا پیدا ہوگیا ہے۔ اسلئے اس احساس محرومی کا

قلم سے جہاد کیسے ہو سکتا ہے، مولانا نے کر دکھایا۔ انھوں نے قدامت اور رجعت پسندی کے قلعے مسمار کردیے۔ سامراج کو اُس کے سب سے مضبوط قلعے میں گھس کر شکست دی اور دور سرسید کی اصلاحی سیاست کی رَو ہی موڑ دی۔ اُن کی تحریروں کی شوخی، بے باکی اور دلیری آج بھی رگ میں نئی تازگی بھر سکتی ہے اور منجمد خون کو بھی گرم رفتاری سکھا سکتی ہے۔

تحریر ہی نہیں تقریر میں بھی مولانا کا جواب نہیں تھا۔ یقیناً ہندستان میں اتنا بڑا مقرر آج تک پیدا نہیں ہوا۔ علمائے اعلام کا اجتماع ہو یا صرف سیاسی پنڈتوں کا، نوجوانوں کی محفل ہو یا ضعیفوں کی مجلس ہو، منبر ہو یا پلیٹ فارم، نماز جمعہ کا خطبہ ہو یا سیاسی جماعت کے سالانہ اجتماع کی صدارت کی تقریر، ہر جگہ الفاظ کبھی اپنی نرم روی سے میدانوں کے سُبک خرام دریا بن جاتے تھے اور کبھی دہکتے لپکتے شعلوں میں تبدیل ہو جاتے تھے۔ وہ سامعین پر جادو کر دیتے تھے اور جو چاہتے تھے وہ وقتی طور سے ضرور ذہنوں میں اُتار دیتے تھے۔

جیسے وہ سب سے نوجوان صحافی تھے ویسے ہی وہ سب سے کم عمر سیاسی بھی تھے۔ لیکن اپنی کم عمری کے باوجود وہ عزت و احترام سے دیکھے جاتے تھے۔ بعض وقت تو لوگ یقین نہیں کرتے تھے کہ یہی کمسن نوجوان "الہلال" کا مدیر اور مسلمانوں کی نئی سیاسیات کا رہبر ہے۔ چنانچہ علامہ شبلی نعمانی، مولانا اسمٰعیل میرٹھی اور مولانا حالی پہلی نظر میں دھوکا کھا گئے اور اپنی آنکھوں پر بھروسہ کرنے کو جلدی تیار نہیں ہوتے تھے۔

مولانا کے سب سے بڑے علمی کارنامے یقیناً "تذکرہ" اور "ترجمان القرآن" ہیں جن سے اعتقادی مسائل پر نئی روشنی پڑتی ہے۔ "ترجمان القرآن" نے تو کتاب محکم کے بہت سے راز سربستہ سینوں پر کھولے اور ربانی پیغام کی ہمہ گیری اور آفاقیت سے ہمیں آشنا کرایا، اس طرح جیسے ہم پہلے کبھی آشنا نہیں ہوئے تھے۔ "غبار خاطر" اور متعدد چھوٹے رسائل اور خطبات میں بھی انھوں نے معارف و علوم کے دریا کو کوزوں میں بند کر دیے تھے اور یقیناً علم و ادب کے پروانے ان شمعوں کے گرد مدتوں گردش کرتے رہیں گے۔

تذکرہ جذباتی ہوئے بغیر ممکن بھی نہیں ہے۔ پھر بھی اس علمی اور ادبی اجتماع میں جذبات کو قابو میں رکھنا ہوگا اور آنکھوں میں اُمڈتے ہوئے آنسوؤں کو پی جانا ہوگا۔

مولانا آزاد مرحوم کو کشمیر اور اہلِ کشمیر سے تا عمر جو شغف رہا ہے اُس کے پیشِ نظر کشمیر میں مولانا مرحوم کی زندگی اور اُن کے کارناموں کے بارے میں محفل مباحثہ کا منعقد ہونا فطری ہے۔ ہندوستان کے مشہور اہلِ علم اور اہلِ کمال یہاں اس تقریب کے لئے یکجا ہوئے ہیں اور ہمیں اُن سے مولانا کی ہمہ گیر اور جامع شخصیت کے بارے میں بہت کچھ سُننے کو ملے گا جو یقیناً ہم سب کے لئے باعث مسرت و ہدایت ہوگا۔
جو حضرات اس مباحثے میں شریک ہو رہے ہیں ان کی علمی اور ادبی حیثیت اظہر من الشمس ہے اور میں اس سلسلے میں کچھ عرض کرنا تحصیل حاصل سمجھتا ہوں۔ آزاد سیمینار بزم مباحثہ کا پروگرام بھی آپ کو معلوم ہو رہا ہے میں اسکی تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا۔ یہاں جو مقالات پڑھے جائیں گے اُن سے نہ صرف مولانا کے گوناگوں صفات و کمالات پر روشنی پڑے گی بلکہ گزشتہ نصف صدی کے تمام ادبی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی رجحانات اور تحریکات کا ذکر ناگزیر طور پر آئے گا کیونکہ مولانا ان تمام تحریکوں سے گہری اور علمی دلچسپی لیتے تھے اور باوجود ادعائے گوشہ نشینی کے ان میں کئی اہم رجحانات کے بانی بھی تھے۔

آپ کو معلوم ہے کہ ہم اس وقت جشنِ بہار کشمیر منا رہے ہیں۔ یہ خوشیوں اور مسرتوں کی تقریب ہے۔ اس موقع پر مولانا مرحوم کی یاد بار بار آتی ہے جو دلوں کو برماتی ہے مگر روح کو گرماتی بھی ہے کیونکہ ان کی یاد انھیں تحریکوں کی یاد ہے جن کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ اسی لئے ہم نے جشنِ بہار کشمیر کی مسرتوں میں اُس روحانی مسرت کا اضافہ کرنا ضروری سمجھا جو قوموں کی بقا و ترقی کی ضامن ہے۔
صحیح ثقافتی اور تفریحی تحریکیں واضح مقصدیت کے بغیر بے معنی ہی نہیں مضر بھی ہو سکتی ہیں اس لئے جب ہم جشنِ بہار ایسی تقریب میں بھی مشغول ہوتے ہیں تو ہم یہ نہیں بھول سکتے کہ یہ ہندوستان کی تعمیرِ نو کا ایک ایک اہم جزو ہے، جس کے اہم ترین معماروں میں مولانا کا نام ہمیشہ احترام کے ساتھ لیا جاتا رہے گا۔

مولانا کی زندگی طوفانوں کی زندگی تھی۔ ایک ایک لمحۂ حیات کبھی شرارہ اور کبھی سیلاب بنا رہا۔
اس طغیان و ہیجان کا صحیح اندازہ لگانا ہو تو مولانا کی دعوتِ "الہلال" و "البلاغ" کی یاد تازہ کرنی ہوگی۔

تھا لیکن ایک رکن ادارہ کی حیثیت سے ان جھگڑوں سے مفر ناممکن بھی تھا۔ جھگڑے اٹھتے تھے تو ان کو سلجھانے کے لئے نظر سب سے پہلے مولانا ہی پر پڑتی تھی۔

مولانا کو بعض ثانوی معاملات میں اپنے رفقائے کار سے اختلافات بھی ہوئے لیکن یہ اختلافات نظری تھے اسی لئے ان لوگوں کے باہمی تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ سب ایک دوسرے کی رایوں کا احترام کرتے تھے اور تنظیم و انضباط کے قائل تھے۔

غرض مولانا ایک ادارہ تھے۔ ایک عہد آفریں فرد تھے۔ وہ جمہوریت پسند تھے لیکن ایک ناقابل تسخیر انفرادیت کے مالک بھی تھے۔ وہ دور، وہ عہد، وہ ادارہ آج ہم میں نہیں ہے لیکن ان کے کارنامے ہمیشہ زندہ رہیں گے اور آنے والی نسلوں کی بھی ہدایت کرتے رہیں گے۔

اس مختصر سے وقت میں ان کے تمام کمالات پر روشنی ڈالنا دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کے مرادف ہے۔ اس لئے میں آپ کے اور معزز مقررین کے درمیان زیادہ دیر تک حائل نہیں رہنا چاہتا۔ ہاں اہل کشمیر کی طرف سے ہندوستان بھر کے ادیبوں اور سیاست دانوں کو یہ یقین ضرور دلانا چاہتا ہوں کہ ہم مولانا کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا اپنا فخر سمجھتے رہیں گے اور اپنے معاملات میں فرقہ پرستی اور تنگ نظری کو کبھی قریب نہ آنے دیں گے جس طرح مولانا مرحوم نے متحدہ قومیت کے لئے کسی قربانی کے لئے دریغ نہیں کیا اسی طرح کشمیر کا بچہ بچہ اتحاد اور قومی سالمیت کے لئے ہر قربانی کو تیار ہے۔

مولانا آزاد زندہ باد

ہمارے وزیر تعلیم کی حیثیت سے بھی انھوں نے ہماری تعلیمی اور ثقافتی پالیسی کی تشکیل کے سلسلے میں انھوں نے ملک کی اہم خدمتیں انجام دی ہیں اور اپنی بلند نظری کا سکہ ہندستانیوں ہی کے دلوں پر نہیں بلکہ ساری دُنیا، بالخصوص تمام عالم اسلام پر بٹھا دیا۔ ہندستان کے ثقافتی احیا میں بھی ان کا خاص حصہ رہا ہے اور آرٹ اور ادب کی اکاڈمیوں کا قیام اسکا ثبوت ہے۔

آج جب کہ ہمارے ملک میں بعض ناعاقبت اندیش یہ کوشش کر رہے ہیں کہ لسانی اور علاقائی اختلافات کو ہوا دیکر وحدت قومی پر ضرب لگائی جائے، جب کہ زبان، ذات پات، رنگ اور نسل کے جھگڑے دُنیا کے مختلف گوشوں میں اُبھارے جا رہے ہیں، اتحاد و اتفاق کے اس بردست علمبردار کی زندگی کا گہرا مطالعہ یقیناً سبق آموز ثابت ہوگا۔ مولینا کی انسانیت دوستی اور آفاقیت رنگ و نسل یا قوم و وطن کی چار دیواریوں میں مقید و محدود نہیں تھی بلکہ اسکے دائرے میں ہر قوم اور ہر ملک کے افراد آتے ہیں۔ یہ روشنی کا مینارہ کس طرح فرقہ پرستی اور تنگ نظری کے طوفانوں میں بھی جگمگاتا رہا اپنی جگہ خود بڑی سبق آموز داستان ہے۔ آپ کے نظریات صرف منفیانہ نہیں تھے بلکہ استقامت و استحکام کے ساتھ ہر مخالفت کا مقابلہ کرتے ہوئے انھوں نے یہ حقیقت بار بار واضح کی کہ بنیادی اتحاد کے راستہ میں چھوٹے بڑے محدود مفاد حائل ہوتے رہتے ہیں۔ ان کو پہچاننے اور پرکھنے کی ضرورت ہے، تبھی نوع انسانی آگے بڑھ سکے گی ورنہ چھوٹے چھوٹے جھگڑوں اور قضیوں میں کھو کر رہ جائے گی اور بیکار باتوں میں اپنی قوت صرف کرتی رہے گی۔

مولینا رائے کے پکے تھے اور ایک بار سوچ سمجھ کے جو رائے قائم کر لیتے تھے پھر اُس سے انھیں منحرف کر لینا ناممکن تھا۔ مثلاً وہ تقسیم ہند کے مخالف تھے تو وہ اسوقت بھی مخالفت کرتے رہے جب ایک منزل پر ان کی آواز دا اعدا رہ گئی تھی۔ وہ مصالحت کم کرتے تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ وہ کٹر نہیں تھے۔ وہ بڑی بڑی گتھیاں سلجھا بھی لیا کرتے تھے۔ جنھوں نے اُن کو کانگریس کے تنظیمی جھگڑوں اور قضیوں کا فیصلہ کرتے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ کیسے صلح و اتفاق کی راہیں نکال لیا کرتے تھے۔ وہ کم آمیز بھی تھے اور گوشہ نشینی نے انھیں بہت سے جھگڑوں سے خود الگ کر دیا

L 5216



جناب یوراج کرن سنگھ صاحب
صدرِ ریاست جموں و کشمیر

خطبۂ افتتاحیہ

جناب یوراج کرن سنگھ صاحب صدر ریاست جموں وکشمیر

حضرات !

مجھے مسرت ہے کہ اس سیمنار کا افتتاح کرنے کے سلسلہ میں مجھے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرنے کا موقع ملا ہے لیکن میں اس امر کا اعتراف کر دینا چاہتا ہوں کہ میں ایک مبصر کی حیثیت سے ان کی زندگی اور کارناموں پر تبصرہ کرنے کا اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھتا ورنہ میں یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ میں نے اُن کی تصانیف کا غائر مطالعہ کیا ہے۔ اس لئے میں یہ پہلو اُن ممتاز فاضلوں اور ادیبوں پر چھوڑ رہا ہوں جو یہاں تشریف رکھتے ہیں۔

مولانا کی شخصیت کے متعدد پہلو تھے۔ تاریخ میں اُن کا نام ہندستان کے ایک عظیم فرزند کی حیثیت سے شمار کیا جائے گا۔ یہ اُن کی ہمہ دانی کا ثبوت ہے کہ ایک نہیں بلکہ متعدد شعبوں میں انھیں ایک بہت بلند درجہ حاصل تھا۔ وہ اوّلاً ایک زبردست محب وطن اور قومی رہنما تھے جنھوں جنگ آزادی میں ایک ممتاز حصہ لیا۔ ان کی مقناطیسی شخصیت، فرقہ واریت اور رجعت پسند طاقتوں کے خلاف جو ہندستان کے عوام کو گمراہ کرنے کے لئے مذہب کو آلۂ کار بنانا چاہتی تھیں، ہمیشہ صف آرا رہی۔ وہ ایک نامذہبی قومیت پر کامل عقیدہ رکھتے تھے۔ اس تمام عرصہ میں جب کہ وہ سیاسی سرگرمیوں میں پیش پیش تھے اُن کے اس عقیدہ کو بڑی صبر آزما منزلوں سے گزرنا پڑا لیکن اُس میں کوئی لغزش نہ پیدا ہونے پائی اور قومی آزادی کے لئے انھوں نے جو قربانیاں کیں ان کا علم ہر شخص کو ہے۔ مولانا کی دوسری صفت یہ تھی کہ وہ غیر معمولی ذہین اور طباع، ادب اسلامی کے فاضل، ایک ممتاز درجہ کے مصنف اور اُردو نثر میں ایک حسین اسلوب کے خالق تھے۔ اُن کی متعدد تصنیفوں، بالخصوص ترجمان القرآن"

"تذکرہ" اور "غبار خاطر" نے جن پر وہ افاضل جو یہاں شریک جلسہ ہیں تفصیلی تبصرہ کریں گے، انھیں اردو کے عظیم ترین فنکاروں میں شامل کر دیا ہے اور ہم میں سے ہر وہ شخص جسے اُن کی تقریر سُننے کا موقع ملا ہو جانتا ہے کہ اُن کا شمار ہمارے شیریں بیان اور سحر طراز مقرروں میں ہوتا تھا۔ مولانا کی تیسری خصوصیت یہ تھی کہ آزادی کے بعد جس کے حصول میں اُن کا بہت بڑا حصہ تھا، انھوں نے ایک رگ سیاست داں اور مرکزی وزیر تعلیم کی حیثیت سے دس برس سے زیادہ مدت تک ایک اہم کردار ادا کیا۔ اس دوران میں انھوں نے ہندستان کی ضروریات کے مطابق نظام تعلیم کو حیات نو دینے اور اُسے منضبط بنانے میں جو دلچسپی دکھائی اُسکی بدولت اس شعبہ میں کافی ترقی ہوئی۔ خالص تعلیمی سرگرمیوں کے علاوہ انھوں نے ثقافت کے اُس نشاۃ ثانیہ کی بھی سرپرستی کی جس کا آغاز سنہ ۴۷ء سے ہوا — ہندستان کی ہر سہ اکاڈمیوں اور انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنس ایسے اداروں کے قیام میں اُن کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی زندگی ہندستانی ثقافت کے حسین ترین پہلو کا مجسمہ تھی۔ ان کے غیر معمولی اخلاق نے دل موہ لیا تھا۔

میں اس مختصر تقریر کو چند ذاتی تاثرات کے اظہار پر ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ گزشتہ نو برسوں میں مجھے مولانا صاحب سے قریبی رابطے کے بہت موقعے ملے جیسا کہ آپ کو معلوم ہے انھیں کشمیر سے خصوصی محبت تھی۔ ان کے مشورے اور رہبری ہم سب کے لئے بڑی مفید اور قیمتی ثابت ہوئی۔ وہ ہر مسئلہ پر خواہ وہ کتنا ہی نازک ہو اس قدر پختہ کارانہ طور سے نظر ڈالتے تھے کہ ہمیں ایک نئی ڈھارس مل جاتی اور ہماری ہمت بندھ جاتی تھی۔ اس لئے انکی وفات میرے لئے ایک ذاتی نقصان ہے۔ وہ اب ہمارے درمیان میں نہیں رہ گئے ہیں لیکن ان کی زندگی اور کارنامے ہم سب کے لئے سرچشمۂ فیضان ثابت ہوں گے۔

میں بڑی مسرت کے ساتھ اس سیمنار کا افتتاح کرتا ہوں۔



جناب ڈاکٹر بی۔ وی۔ کیسکر
وزیر اطلاعات و نشریات حکومت ہند
آپ نے پہلے اجلاس کی صدارت کے علاوہ آخری
اجلاس میں اختتامی تقریر کی

خطبۂ صدارت

جناب ڈاکٹر بی۔ وی کیسکر وزیر اطلاعات و نشریات حکومت ہند

صدر ریاست، بخشی صاحب، خواتین و حضرات!

سب سے پہلے مجھے جشن بہار کے منتظمین کو مبارک باد دینے دیجئے کہ ان کے دل میں یہ نیک خیال آیا کہ اس موقع پر وہ ایک ایسا اجتماع کریں جس میں مولانا مرحوم کی، جن کا ہندستان کی قومی جنگ اور آزادی میں بہت بڑا حصہ رہا ہے، زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے۔ اگرچہ مولانا عوام کی نظروں کے سامنے ہمیشہ رہے لیکن ہمارے اہل وطن کی کافی تعداد ایسی ہے جو ان کی زندگی کے بہت سے اہم پہلوؤں سے واقف نہیں ہے اور یہ بالکل بجا ہوگا اگر وہ ہندستان کی عظیم ترین شخصیتوں میں سے ایک اہم شخصیت کے بارے میں مزید واقفیت حاصل کریں۔ ہندستان کی جنگ آزادی میں ہر قسم نے حصہ لیا اور ہر فرقہ کی عظیم ہستیوں نے ایک ایسے متحدہ ہندستان کی تخلیق میں مدد دی جس نے مذہب اور ذات پات کے سوال کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔ ان ہستیوں نے ایک ایسے ہندستان کی تعمیر کی کوشش کی جس کا قومیت اور سیکولرزم پر ایمان ہو۔ اس قومی جنگ کے حامیوں میں بہت سے مسلم اکابر بھی تھے۔ ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں، علی برادران اور مولانا صاحب کا شمار انھیں اکابرین میں تھا۔ لیکن ان کی بعض خصوصیات کی وجہ سے ہم مولانا صاحب کو سیکولرزم اور مذہب، بہ یک وقت دونوں کے مجموعہ کی نشانی قرار دے سکتے ہیں۔ مولانا اوائل عمر میں سیاست میں داخل ہوئے ___ ایسی عمر جس کے متعلق ہم عام طور سے یہ سمجھا کرتے ہیں کہ اس عمر کا لڑکا یا تو میٹرکولیشن کا طالب علم ہوگا یا کالج میں داخل ہوا ہوگا۔ دراصل وہ سیاسیات میں تقریباً سترہ سال کی عمر میں داخل ہو گئے تھے اور یہ وہ زمانہ تھا جب ہندستان کے مسلمان دو جداگانہ کیمپوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک کیمپ سرسید کا تھا

اور ایک کیمپ علمار کا۔ سرسید کا کیمپ عملی حیثیت سے ایسے وفاداروں کا کیمپ بناجارہا تھا جو برطانوی حکومت کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ وہ لوگ یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ یہی وہ طریقہ ہے جس سے سلمان اپنی شیرازہ بندی کرسکتے ہیں۔ دوسرا کیمپ جو برطانوی حکومت کے خلاف تھا اور قومی جنگ میں شریک ہونا چاہتا تھا اپنا الگ راستہ تلاش کررہا تھا اور رہنمائی کا طلب گار تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب مولانا نے اپنا مشہور اخبار "الہلال" نکالنا شروع کیا اور اس کے ذریعہ مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کی کوشش کی۔ ان کے اخبار نے جو اہم خدمات انجام دیں اُن کا علم سب کو ہے اور میرے بعد جو مقررین تشریف لائیں گے وہ اس پر مزید روشنی ڈالیں گے۔ میں زیادہ نہیں کہنا چاہتا مگر یہ ضرور عرض کروں گا کہ اُن کی جولانیٔ قلم نے اُس دور کے قومیت پسندانہ خیالات پر ایسا نقش چھوڑا کہ ایک ہی دو سال میں مولانا نے ایک ممتاز صحافی اور ملکی رہنما کی حیثیت سے اپنی ایک جگہ بنالی اور اپنی سیاسی زندگی کے پہلے دس برسوں میں انھوں نے جو درجہ حاصل کیا اُسے اُنھوں نے آخیر تک قائم رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ کم آدمی ایسے امتیاز اور ذہانت کا دعویٰ کرسکتے ہیں، وہ بڑے مستقل مزاج نیشنلسٹ تھے اور یہ بہت بڑی بات ہے کیونکہ ان کی پبلک زندگی کے انتیس چالیس برسوں میں بڑے نازک مواقع آئے۔ ان موقعوں پر انھیں بڑی صبر آزمائیوں کا سامنا کرنا پڑا اور بڑے سخت امتحانات سے گزرنا پڑا۔ اُن پر حملے کئے گئے، انھیں سب وستم کا نشانہ بنایا گیا مگر انھوں نے ہر چیز کا مقابلہ کیا اور اپنی جگہ ثابت قدم رہے۔ ایک لمحہ کے لئے بھی ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں ہونے پائی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ صحیح راستہ پر چل رہے ہیں۔ ہم ان کی شان میں ایک عظیم خراج عقیدت یہ پیش کرسکتے ہیں کہ یہ ان کی وفاشعاری اور غیر متزلزل جذبۂ قومیت تھا جس کی بدولت ہندستانی مسلمانوں کا ایک کثیر طبقہ کانگریس اور قومی تحریک کا ساتھ دیتا رہا۔ حصول آزادی کے بعد مولانا صاحب نے جو کانگریس پارٹی کے ایک زبردست رہنما بن چکے تھے آزاد ہندستان کے وزیر تعلیم کی حیثیت سے ملک کی ثقافتی اور تعلیمی ترقی میں بہت بڑا حصہ لیا۔ انھوں نے وزیر تعلیم، انچارج ثقافتی تعلیم کی حیثیت سے جو کام کئے اُن پر اس مقالے پر روشنی ڈالی جائیگی جو ابھی آپ کے سامنے پڑھا جائے گا۔ میں اسکی



جناب گوپالا ریڈی
وزیر مالیات وسول اخراجات۔ حکومت ہند



جناب پنڈت شیام لال صراف
وزیر تعلیمات حکومت جموں و کشمیر

ایسی ہستی شاذ و نادر ہی پائی جاتی ہے جو بہ یک وقت ایک زبردست اسکالر بھی ہو، ایک عظیم قومی رہنما بھی ہو، ایک جید عالم دین بھی ہو، ہر معنی میں ایک زبردست خطیب بھی ہو اور ہر لحاظ سے ایک عظیم ہستی بھی ہو۔ جب ہمارے سامنے ایک ایسی مکمل اور زبردست ہستی کی مثال موجود ہو تو مناسب یہی ہے کہ ہم اس سے کچھ سبق حاصل کریں اور اسی لئے مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ہم نے سری نگر میں، جو آج ایک بڑے نصب العین کی جس کیلئے مولانا لڑے، نمائندگی کرتا ہے، یہ سیمنار منعقد کیا۔ وہ نصب العین ایک ایسے ہندوستان کی تشکیل ہے جس میں ہر فرقہ اور ہر مذہب کے ماننے والے دوش بدوش مساوی حیثیت سے اور پر امن آزادی کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ یہی ان کا سب سے بڑا نصب العین تھا اور اسی لئے میں خیال کرتا ہوں کہ سری نگر ہی سب سے مناسب جگہ ہے جہاں ان کی زندگی اور تعلیمات پر پہلا سیمنار منعقد ہو۔ میں حکومت کشمیر کو اس قابل تعریف تحریک پر مبارک باد پیش کرتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ یہ تمام لکچر اور مقالے جو آئندہ ہفتہ آپ کے سامنے پڑھے جائیں گے مولانا کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کا مقصد پورا کریں گے۔ میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتا کیونکہ آج اور آئندہ جو مقرر آپ کے سامنے آئیں گے مختلف موضوعات پر تقریر کریں گے اور آپ کے سامنے آج میں جو کچھ کہوں گا وہ اس سے زیادہ واضح طور پر ان موضوعات پر روشنی ڈالیں گے۔ میں اب مسٹر غلام السیدین سے اپنا مقالہ سنانے کی درخواست کروں گا۔

تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے ملک میں ایک نئے ثقافتی امتزاج اور ایک نئی تعلیم کی بنیاد ڈالی۔ آپ کو معلوم ہے کہ بنیادی تعلیم اور تعلیم کے متعلق ایک نئے رویّہ انھوں نے ہمیشہ اصرار کیا اور اس کے بارے میں انھوں نے اکثر بڑے پُرزور طریقہ سے اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا۔

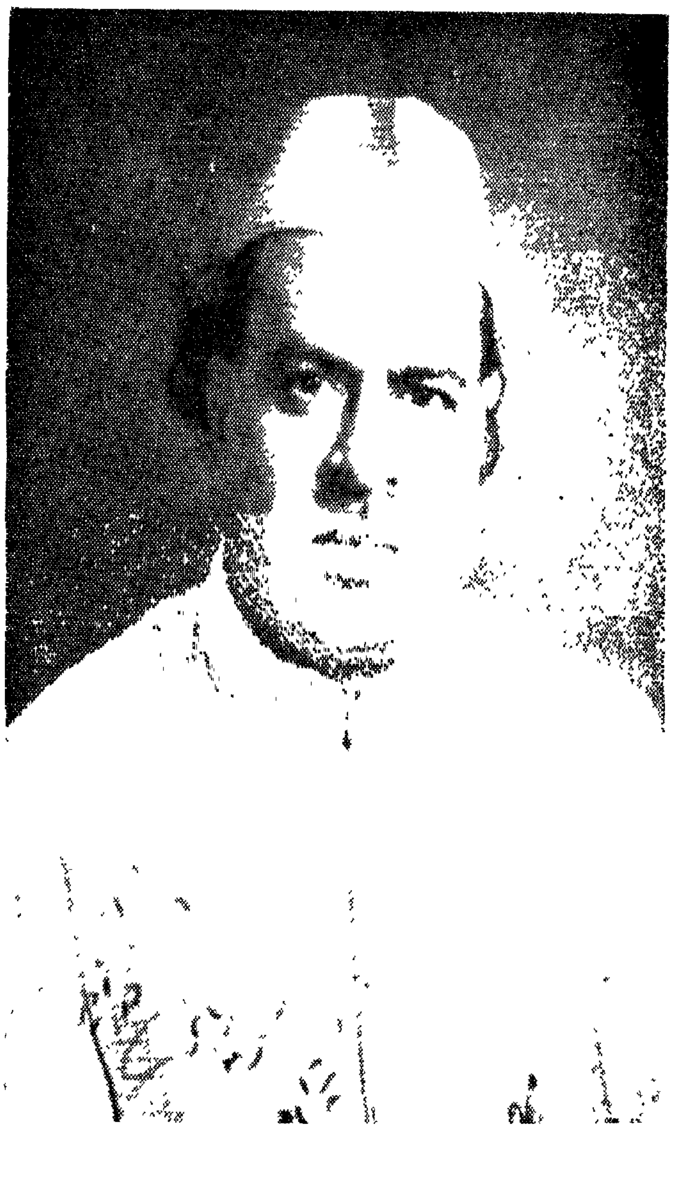
اس کے علاوہ وہ ایک بڑے شریف انسان اور ایک عظیم انسانیت نواز شخصیت کے مالک تھے۔ آج سے بیس برس قبل جب دونوں الہ آباد میں چند مہینوں تک ایک ہی جیل میں تھے میرا اور ان کا رابطہ قائم ہوا۔ میں اُن کے پاس ہر روز سہ پہر کو باتیں کرنے چلا جاتا کیونکہ وہ دن بھر پڑھتے اور مختلف مسائل پر گفتگو کرتے رہتے۔ دنیا کے ایک بڑے فاضل سے باتیں کرنے اور ہر موضوع پر اُس سے تبادلۂ خیال کا موقع ملنا بڑی بصیرت افروز چیز تھی۔ اس امر کے باوجود کہ وہ اتنے زبردست اسکالر تھے خود اپنے متعلق وہ بڑی انکساری برتتے تھے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ مجھے یاد ہے کہ میں نے ان کی میز پر بہت سی فرانسیسی کتابیں پڑی دیکھیں تو میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا آپ کو فرانسیسی ادب سے دلچسپی ہے اور اُس سے بخوبی واقف ہیں؟ اس کا انھوں نے جواب دیا "نہیں، یونہیں تھوڑی بہت واقفیت ہے"۔ اس کا پتہ مجھے بعد میں چلا کہ وہ فرانسیسی زبان کے بڑے ماہر ہیں اور اس کے ادب سے بخوبی واقف ہیں۔ درحقیقت یہ کبھی کو معلوم ہے کہ وہ کئی زبانیں جانتے تھے۔ عربی، فارسی اور اُردو کے تو وہ بڑے ماہر تھے ہی۔ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے بھی وہ بہت بڑے اسکالر تھے۔ اگرچہ وہ ان زبانوں میں گفتگو نہیں کرسکتے تھے مگر اس کے قطع نظر انھیں ان زبانوں پر بڑا عبور حاصل تھا اور فلسفہ ہو یا دوسرے موضوعات، ان پر وہ تازہ ترین کتابوں اور نقطہ ہائے خیال کا مطالعہ کرکے اپنے آپ کو جدید ترین نظریات سے ہمیشہ باخبر رکھتے تھے۔

میں نے ایسا کوئی مقرر نہیں دیکھا جو مولانا صاحب سے زیادہ فصیح و بلیغ تقریر کرسکتا ہو یا جسے مولانا مرحوم سے زیادہ زبان پر قدرت حاصل ہو۔ مجھے متعدد مرتبہ انکی تقریر سننے کا موقع ملا ہے ہر مرتبہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس موضوع کا بھی وہ انتخاب کرتے ہیں زبان پر انھیں کامل قدرت ہوتی ہے۔



جناب خواجہ غلام السیدین

ماہر تعلیم کی حیثیت سے عالمگیر شہرت کے مالک
مولانا آزاد کے رفیق خاص۔ کئی اہم کتابوں کے مصنف
سکریٹری۔ وزارت تعلیمات۔ حکومت ہند



جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

اُردو کے مشہور محقق اور متعدد کتابوں کے مصنف
بانی اُدارۂ ادبیات اُردو۔ حیدرآباد (دکن)
پرنسپل۔ گورنمنٹ کالج۔ چادرگھاٹ۔ حیدرآباد

مولانا آزاد کا تعلیمی فلسفہ

خواجہ غلام السیدین

کشمیر کے لئے سعادت اور مبارک باد کا مقام ہے کہ اس نے "آزاد سمینار" کے انعقاد میں پہل کی اور میں شکر گذار ہوں کہ آپ نے اس موقع پر مجھے بلا کر میری عزت افزائی کی۔ مولانا آزاد کی یاد کی پکار اور عقیدت کے جوش میں جو کشش ہے اس کے پیش نظر کیسے یہاں حاضر نہ ہوتا؟ جو زندگی میں نے اختیار کی ہے اس میں لکھنے اور بولنے کی ذمہ داریوں سے تو کیسے بچ سکتا ہوں لیکن شاید ہی کسی مضمون پر قلم اٹھاتے اپنی کوتاہ قلمی کا اور ذہن اور نظر کی تنگ دامنی کا اس درجہ شدید احساس ہوا ہو۔ انکار کر نہیں سکتا تھا، اقرار کیوں کروں کہ بغیر کافی وقت اور تیاری اور قابلیت کے اس شاداب موضوع کے ساتھ انصاف کرنا ممکن نہیں۔ اس لئے آج صرف اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ ان کے فکر و نظر کے سمندر میں سے چند سنگریزے جو ساحل سے نظر آتے ہیں آپ کے سامنے پیش کر دوں اور امید رکھوں کہ شاید زندگی کبھی اتنی مہلت اور توفیق دے کہ گوہر شناسوں کے سامنے اس کے بے بہا موتیوں کی نمائش بھی کر سکوں۔ اس لئے آج کی تقریر دراصل ان کے تعلیمی فلسفہ کی تفسیر نہیں بلکہ ان کے تعلیمی خیالات پر ایک مختصر سا تبصرہ ہے۔

معلم اور ماہر تعلیم کا لفظ دو معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک تو وہ لوگ جو تعلیم کے اصولوں اور نظریوں کا باقاعدہ مطالعہ کرتے ہیں اور اسکولوں اور کالجوں میں اس کا عملی تجربہ حاصل کرتے ہیں۔ ان کو تعلیم کا فنی ماہر کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جن کو قدرت نے ایک خلاق فکر دیا ہے۔ جو فلسفہ، مذہب، سیاست میں گہری نظر رکھتے ہیں، جو

جانتے ہیں کہ دنیا میں انسان کا کیا مقام ہے اور جن کی انگلیاں انسان کی زندگی اور اس کے امکانات کی نبض پر رہتی ہیں۔ یہ لوگ زندگی کو نئی قدروں اور نئی سمتوں سے روشناس کرتے ہیں اور تعلیم کو ان کے حصول کا ایک ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔ ان کے ذہن میں زندگی کی ایک حسین اور واضح تصویر ہوتی ہے ـــــ ماضی کی بنیادوں پر قائم، حال کے تقاضوں سے آشنا اور مستقبل کی طرف نگراں جس میں ان کا تخیل دلکش رنگ بھرتا ہے اور کبھی کبھی ان کو یہ سعادت بھی نصیب ہوتی ہے کہ وہ اسے عمل میں لانے کے لئے جدوجہد کریں۔

مردِ حُر سے نہیں پوشیدہ ضمیر تقدیر　　خواب میں دیکھتا ہے عالمِ نو کی تصویر
اور جب بانگ اذاں کرتی ہے بیدار اُسے　　کرتا ہے خواب میں دیکھی ہوئی دنیا تعمیر

مولانا آزاد کا شمار انھیں عصر آفریں معلموں میں ہے۔ انکی ساری زندگی ـــــ شاید ۱۳۔۱۴ سال کی عمر ہی سے ـــــ اسی تعلیمی جدوجہد یعنی دلوں اور دماغوں کے بنانے میں گذری۔ اس خواب کو حقیقت کا جامہ پہنانے کے لئے انھوں نے کیا کچھ نہیں دیا؟ اپنے علم و فضل کی گہرائی، اپنی مذہبی اور فلسفیانہ نظر، اپنی سیرت کی بلندی اور وقار، اپنی سیاسی سوجھ بوجھ، اپنی حق پرستی اور انصاف پسندی، اپنی خدمت اور ایثار، اپنی انسان دوستی، اپنی خودی کی تمکین اور اپنے عشق کا حوصلہ۔ اور اس تمام ساز و سامان کے ساتھ اور نفیر کا علم ہاتھ میں لئے انھوں نے اپنی زندگی کا شاندار جہاد شروع کیا جس کا ایک ہی مقصد تھا۔ اور وہ تھا بہتر افراد کی تربیت جن کی ذات میں بلند نظری، جرأت، رواداری اور دیانت داری کے چراغ روشن ہوں۔ اور ان کے ذریعے اور ان کی خاطر ایک بہتر سماج کی تشکیل جس میں انصاف، محبت، فراخ دلی اور معقولیت پسندی کی کارفرمائی ہو۔ اسی لئے انھوں نے اپنی تقریروں میں بارہا کہا کہ ہماری پنج سالہ یوجنا کا مرکزی مقصد مادّی وسائل اور ذرائع کی توسیع اور ان کا بہتر استعمال نہیں بلکہ ایک نیا ذہن اور نئی سیرت پیدا کرنا ہے اور اس کے لئے صنعت و حرفت، تجارت اور زراعت، بجلی اور پانی سے بھی زیادہ ضروری صحیح تعلیم کا رواج ہے۔



جناب جسٹس مرتضیٰ فضل علی
جج۔ جموں وکشمیر ہائی کورٹ



جناب جسٹس جیالال کلم
جج۔ جموں وکشمیر ہائی کورٹ



جناب پروفیسر محمد سلطان وانٹ
پروفیسر انگریزی۔ جموں وکشمیر یونی ورسٹی

تجربے کو بنایا۔ ظاہر ہے کہ یہ تینوں پہلو ایک دوسرے سے جدا نہیں بلکہ ایک ہی وحدت کے مظاہر ہیں لیکن ان کی اضافی اہمیت کا شعور ہر قوم اور عہد کے فکری رجحان پر روشنی ڈالتا ہے۔ مغرب نے نظر اٹھا کر اپنے خارجی ماحول کو دیکھا۔ مشرق نے نظر جھکا کر اندر نگاہ ڈالی۔ مغرب نے سائنس کے علمی مزاج کی قدر کی اور اس کی بے اندازہ قوت پر ایمان لایا۔ اس کے ائمۂ فکر ڈارون، فرائڈ اور مارکس قرار پائے۔ ڈارون نے ارتقا کے تصور کو اپنے فکر کی بنیاد قرار دیا۔ فرائڈ نے بتایا کہ انسانی ذہنیت ابھی تک ان پوشیدہ اور غیر شعوری جبلتوں کی تابع ہے جو اس کے ابتدائی حیوانی آغاز میں اس کی زندگی پر مسلط تھیں۔ مارکس کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان اور اس کی تاریخ تمام تر اپنے مادی ماحول اور تاریخی اور اقتصادی تحریکوں کی پیداوار ہے۔ لیکن باوجود اس مادیت پرستی کے، باوجود نظری طور پر جبر کا قائل ہونے کے، مغرب نے عملاً تقدیر پرستی کا شیوہ اختیار نہیں کیا بلکہ سائنس کو خضر راہ بنا کر سماج کی تعمیر نو کے لئے ایک شاندار جد و جہد کی۔ یہی چیز دور حاضر میں مغرب کے فکر کا امتیازی نشان ہے جس میں ہمارے لئے بھی عبرت اور ہدایت ہے۔

مشرق کی کہانی اس سے مختلف ہے۔ اس نے دنیا کو تصوف اور ویدانت کی نظر سے دیکھا اور اسے اس میں انسان کی روحانیت اور باطنی حقیقت کا جلوہ نظر آیا۔ صوفی انسان کو اس بحر ناپیدا کنار کی ایک موج، اس مہر جہانتاب کی ایک کرن سمجھتا ہے جس کی اصل ذات الٰہی ہے۔ وہ خود کو خدا سے جدا محض اس لئے سمجھتا ہے کہ اس کی آنکھوں پر جہالت کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ وہ محض ایک حیوان نہیں جس نے ارتقا کی بہت سی منزلیں طے کرلی ہوں بلکہ اس میں ذات خداوندی کا پرتو ہے یعنی اس جرم صغیر میں ساری کائنات سمائی ہوئی ہے۔ اس طرح مشرق کے فکر نے انسان کا رشتہ خدا سے جوڑا اور اسے اس بلند مقام پر پہنچا دیا جہاں وہ خدا کا نائب اور افضل مخلوقات بن جاتا ہے۔ لہٰذا مشرقی تصور کے

اس صحیح تعلیم کے خد و خال کو سمجھنے کے لئے ہمیں اس امر کا جائزہ لینا ہوگا کہ مولانا کے فکر میں انسان کا کیا تصور ہے اور اس کے آئینے میں انسانی تقدیر کی کیا تصویر نظر آتی ہے۔ یوں تو ان کی تمام تحریروں اور تقریروں میں یہ بحث بکھری ہوئی ہے لیکن انھوں نے اس کا ایک جامع اور مختصر نقشہ اُس یونسکو سمپوزیم کے سامنے پیش کیا تھا جس کا موضوع تھا "مشرق و مغرب میں انسان کا تصور اور اس کا تعلیمی فلسفہ"۔ ان کی گہری نظر یہ تو نہیں مان سکتی تھی کہ مشرق و مغرب کے فلسفے میں کوئی بنیادی فرق اور فصل ہے یا ایک کو دوسرے پر کوئی مطلق افضلیت حاصل ہے، لیکن وہ جانتے تھے کہ ان کے فکری اور جذباتی رجحانات میں بعض اعتبار سے اہم فرق ہے جس کا تعلق انسانی فطرت کی اس تفسیر اور تعبیر سے ہے جو ان کے مفکروں نے کی ہے۔ گذشتہ چند ہزار برس میں انسان نے اپنی کوشش اور جستجو سے فطرت کے چہرے پر سے ہزاروں پردوں کو اٹھایا ہے لیکن اسے ابھی تک خود اپنی فطرت کے خد و خال اور اس کی گہرائیوں اور پیچیدگیوں کو سمجھنے میں اتنی کامیابی نہیں ہوئی۔ اس نے جو آئینہ بنایا ہے اس میں اسے سبھی کچھ دکھائی دیتا ہے۔ سوائے اپنی فطرت کی سچی اور واضح تصویر کے یعنی :-

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا !
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا !

لیکن اس کی خود شناسی کی یہ کوشش برابر جاری رہی ہے۔ مختلف فلسفوں نے انسانی فطرت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ چینی فلسفہ نے انسانوں کے باہمی رشتوں کو سمجھنے پر زور دیا۔ یونانی فلسفہ نے جو مغربی فلسفہ کا سرچشمہ ہے عالم خارجی میں انسان کا مقام اور مرتبہ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ ہندوستانی فلسفہ نے اپنی توجہ کا مرکز انسان کے داخلی اور باطنی

تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری   مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے!

مولانا کا کہنا ہے کہ اگر انسان محض ایک "ترقی یافتہ حیوان" ہے تو وہ سائنس کے ذریعہ صرف انھیں اغراض و مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرے گا جن کی بنیاد اس کے حیوانی جذبات اور جبلتوں پر رکھی گئی ہے۔ برخلاف اس کے اگر وہ ذات الٰہی کا ایک پرتو ہے تو سائنس کو بھی مشیت الٰہی کی تکمیل کا وسیلہ بنائے گا یعنی کاوش کرے گا کہ کس طرح اس کی مدد سے دنیا میں امن اور سلامتی اور انسان دوستی کی کارفرمائی قائم ہو سکتی ہے۔ اس لئے ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ مشرق اور مغرب کے تعلیمی فلسفوں کو ایک وسیع تر تصور میں جمع کر کے ایک ایسے متوازن اور مکمل تعلیم کی بنیاد ڈالی جائے جو فرد اور سماج کے مطالبات میں ہم آہنگی پیدا کر سکے۔ اگر افراد کی شخصیت میں وحدت، ہم آہنگی اور یک جہتی نہ ہوگی تو اس کا اثر سوسائٹی پر پڑے گا اور سماج میں باہمی اختلافات پرورش پاتے رہیں گے۔ تعلیم کا اصل کام یہ ہے کہ وہ ایک صالح اور مربوط سوسائٹی کے لئے ایسے افراد کی تربیت کرے جن کی شخصیت ہم آہنگ اور مربوط ہو۔ ایسی مربوط جیسی خود مولانا کی اپنی شخصیت تھی۔

باوجود اس امر کے، نہیں، بلکہ اس وجہ سے کہ ان کو مذہب میں گہری نظر تھی وہ ایک صالح، دیانتدار اور بیدار زندگی کی بنیاد مادی خوش حالی کی سرزمین میں رکھنا چاہتے تھے لیکن اس خوش حالی کو وہ کسی خاص جماعت یا گروہ کی میراث نہیں بلکہ سب لوگوں کا حق مانتے تھے۔ اس لئے ان کے تعلیمی تصور میں مذہب، سائنس، ادب، فلسفہ، ٹکنولوجی سب کے لئے جگہ تھی۔ یہ وسعت نظر، یہ ہمہ گیری، کثرت میں وحدت کی یہ پہچان، اور وحدت میں کثرت کی اہمیت کا یہ احساس، ان کے فکر کے ہر گوشے میں پایا جاتا ہے۔ ان کی نظر میں ادب، آرٹ، سائنس، فلسفہ کی اس دنیا کی ایک امتیازی اور حسین خصوصیت یہ ہے کہ وہ جنگ و جدل کی دنیا نہیں صلح اور میل جول کی دنیا ہے۔

ان کے ذہن میں صرف فراخی ہی نہیں بلکہ انصاف پسندی بھی کمال کی تھی۔ وہ

مطابق تعلیم کا اعلیٰ ترین مقصد یہ قرار پاتا ہے کہ وہ انسان کی بنیادی لیکن سوئی ہوئی روحانیت کو تلاش اور بیدار کرے اور اسے اس کی زندگی میں قوت محرکہ بنادے۔

لیکن مشرق نے بھی اس مقام پر ٹھوکر کھائی۔ اس نے انسان کے بلند مقام کو تو پہچانا لیکن اس کے ذہن کو تقدیر پرستی کے بندھنوں سے آزاد نہیں کیا جس کی وجہ سے مدتوں تک اس کی مادی اور سماجی ترقی مسدود ہو کر رہ گئی۔ جب انسان ذات الٰہی کا ایک جزو ہے تو وہ جو کچھ کرتا ہے یا نہیں کرتا سب امر الٰہی سے ہے۔ ذرا غافل ہو کر اس خیال سے ایک قدم آگے بڑھائے تو انسان تقدیر کے ہاتھ میں ایک بے بس کھلونا معلوم ہوتا ہے! جب کسی سماج کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ انسانی دُکھ درد اور محرومیوں کی جو تصویریں چاروں طرف نظر آتی ہیں وہ ایا کا کھیل ہیں تو افراد میں ان کی طرف سے بے حسی اور بے بسی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی ذہنیت گذشتہ دو سو برس میں مشرق کے ملکوں میں رائج ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس وقت ایک عجیب بات یہ ہے کہ مغرب باوجود مادیت اور جبر کے قائل ہونے کے سائنس صنعت و حرفت اور سماجی ترقی میں پیش پیش ہے اور مشرق باوجود انسان کی روحانی عظمت کے قائل ہونے کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی پسماندگی کا شکار ہے!

مولانا کے تعلیمی فلسفہ کا بنیادی خیال یہ ہے کہ مشرق اور مغرب کے نظریوں میں میل پیدا کیا جائے تاکہ انسان سائنس کا صحیح استعمال کرنا سیکھے اور اس کے ذریعہ ان مقصدوں کو حاصل کر سکے جو اس کی فطرت کے بہترین تقاضوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ سائنس تو ایک طاقت ہے جو بذات خود غیر جانبدار ہے۔ اس کے انکشافات کو تعمیر اور تخریب دونوں کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ انسان کون سا راستہ اختیار کرتا ہے زندگی کا یا موت کا، انصاف اور رحم کا یا ظلم اور خود غرضی کا، یہ اس کی ذہنیت اور نیک و بد کے تصور پر منحصر ہے۔ لہذا ضرورت ہے کہ تعلیم کے ذریعہ اس کے انداز فکر و نظر، اس کے معیار خوب و زشت کو بدلا جائے یعنی سوال ہر آرزو کے پورا ہونے کا نہیں بلکہ آرزو کے صالح ہونے کا ہے۔

ساز و سامان کو جغرافی حد بندیوں میں قید کر سکتے ہیں لیکن علم اور تہذیب کی دولت پر مُہر نہیں لگا سکتے ۔ وہ تو تمام انسانوں کی میراث ہیں ۔ تہذیب کے میدان میں تنگ نظری سے بڑھ کر کوئی جرم نہیں اور قوموں کی ترقی میں یہی سب سے بڑی رکاوٹ ہے ۔ آزادی کے اس نئے دور میں جو ابھی شروع ہوا ہے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس مرض سے (طاعون کی طرح) پناہ مانگیں ۔ یہ بیماری فکر و عمل کے ہر گوشے میں مختلف بھیس بدل کر نمودار ہوتی ہے ۔ مذہب کے میدان میں اندھی مذہبیت کی شکل اختیار کرتی ہے اور عقیدت کے نام پر ہمیں دھوکا دیتی ہے ۔ سیاست کے میدان میں قوم اور ملک کا واسطہ دے کر ہمیں گمراہ کرنا چاہتی ہے ۔ لیکن ہمارا فرض ہے کہ ان دلکش ناموں کا فریب نہ کھائیں کیونکہ ان سب چیزوں کی جڑ تنگ نظری ہے ۔ ٹیگور شانتی نکیتن میں ہر جلسے کے آغاز میں ایک خطبہ دہرایا کرتے تھے : " یہ وہ مقام ہے جہاں تمام دنیا ایک گھر بن گئی ہے ۔" مولانا کا خیال تھا کہ اس انسانی وحدت پر خلوص کے ساتھ ایمان لانا اور دل و دماغ کی کھڑکیوں کو کھلا رکھنا ہماری تہذیب کی مخصوص 'جینیس' میں شامل ہے اور تعلیم کا مقدس فرض ہے کہ وہ اس روایت کو قائم رکھے اور مضبوط کرے ۔

دوسرے مذہبی خیال کے لوگوں کی طرح مولانا کا عقیدہ بھی یہ تھا کہ ہر گہری تبدیلی' خواہ وہ افراد میں ہو یا جماعتوں میں' اندر سے شروع ہوتی ہے ۔ وہ افراد کی سیرت میں انقلاب چاہتی ہے اور خدا اس وقت تک کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ اندر سے اپنی ذہنی اور جذباتی کیفیت میں تبدیلی نہ کرے ۔ اول تو کوئی زبردست انقلاب محض بیرونی دباؤ یا جبر سے وجود میں آ ہی نہیں سکتا ۔ اور اگر کسی طرح ایسا ہو بھی جائے تو اس کی جڑیں مستحکم نہیں ہوتیں اور اس کی رگوں میں صالح خون نہیں دوڑتا ۔ بہت عرصہ ہوا قومی احتساب نفس کے موڈ میں انھوں نے بہت قوت کے ساتھ اس خیال کا اظہار کیا تھا : " مسلمان اگر آزادی کے لئے آسمان کے تارے بھی توڑ لائیں اور ان کے ایک جانب چاندی سونے کا ڈھیر ہو اور دوسری جانب فوجوں کی قطاریں کھڑی ہو جائیں پھر بھی وہ کامیاب نہیں

ہر معاملے کے دونوں پہلوؤں بلکہ سب پہلوؤں کو بالکل غیر جانبداری کے ساتھ دیکھتے تھے لیکن غور کرنے کے بعد ان کا فیصلہ بالکل محکم اور دوٹوک ہوتا تھا۔ مثلاً سر سید کے شاندار علمی تعلیمی اور مذہبی کارناموں کا انھیں اعتراف تھا لیکن ان کی سیاست کے بعض پہلوؤں سے اور تعلیمی نظریوں سے اختلاف تھا اور اعتراف و اختلاف دونوں کا اظہار انھوں نے معقولیت اور اعتدال کے ساتھ کیا۔ مغربی تعلیم کے جواز کا مسئلہ مدتوں ہندوستانیوں میں زیر بحث رہا۔ ابتدا میں مذہبی خیال کے لوگوں نے اس کی شدید مخالفت کی۔ حال میں آزادی حاصل کرنے کے بعد بعض لوگوں نے قومیت کے اندھے جوش میں اس کو بالکل رد کرنا چاہا۔ لیکن ہر موقع پر مولانا نے اس معاملہ میں ایک متوازن رویّہ رکھا جو تعصب اور تنگ نظری سے پاک تھا۔ ان کے نزدیک اُس وقت انگریزوں کی اندھی نقالی بھی اتنی ہی قابل اعتراض تھی جتنی آج مغربی علوم اور زبانوں کو خارج کرنے کی کوشش۔ انھیں احساس تھا کہ اس تعلیم کی بدولت ہماری قومی اسپرٹ کا احیاء ہوا ہے اور جدید علمی اور سائنٹفک ذہنیت کی بنیاد پڑی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کی وجہ سے ہمارے سماج میں عوام و خواص کا فصل پیدا ہوا اور بڑی حد تک ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ اپنی قومی میراث سے بے تعلق ہو گیا۔ اس میں نہ ایک قومی ذہن پیدا ہو سکا نہ قومی ایکتا۔ اس لئے انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہماری تعلیم کی رُوح مشرقی اور ہندوستانی ہونی چاہئے تاکہ لوگ اپنی تہذیب کی قدروں کو پہچانیں اور اس کے سرچشموں سے فیض حاصل کریں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ جانتے تھے کہ مغرب سے سبق لے کر ایک سائنٹفک ذہن پیدا کرنے کی ضرورت ہے جس کے بغیر عصر حاضر کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے اور زندگی میں فراوانی نہیں آسکتی۔ اسی وجہ سے گو مولانا نے خود خالص مشرقی تعلیم پائی تھی انھوں نے انگریزی کی تعلیم پر بعض مغربی تعلیم یافتوں سے زیادہ زور دیا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ نہ صرف مغربی علوم اور سائنس کے لئے بلکہ بین الاقوامی تعلقات کے لئے بھی ایک کنجی کا کام دیتی ہے۔ انھوں نے ایک موقع پر لکھا تھا کہ ہم اپنی مادی دولت اور

گفتند جہان ما آیا بہ تو می سازند
گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

کافر اور مومن کا فرق بھی یہی ہے کہ کافر ہمیشہ زمانے کے سانچے میں ڈھلتا ہے اور مومن زمانے کو اپنے سانچے میں ڈھالتا ہے۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گُم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گُم اس میں ہیں آفاق

مولانا نے اپنی ایک تقریر میں اپنے ہم وطنوں کو اس نئے زمانے کی بشارت دی تھی جو آنے والا ہے اور بتایا تھا کہ اس کے لئے دل و دماغ کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کی ضرورت ہوگی "ہندوستان ماضی کی سرحد سے نکل چکا ہے اور مستقبل کے دروازے پر دستک پڑ چکی ہے یہ تغیر کا موسم ہے۔ تخم کا موسم ہے۔ تخم ریزی کی فصل ہے۔ خود ہم اس کی کارفرمائیاں محسوس نہیں کر رہے لیکن مستقبل کا مورخ انھیں محسوس کرے گا۔ وہ ہمارے عہد کے ایک ایک حادثے کا سراغ لگائے گا اور انھیں میں نئے عہد کی ساری بنیادیں دیکھنی چاہے گا۔ اس وقت جو نقشے بھی ہم بنائیں گے، جو چال ڈھال بھی اختیار کریں گے، جیسی کچھ صدائیں ہماری زبان سے نکلیں گی، انھیں سے ہماری ذہنیت کا سانچہ بنے گا اور اس سانچے میں ہمارا مستقبل ڈھلے گا۔ پس ضروری ہے کہ ہم اپنے دل و دماغ کی نگرانی کریں۔ ہمیں جو روش بھی اختیار کرنی ہے قصد و عزم کے ساتھ اختیار کرنی ہے۔ ہمیں زمین پر چلنا ہے لہروں پر بہنا نہیں ہے۔"

جس شخص کے سامنے تعلیم کا یہ تصور ہو اور وہ زندگی میں نظری حیثیت سے اسے اس قدر بلند مقام دے اس کے لئے لازم تھا کہ وہ قوم کو اس کی عملی اہمیت سے بھی روشناس کرے اور قومی تنظیم کے نقشہ میں اس کے لئے مناسب جگہ نکالے۔ چنانچہ انھوں نے برسوں تک اس خیال کو مقبول بنانے اور پرانے ذہنی سانچوں کو توڑنے کی کوشش کی۔ لیکن اس میں انھیں

ہو سکتے جب تک وہ خود اپنے اندر ایک مضبوط اور سچی تبدیلی نہ کریں اور ان تمام گناہوں اور جرموں کے ارتکاب سے باز نہ آئیں جن کی وجہ سے یہ تمام مصیبتیں ان کو گھیرے ہوئے ہیں"

اسی وجہ سے ان کا عقیدہ تھا کہ ہر میدان میں کامیابی کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ ایک صالح سیرت کی تعمیر کی جائے اور یہ صرف تعلیم کے ذریعہ ممکن ہے بشرطیکہ ہمارا تعلیم کا تصور تخلیقی ہو میکانیکی نہ ہو۔ اُن کہنا تھا کہ ہمارا ماحول کوئی بنا بنایا اٹل سانچا نہیں جس میں کسی نہ کسی طرح فرد کو ٹھیک بٹھانا ہے۔ یہ انسان کی شان کے خلاف ہے کہ وہ اس تھکی ہوئی دنیا کو جو ظلم اور جور سے بھری ہوئی ہے چپ چاپ اور مجہول انداز میں قبول کرلے۔ اسکی حیثیت ایک خلاق کارکن کی ہے جو مشیت الٰہی کی تکمیل میں مشیت کا شریک کار بن سکتا ہے۔ مولانا کا ایک محبوب شعر ہے جس کو انھوں نے اپنی تحریر اور تقریر میں بار بار استعمال کیا ہے اور جو ان کے فلسفۂ زندگی پر واضح روشنی ڈالتا ہے

طبعے بہم رساں کہ بسازی بہ عالمے
یا ہمتے کہ از سر عالم تواں گذشت

زندگی کے دو ہی راستے ہیں جن میں سے انسان ایک کو اختیار کر سکتا ہے۔ یا تو وہ اپنی طبیعت ایسی بنالے کہ زمانے کی ہوا کے ساتھ چلے اور پانی کے ساتھ بہے۔ دنیا سازی میں کمال حاصل کرکے اور جوں جوں دنیا بدلتی جائے خود کو بھی بے چون و چرا اس کے مطابق ڈھالے یا اپنے اندر ایسی ہمت اور حوصلہ پیدا کرے کہ دنیا کی تمام تحریصوں کو ٹھکرا کر ان سے بلند ہو جائے۔ اس کی خودداری باطل کے ساتھ معاملہ نہ کرے بلکہ حق کی خاطر سارے عالم کا مقابلہ کرنے کو تیار رہے۔ مولانا کے نزدیک سیدھا اور سچا راستہ یہی ہے۔ اس بارے میں ان کا اور اقبال کا ایک ہی مسلک ہے۔ اقبال نے اس کو زبان شعر میں بہت سے حسین اندازوں میں پیش کیا ہے۔

اعتراف کیا کہ ہمیں جو کچھ کرنا ہے اس کے مقابلے میں ہم بہت کم کر سکے ہیں اور منزل تک پہونچنے کے لئے بہت زیادہ مادی اور انسانی وسائل اور بہت زیادہ محنت کی ضرورت ہے تاکہ ہم ممکن اور مطلوب کے بیچ میں ایک پل بنا سکیں۔ یہی ان کی وصیت ہے اور یہی ان کی یاد کا چیلنج۔

مولانا نے جس خوبصورتی کے ساتھ اپنی فکر کا نقش تعلیم و تربیت کے ہر پہلو پر ثبت کیا اس کا اندازہ محض تعلیمی رپورٹوں اور اعداد و شمار کو دیکھ کر نہیں ہوتا بلکہ یہ سوچ کر ہوتا ہے کہ اس نازک دور میں وقت کے اس سخت موڑ پر ان کی رہنمائی کی دولت نصیب نہ ہوئی ہوتی تو ہماری تعلیم اور کلچر کا تصور کس قدر مسخ اور مختلف ہوتا۔ چند چیزوں کی طرف اشارہ کرنا کافی ہے۔ انھوں نے بالغوں کی تعلیم کے تصور میں وسعت پیدا کی اور اس میں رنگ بھرا۔ مشرقی علوم اور ادب میں ریسرچ کو فروغ دیا۔ فنون لطیفہ کی ترقی اور ترویج کے لئے اکاڈمیاں قائم کیں۔ ہندی میں سائنس کی اصطلاحیں بنانے کا کام بڑے پیمانے پر شروع کیا۔ ذریعہ تعلیم کے نازک مسئلے اور ہندی اور غیر ہندی زبانوں کے جھگڑے کو جس میں عقل کی جگہ جذبات نے لے لی ہے بڑی دانشمندی سے سنبھالا اور لوگوں کو افراط و تفریط کے خطروں سے آگاہ کیا۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن قائم کرکے نہ صرف اعلیٰ تعلیم کو زیادہ وسایل بخشے بلکہ یونیورسٹیوں کی آزادی کا تحفظ کیا۔ عورتوں کی تعلیم کو مردوں کی تعلیم سے زیادہ اہم ٹھہرایا کیونکہ اس کے ذریعے قوم میں نئی زندگی اور نیا شعور بیدار ہو سکتا ہے۔ علیگڈھ یونیورسٹی کے طلبا کو جو ایک افسردگی اور پریشانی کے دور سے گذر رہے تھے ہمت، خودداری، خدمت اور امید کا پیغام دیا اور بتایا کہ ایک غیر مذہبی جمہوری ریاست میں ہر شہری کے لئے سارے راستے کھلے ہیں۔ کوئی دروازہ بند نہیں بشرطیکہ دیکھنے کے لئے آنکھیں اور سننے کے لئے کان اور انصاف کرنے کے لئے دل ہو۔ آزادی سب کے لئے کھلتے دروازوں کا پیغام لے کر آئی ہے، بشرطیکہ ہم اسے سمجھیں اور اس کے پیغام

مختلف وجوہ سے پوری کامیابی نہیں ہوئی۔ اپنے انتقال سے کچھ روز پیشتر انھوں نے سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کے آخری جلسے میں اس امر کی طرف اشارہ کیا تھا اور مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کبھی اس امام ضبط کو اس قدر جذبات سے بھرائی ہوئی آواز میں کسی چیز کی وکالت کرتے سنا ہو) وہ جانتے تھے کہ ایک موزوں نظام تعلیم کے بغیر قوم کی اصلاح کوشش ریت پر عمارت بنانا ہے۔ انھیں یہ بھی اندازہ تھا کہ اس نظام تعلیم کا کیا نقشہ ہونا چاہیئے تاکہ وہ پوری قومی زندگی کے بوجھ کو سنبھال سکے۔ اس میں انھوں نے پانچ بنیادی عناصر کو جگہ دی تھی ۹ سے ۱۲ برس تک کے بچوں کے لئے لازمی تعلیم، جمہوریت کی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے ناخواندہ بالغوں کے لئے سماجی تعلیم، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی توسیع کے ساتھ ساتھ اُن کے معیار کو بلند کرنا ملکی ضرورتوں کے شایانِ شان ٹکنیکل اور سائنٹفک تعلیم کا اہتمام اور قومی تہذیب کو مالا مال کرنے کے لئے آرٹ اور فنون لطیفہ کی ترویج۔ یہ بھی ان کی قیادت کا اعجاز تھا کہ آزادی کے بعد پہلی مرتبہ آرٹ اور کلچر کو وزارت معارف کا جزو بنایا گیا ورنہ انگریزی حکومت کے دوران میں اس کا تعلق محض اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم سے ہی رہا تھا۔

بہرحال گذشتہ دس سال میں باوجود ہر قسم کی مشکلوں کے ان کے عہد زریں میں تعلیم نے جو ترقی کی اس کا اعتراف ہر غیر جانبدار نقاد اور مبصر کرے گا۔ اس بے لاگ انداز میں جو ان کے فکر اور فیصلوں کا خاصہ تھا انھوں نے ایڈوائیزری بورڈ کے اس آخری جلسے میں موجودہ تعلیمی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر ہم ان مشکلوں پر غور کریں جن سے ہم گذر رہے ہیں اور دیکھیں کہ ہمارے لئے کیا کرنا ممکن تھا تو ہمیں کسی معذرت کی ضرورت نہیں اور ہم سر اونچا کر کے کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اپنا فرض ادا کیا۔ لیکن بحیثیت ایک میر کارواں کے جس کی نظر میں صرف ماضی ہی نہیں بلکہ مستقبل بھی تھا، جس کو صرف نیچے سکا طے کیا ہوا راستہ ہی نہیں بلکہ منزل مقصود بھی نظر آتی تھی، انھوں نے صاف گوئی سے

وہ مرتبہ نہیں دیا جس کے وہ مستحق ہیں۔ یہ محض اتفاق نہیں بلکہ ان کے بنیادی عقیدے کا اظہار تھا کہ انھوں نے وزیر تعلیم کی حیثیت سے ۱۹۴۷ء میں جو پہلی تقریر کی تھی اور ۱۹۵۸ء میں اپنے انتقال سے چند روز پیشتر جو آخری تقریر کی دونوں میں اِسی بنیادی مسئلے کا ذکر ہے۔ اس میں انھوں نے بہت وضاحت اور زور کے ساتھ کہا تھا کہ جب تک ہم استادوں کے معیار کو بلند نہ کریں ہم تعلیم کے نظام کو بہتر نہیں بنا سکتے۔ ہم نے ان کی مالی اور سماجی حالت کو سدھارنے اور عام ذہنی اور اخلاقی معیار کو بلند کرنے کے لئے کچھ ذرائع اختیار کئے ہیں لیکن وہ ہرگز کافی نہیں۔ ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ انھوں نے ساتھ ہی اس چیز کی مذمت کی کہ لوگ بے سوچے سمجھے مسلسل استادوں کے خلاف تلخ اور بے فیض نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں جس سے ان کی ہمت شکنی ہوتی ہے۔ مانا کہ ان میں سے بعض کی تعلیم ناقص ہے اور بہت سے اس پیشے میں مجبوری سے آئے ہیں لیکن ان میں بہت سے ایسے بھی تو ہیں جنھوں نے احساس فرض اور خدمت قومی کا قابل تعریف جذبہ دکھایا ہے۔ ان کی مناسب قدر کرنا قوم کا فرض ہے۔ مولانا کے یہ الفاظ اپنی قوم کے لئے ایک تلقین اور ملک کے استادوں کے لئے تحسین کا الوداعی پیغام ہیں۔

ہندوستان کے عصر نو کا یہ معمار اپنا کام ختم کر کے جوار رحمت الٰہی میں جا پہنچا۔ خیر کام تو کبھی پورا نہیں ہوتا اور ہر موت ناتمامی، اور خلا کا ایک احساس چھوڑ جاتی ہے لیکن مولانا نے ایک زندگی کے ساغر میں ایسی اور اتنی شراب بھری جس کا حیات بخش خمار مدتوں تک قائم رہے گا۔ قدرت نے انھیں ایک ایسے زمانے میں پیدا کیا جو کشمکش اور جد و جہد اور دارو گیر کا زمانہ تھا۔ آزمائش اور امتحان کا زمانہ تھا۔ سیرت کے سونے کو ایثار کی بھٹی میں تپانے کا زمانہ تھا۔ لیکن مولانا اس زمانے کی آگ میں سے اس براہیمی شان کے ساتھ گذرے کہ محفل سوز و گداز سے، گرمی رزم اور نرمیٔ بزم سے، باطل سوز جلال اور حق کوش جمال سے جگمگا اٹھی۔ ان کی زندگی کے دوراول کا خیال کرتا

کو پہچانیں۔

تفاوت است میانِ شنیدن من و تو
تو بستن در و من فتح باب می شنوم

مذہبی تعلیم کا مسئلہ برسوں سے بحث کا موضوع بنا ہوا ہے۔ مولانا کے دل اور دماغ کے ہر گوشے میں اس کی اہمیت کا احساس پیوست تھا لیکن ملک کے حالات اور مصلحتوں کو دیکھکر انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ سرکاری طور پر درسگاہوں میں مذہبی تعلیم کو رائج کرنا مناسب نہ ہوگا۔ مگر ان سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا کہ مذہب کی سچی روح کو نہ صرف تعلیم بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں رائج ہونا چاہیئے۔ اور اس کے ذریعہ لوگوں میں رواداری، وسیع مشربی اور گہری انسانی ہمدردی پیدا کرنی چاہیئے؟ جب وشوا بھارتی یونیورسٹی کا ایکٹ تیار ہو رہا تھا تو قانونی رائے کے مطابق اس میں خدا کا نام شامل نہیں کیا گیا تھا۔ اس موقع پر انھوں نے کہا تھا کہ خواہ قانون کی موشگافیوں کی وجہ سے ایکٹ میں خدا کا نام نہ ہو لیکن ٹیگور کی اس یونیورسٹی میں خدا کا تصور اور مذہب کی روح ہر جگہ جاری و ساری رہے گی۔ اور "شانتم، شیوم، ادویتم" کے لفظوں میں ذات الہٰی کا جو تصور ہے وہ نسل، رنگ مذہب اور فرقے کی حد بندیوں سے بلند اور آزاد ہے۔ انسان کی عظمت اور سب مذہبوں کی عزت کا یہ عقیدہ گاندھی جی کی تعلیم میں بھی پایا جاتا ہے اور چونکہ ان کی بنیادی مدروں میں بہت بڑا حصہ مشترک ہے اس وجہ سے ان دو مردانِ خدا میں، جن میں سے ایک ہندو مذہب کا اور دوسرا مذہب اسلام کا مثالی نمونہ تھا، اس قدر یک جہتی اور مفاہمت پائی جاتی ہے۔

تعلیم کے اس بلند اور ہمہ گیر تصور کو عمل میں لانے کے لئے سب سے زیادہ روشن دماغ اور بلند سیرت استادوں کی ضرورت ہے۔ مولانا کے دل میں استادوں کے لئے بڑی عزت اور ان کے ساتھ بہت ہمدردی تھی اور انھیں اس بات کا دکھ تھا کہ سماج نے انھیں

نذرِ عقیدت

ڈاکٹر بی۔ گوپال ریڈی، وزیر برائے مالی و شہری مصارف، حکومت ہند

حضرات!

میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے مولانا ابوالکلام آزاد سیمنار کے اس جلاس کی صدارت کے لئے منتخب کیا۔ جس میں ڈاکٹر زور اپنا مقالہ پڑھنے والے ہیں۔ ڈاکٹر زور ایک لائق و فائق استادِ ادب ہیں جن سے حیدرآباد کے طالب علموں کی دو نسلیں فیضیاب ہوئی ہیں۔ انھوں نے اُردو ادب کی بقا و ترقی کے لئے بہت کچھ کیا ہے اور ان کی نظر علمی مسائل میں وسیع اور دقیق ہے۔ ایسے ادبی اجتماع میں آپ کا مجھے یاد کرنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ مجھے اُردو اور مولانا آزاد کی ذات گرامی سے جو وابستگی رہی ہے آپ اسکی قدر کرتے ہیں۔ میں واقعتاً آپ کا اس عزت افزائی کے لئے تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

سیمنار کے لئے سری نگر کا انتخاب بھی قدرت نے خوب کیا ہے۔ یہاں آج کل جشن بہار منایا جا رہا ہے اور بہار میں جیسے ہر شے میں توانائی اور جوش نمو ظاہر ہوتے ہیں ویسے ہی کشمیر میں بھی آج نئی زندگی کے آثار نظر آرہے ہیں۔ یہ نئی زندگی اور توانائی دراصل اسی اصول اور طرز فکر کا عطیہ ہے جس کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد مشہور و معروف ہیں اور جس کی بقا و استحکام کے لئے انھوں نے پوری زندگی وقف کر دی تھی اور جس کے لئے انھوں نے کسی بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کیا۔ اسلئے کشمیر ہی اس سیمنار کے لئے بہت موزوں و مناسب جگہ ہے، اور میں اہالیان کشمیر کو اُن کی اس مبارک سعی پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

آج ڈاکٹر زور کے مقالے کا موضوع یہ ہے کہ مولانا آزاد نے ہندوستان کے ثقافتی احیاء میں کیا کارہائے نمایاں کئے۔ یہ داستان کافی طویل ہے لیکن مجھے ہندوستان کی ثقافتی تاریخ میں جو بات بہت واضح طور سے نظر آتی ہے وہ اختلافات ظاہری کے باوجود اتحاد خیال و عمل ہے۔ صدیوں سے ہمارا

ہوں جو آزادی کی منزل پر پہنچ کر تمام ہوا تو یہ شعر ذہن میں ابھرتا ہے

آوازۂ خلیل ز بنیاد کعبہ نیست
مشہور گشت زاں کہ بہ آتش نکو نشست

اور دور آخر کا خیال کرتا ہوں جب وہ نئے ہندوستان کی تعلیم و تہذیب کو سنوار رہے تھے، جب وہ محبت اور انصاف کے راستے سے بھٹکے ہوئے لوگوں کو محبت اور انصاف کے راستے کی طرف بلا رہے تھے، جب وہ طوفان میں دیا جلا رہے تھے اور حق کی خدمت میں تحسین اور ملامت دونوں سے بے نیاز ہو چکے تھے تو ظہوری کا ایک شعر یاد آتا ہے، جو خود انھوں نے ایک مقام پر نقل کیا تھا۔

شد است سینہ ظہوری پر از محبت یار
برائے کینۂ اغیار در دلم جا نیست

کڑیاں ٹوٹ گئی تھیں ان کو از سر نو جوڑا اور جہاں پہلے سے اس قسم کے رشتے موجود نہیں تھے وہاں ابتدا کی۔ اس ثقافتی احیاء میں وہی مرنجان مرنج طریقہ، وہی دوسرے کی ثقافت کا احترام، وہی اپنے شاندار ماضی کی عظمت کا احساس اور وہی اختلافات میں اتفاق کی شکلیں ڈھونڈ نکالنے کا جذبہ کارفرما تھا جو ہندو مسلم اتحاد کی تحریک کے چلانے میں مددگار ثابت ہوا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا نے اپنی مختصر مدت وزارت میں کئی اہم ثقافتی ادارے اور نئی ثقافتی روایتیں قائم کیں، جن کے لئے ہندوستان ہمیشہ اُن کا شکر گزار رہے گا۔

اگرچہ مولانا کی تعلیم پُرانے طریقے پر ہوئی تھی لیکن وہ نئے طرز فکر سے واقف تھے اور قدیم و جدید کے لطیف امتزاج کے قائل تھے۔ چنانچہ انھوں نے ملک کے ثقافتی احیاء میں بھی جہاں قدیم سرمائے کو محفوظ کیا وہاں سائنس کی ترقیوں نے جو نئی راہیں کھول دی تھیں اُن پر بے خوف و خطر چلنا بھی سکھایا۔ لیکن وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ جدید کی تلاش میں ہم خود اپنی انفرادیت کو گم نہ کردیں۔

اتحاد و اتفاق مولانا کی سب سے بڑی دین ہے اور خوشی کا مقام ہے کہ کشمیر نے ہمیشہ افتراق کی گود میں پلے ہوئے دو قومی نظریے کو ٹھکرایا اور وحدت قومی کو باقی رکھا۔ آج بھی یہ اتحاد و اتفاق کا سب سے بڑا مینار ہے اور اس لئے مولانا آزاد کی سب سے بڑی اور زندۂ جاوید یادگار ہے۔

ملک مختلف قوموں اور مختلف مذہبوں کا جولانگاہ رہا ہے لیکن اس اختلاف نے ہماری ثقافت کو ایک رنگا رنگی اور بوقلمونی ہی عطا کی ہے اور ایک ایسی تہذیب سے روشناس کیا ہے جو کشمیر میں وحدت کے جلوے دکھاتی ہے اور اختلافات میں اتفاق و اتحاد کا رنگ بھرتی ہے۔

اس ثقافتی اتحاد کو مسلمانوں اور ہندوؤں نے مل کر ہماری قومی میراث بنایا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہماری صدیوں کی تاریخ اس مذہبی جنون اور فرقہ واریت سے پاک وصاف رہی ہے جس کی بنیاد برطانوی سامراج نے رکھی۔ اگر ہماری تاریخ کے راستے میں برطانوی سامراج حائل نہ ہو گیا ہوتا تو آج ہماری تاریخ ہی اور کچھ ہوتی۔ لیکن یہاں اپنے راج کے استحکام کے لئے غیر ملکی فرمانرواؤں نے "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل کیا اور وہ زہر پھیلایا کہ ہمارے اہم ترین ثقافتی ورثے کی زندگی خطرے میں پڑ گئی۔ اس خطرہ کو سب سے پہلے کانگریس نے محسوس کیا۔

ہندو مسلم اتحاد کے لئے اس ملک میں جو عظیم الشان مہم چلائی گئی اس کا سہرا یقیناً مہاتما گاندھی کے سر ہے لیکن اس تحریک کو آگے بڑھانے میں جن لوگوں نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نام سب سے نمایاں ہے۔ اتحاد اُن کا سب سے بڑا اصول تھا اور اسکے لئے انھوں نے ہر طوفان کا مقابلہ کیا۔ مسلم لیگ نے ان کے خلاف پورا محاذ ہی قائم کر دیا تھا لیکن انھوں نے ہر طعن و تشنیع، ہر لعن طعن، ہر طوفان بدتمیزی کا استقلال اور خاموشی سے مقابلہ کیا اور اپنے اصول پر قائم رہے۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ اگر مولانا نہ ہوتے تو آج ہماری سیاست کا رُخ کیا ہوتا۔ وہ ہماری جنگ آزادی کے رکن عظیم تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ اتحاد کے بغیر آزادی بے معنی ہے۔

آزادی کے حصول کے بعد ہندوستان کے وزیر تعلیم کی حیثیت سے ثقافت کا محکمہ بھی انھیں کے ماتحت تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ وہ اس محکمہ کے بانیوں میں سے ہیں۔ مولانا ہندوستان کے عظیم ثقافتی ماضی سے آشنا تھے اور اس کو بخوبی محسوس کرتے تھے کہ جیسے پہلے ہندوستان کے ثقافتی تعلقات تمام آس پاس کے ملکوں سے قائم تھے اسی طرح دوبارہ قائم ہوں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے محکمہ کے ذریعے سے بیرونی ممالک سے نہ صرف ثقافتی تعلقات استوار تر کرنے کی کوشش کی بلکہ جہاں یہ

کے بعد اس سرزمین میں جنم لیا تھا اور جس کی صدائے بازگشت بہت عرصہ بعد سوراج اور خلافت کی تحریکوں میں نمودار ہوئی۔

مسلمان اپنے ہزار سالہ دورِ حکومت میں بحیثیت حکمراں زیادہ تر سیاسی اغراض کے لئے اپنے ہم مذہب اور دوسرے مذاہب کے صاحبانِ اقتدار سے برسرِ پیکار رہے ہیں۔ جیسا کہ قوموں کی تاریخ میں ہمیشہ ہوتا آیا ہے، مسلمانوں کی اکثر و بیشتر توانائیاں اپنے ہم مذہبوں ہی کے ساتھ جنگ و جدل میں صرف ہوتی رہی ہیں۔ چنانچہ سرزمین ہند میں اپنی برتری قائم رکھنے کے لئے کبھی مغلوں نے پٹھانوں سے ٹکر لی، اور کبھی ایک فرقہ کی حکومت نے دوسرے فرقہ کی سلطنت سے خوں ریز لڑائی کی۔ بابر لودی خاندان کو ختم کرتا ہے تو شیر شاہ سوری مغلوں کے خاتمہ کی کوشش کرتا ہے۔ اکبر کی فوجوں کے ہاتھ گجرات اور احمد نگر کی اسلامی سلطنتوں کا نام و نشان مٹ جاتا ہے تو بیجا پوری عادل شاہی سلطنت بیدر کی بریدی سلطنت کو ملیامیٹ کر دیتی ہے۔ پھر اورنگ زیب بیجاپور اور گولکنڈہ دونوں اسلامی بادشاہوں کو نہ صرف تاخت و تاراج کرتا ہے بلکہ شہر حیدرآباد کے اسلامی آثار کو یہ کہکر نیست و نابود کرنا چاہتا ہے کہ

"خشت خشت حیدرآباد، رافضی است"۔

تاریخ کا بغور مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ دنیا کی تاریخ میں جب کبھی ایک گروہ دوسرے گروہ سے حکومت و اقتدار اور زر و زمین کے لئے برسرِ پیکار ہونا چاہتا ہے تو مذہب یا وطنیت کے اختلاف کو لڑائی کے لئے ایک حیلہ بنا لیتا ہے۔ اپنی حکومت و اقتدار کی حدیں وسیع سے وسیع تر کرنے کے لئے ذہن انسانی اکثر و بیشتر جو حیلے تراشتا ہے وہ یہی ہوتے ہیں کہ اپنے ہم وطنوں یا ہمسایوں کے مذہب و عقائد کے فرق کو اچھالا جائے یا دوسرے ملک کے رہنے والوں کو بحیثیت مجموعی کمتر یا کم مہذب قرار دیا جائے اور ان بہانوں کی آڑ لیکر جنگ و جدل کی آگ بھڑکائی جائے۔

ہندستانی کلچر کی نشاۃ ثانیہ

میں

مولانا آزاد کی خدمات

ڈاکٹر محی الدین قادری زور

ہندستانی کلچر کی نشاۃ ثانیہ کے لئے مولانا آزاد نے جو عظیم الشان اور اجتہادی کام انجام دیا ہے اس کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس کلچر کے احیا اور اس کے پس منظر کو معلوم کر لیا جائے۔ انگریزوں نے ہندستان میں بہت جلد یہ محسوس کر لیا تھا کہ ان کی حکومت کی بنیادوں کو اگر مستقبل میں کسی تحریک سے خطرہ لاحق ہوسکتا ہے تو وہ صرف ہندستانی قومیت اور کلچر کا احیا ہے۔ اگرچہ ان کی دوررس نظروں نے اس آنے والے طوفان کو بہت پہلے ہی بھانپ لیا تھا لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے ان کے رہے سہے شبہات بھی دور کر دیئے۔ اس وقت ان کو یقین ہو گیا کہ استحکام سلطنت برطانیہ میں اگر کوئی چیز رخنہ ڈال سکتی ہے تو وہ ہندوستان کے دو عظیم مذہبوں کے ماننے والوں کے درمیان یگانگت اور قومی بنیادوں پر اتحاد و اتفاق اور کلچر کی یکسانیت ہے۔

کون نہیں جانتا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک جان ہو کر ملک کو انگریزوں کے غیر ملکی تسلط اور پنجۂ استبداد سے نجات دلانے کی کوشش کی۔ یہ باہمی اتحاد اور اتفاق اسی ہندستانی کلچر کا نتیجہ تھا جس نے کئی صدیوں کے میل جول

نہ تھے۔ چنانچہ پانی پت کی تیسری جنگ سے قبل ان لوگوں نے اس قدر ہمہ گیری اور اتنی استواری حاصل کر لی تھی کہ ہندستان کا بیشتر حصہ ان کے زیر اقتدار آ چکا تھا۔

ان تمام تاریخی واقعات کو جو قانون فطرت کے عین مطابق تھے انگریز مورخین کی تحریروں نے اور انگریزی مدرسوں میں عمداً اس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا کہ گویا ہندستان کی سرزمین کو ہندو راجاؤں سے چھین لینے والے ان کے مذہب اور دھرم کو تباہ کرنے والے اور ان کی عبادتگاہوں کی بے حرمتی کرنے والے مسلمان حملہ آور ہی تھے۔ اور اگر یہ نہ آتے تو ہندستان پر ہندوؤں کی بلا شرکت غیرے حکومت رہتی۔ پھر دوسری طرف ان تاریخی واقعات کی یہ تعبیریں بھی کی گئیں کہ مسلمان سلطنتِ مغلیہ کو ختم کرنے اور اس طرح عام مسلمانوں کے خلاف دھرم اور مذہب کی حفاظت کے بہانے بغاوت کرنے والے اور ان سے آخری حکومت چھین لینے والے ہندو تھے۔ بدقسمتی سے یہ تاویلیں انگریزوں کے بنائے ہوئے ماحول میں اس قدر منطقی اور قرین عقل معلوم ہوتی تھیں کہ محض تاریخی مغالطہ ہونے کے باوجود ہندستانی عوام ان سے متاثر ہو گئے۔ اور کتابوں اور مدرسوں میں ان کے مسلسل پرچار نے ہندستانی قومیت اور کلچر کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔ ایک طرف تو مسلمان یہ سمجھنے لگے کہ وہ اس ملک میں بحیثیت حاکم آئے تھے اور قیامت تک ان کی یہ حیثیت قائم رہنی چاہیئے۔ اور یہ کہ ان کے آباؤ اجداد کا مقصد واحد اس کفرستان کو پوری طرح مسلمان بنانا تھا کیونکہ وہ محض جہاد اور تبلیغ مذہب کی خاطر ہندستان آئے تھے۔ اس لئے اگر انھوں نے ہندو تحریک یا ہندوؤں کی اکثریت کی تحریک آزادی کا ساتھ دیا تو یہ حرکت خود ان کے ادعا کے لئے زہر قاتل ثابت ہوگی۔ دوسری طرف ہندو غلط طریقے پر یہ سمجھنے لگے کہ مسلمان یا ملچھ حملہ آوروں سے اپنے قدیم وطن کو چھٹکارا دلانے اور انھیں ہندستان سے نکال باہر کرنے ہی میں ان کی نجات ہے اور یہی ان کی سیاست کا عین مقصد بھی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بعض مسلمان صوفیوں اور ہندو فقیروں نے محبت و رواداری

چنانچہ ہندوستان کی تاریخ میں جو بھی لڑائیاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپس میں ہوئیں ان کا پس منظر جہاد یا تبلیغ یا دھرم کا قیام یا ملک سے ملیچھوں کو نکال باہر کرنا نہیں تھا بلکہ صاحبان اقتدار کی ملک گیری کی ہوس ان لڑائیوں کا اصلی محرک تھی۔

یہ محض ایک اتفاق تھا کہ جب مسلمان ہندوستان آئے تو یہاں جن لوگوں کی حکومت تھی وہ ہندومت کے پیرو تھے۔ یہ بات بعد کے واقعات سے ثابت ہو چکی ہے کہ اگر اس وقت حاکموں کا مذہب اسلام ہوتا تب بھی یہ لڑائیاں اسی قدر ناگزیر ہوتیں۔ چنانچہ بلبن کی حکومت کے دوران میں غیر مسلم مغلوں کے حملے اور خود مغلوں کے عہد میں افغانستان اور ایران سے لڑائیاں اور بعد میں نادر شاہ کی یلغار اس بات کا ثبوت ہے کہ حملہ آوروں کا غیر مذہب ہونا جنگ کے لئے ضروری نہیں ہے۔ ان لڑائیوں میں بیرونی حملہ آوروں کے مقابلہ میں ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں نے بھی برابر کا حصہ لیا تھا۔ بلکہ تاریخ تو یہ بھی ثابت کرتی ہے کہ اکثر مواقع پر مسلمان بادشاہوں کی فوجیں ہندو راجاؤں اور سرداروں کے زیر کمان مسلمان حملہ آوروں کا سرحدوں پر مقابلہ کرتی رہیں اور ہندو راجاؤں اور سرداروں نے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ اپنے ہم مذہبوں کے خلاف بھی نبرد آزمائی کی۔ جنوب میں بیجانگر کی اور بعد میں مرہٹوں کی ہندو حکومتوں کی فوجیں مسلمان سپہ سالاروں کے زیر کمان ہمسایہ مسلم حکومتوں کے خلاف بھیجی جاتی تھیں۔ ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں کے ہندوستان آنے سے بہت پہلے ہی ہندوستانی قومیت کے دھارے اس ملک میں تیزی سے چلنے لگے تھے۔ اور کون جانتا ہے کہ اگر انگریزوں نے فرقہ وارانہ اور مذہبی احساسات کی تنگ نظریوں کو ہوا نہ دی ہوتی تو آج ہندوستانی قومیت اور مشترکہ کلچر کے احساسات اس قدر پختہ ہو گئے ہوتے کہ ہندو اور مسلمان کا فرق صرف ان کی عبادت گاہوں تک محدود ہو جاتا۔

پھر یہ بھی محض ایک اتفاق ہے کہ جس زمانے میں انگریزوں کی آمد آمد کا سلسلہ رہا مغلیہ سلطنت کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر جن قوتوں نے جنوبی ہند میں سر اٹھایا وہ مسلمان

عمارتوں اور محلات کے طاق و محراب، راجپوتانہ کے رنگ محل، گجرات کی مسجدیں اور مندر، نہ خالص ہندو طرز تعمیر کا نمونہ ہیں اور نہ صرف مسلم فن تعمیر کی نمائش گاہ ہیں بلکہ ان دونوں کا ایک لطیف آمیزہ ہیں اور ایک متحدہ ہندستانی کلچر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ وہ حسین و دلکش اور انتہا سے زیادہ حساس طرز مصوری جسے راجپوت طرز کا نام دیا گیا دونوں فرقوں کے کمال محسوسات کا سنگم نہیں تو کیا ہے۔ ان میں وہی ایرانی قلم کی پاکیزگی اور روانی ہے اور وہی ہندو طرز کی رنگ آمیزی اور حلاوت۔ نازک اور مرمریں ایرانی وضع قطع کی عمارتوں کے پس منظر میں آم اور کیلے کے درخت سرو شمشاد کے ساتھ سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ بلبلوں کے ساتھ طوطے اور مرغابیوں کے ساتھ مور مرغزاروں میں ناچتے نظر آتے ہیں۔

اسی کو ہم ہندستانی کلچر کا نشاۃ ثانیہ کہتے ہیں۔ جب تک قومیت کا تصور اجاگر نہیں ہوتا کلچر اور تہذیب و تمدن جنم نہیں لے سکتے۔ اور جب تک کوئی اپنے آپ کو بحیثیت فرد یا جماعت کسی ملک کی سرزمین، وہاں کے باشندوں، وہاں کے کوہ و صحرا اور اس کے ماضی حال اور مستقبل سے وابستہ اور منسلک نہیں کر لیتا قومیت کا تصور کیونکر پیدا ہو سکتا ہے۔

سرزمین ہند کی تاریخ کے ان حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ متحدہ قومیت اور مشترکہ کلچر کا احساس زمانۂ حال اور اس کے سیاسی شعور کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ بہت عرصہ قبل ہندستانی زندگی میں جاری و ساری ہو چکا تھا لیکن سولھویں صدی عیسوی کے بعد کے واقعات نے جب ان احساسات کو مسخ کرنا شروع کیا اور انگریز مدبروں کی حکمت عملیوں نے ہمارے ذہنوں پر دوسرا رنگ چڑھانا شروع کیا تو اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ ہندو اپنے ذوق ترقی کی تکمیل کے لیے مسلمانوں سے قبل کے زمانے کو سنہرا زمانہ سمجھنے لگے اور مسلمان اپنی ترک کردہ عجمی و عربی طرز معاشرت کو اصلی اور بہترین خیال کرنے لگے۔ یہ دراصل (REVIVALISM) یا احیائے ماضی تھی۔ اور اسی تحریک کے احیائے ماضی کے باعث دونوں نے اپنے لیے علحدہ علحدہ قدریں تعین کر لیں اور آخر کار اس خواب کی دنیا میں اس قدر ڈوب گئے۔ ہمارے بنگالے

کی ہمیشہ تعلیم دی اور متحدہ قومیت کی بنیادوں کو استوار کرنے اور فرقہ وارانہ زہر کے اثر کو بڑی حد تک کم کرنے کی کوشش کی لیکن بڑھتے ہوئے سیاسی رجحان کے ساتھ اس زہر کے اثرات میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ اور عوام خود کو ہندو اور مسلمان کی اصطلاحوں میں سوچنے لگے۔ اور سیاسیت کے زیر اثر دونوں یہ بھول گئے کہ صدیوں تک ساتھ رہنے کی وجہ سے بالارادہ اور بلا ارادہ دونوں نے ایک دوسرے کی معاشرت، طرز فکر، بول چال، حتیٰ کہ ایک دوسرے کے عقائد پر کتنا گہرا اثر ڈالا ہے چنانچہ اس ملک کی تاریخ کا ایک دور ایسا بھی گذرا ہے کہ کسی بازار سے نکل جائیے کسی محفل میں چلے جائیے یا کسی مجمع میں ہو آئیے جب تک کسی فرد کا نام نہ معلوم کیا جائے یہ بتلانا مشکل ہو جاتا تھا کہ کون کس مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ ہر ایک کا لباس وہی۔ قطع وہی اور چال ڈھال وہی۔ ایک یوروپی سیاح منوچی نے تو لکھا ہے کہ مغل اور راجپوت سپاہیوں کو صرف اس فرق سے پہچانا جاتا تھا کہ ایک انگرکھے کا بند دائیں جانب باندھتے تھے اور دوسرے بائیں جانب۔ اس کے سوائے دونوں کے لباس اور شکل و صورت میں کوئی فرق نہ تھا۔ اس عہد کے راجاؤں کی تصویریں دیکھئے۔ وہی لباس۔ وہی دستار۔ وہی جامے نیمے۔ حتیٰ کہ داڑھی اور مونچھوں کی تراش بھی وہی۔ اس عہد کی تصویروں کے نیچے جب تک یہ نہ لکھا جائے کہ کس کی شبیہ ہے یہ معلوم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ مصور نے کسی ہندو راجا کی تصویر کھینچی ہے یا مسلمان نواب کی۔ جنوبی ہند کی ریاستوں میں ہندوؤں کی طرز معاشرت کا اتنا گہرا اثر مسلمان حکمرانوں پر پڑا ہے کہ بادشاہوں نے ہندوانہ لباس اور وضع قطع کو ایسا اپنایا کہ ان کی شبیہ دیکھنے سے کسی ہندو راجا کا گمان ہوتا ہے۔ صرف یہی نہیں ہندستانیوں کی رہن سہن کھانے پینے کے طریقے ایک دوسرے سے متاثر ہوئے۔ ان کے فن تعمیر نے ایک نئی شکل اختیار کی اور ان کے ادب اور آرٹ پر بھی اس اتحاد کا اثر پڑا۔

فتح پور سیکری کے آثار، حضرت سلیم چشتی کی درگاہ کے در و دیوار، قطب شاہوں کی

"میں اس بات پر فخر کرتا ہوں کہ میں ایک ہندستانی ہوں اور ناقابل تقسیم
اور متحدہ ہندوستانی قومیت میں شامل ہوں۔ گیارہ صدیاں گذر گئیں۔
ہندستان کی سرزمین سے اسلام بھی اسی طرح وابستہ ہے جس طرح کہ
ہندو دھرم۔ اگر اس ملک کے باشندوں کا ہندو دھرم کئی ہزار سال سے
یہاں موجود ہے تو ایک ہزار سال سے اسلام بھی ہندستانیوں کا مذہب
بن چکا ہے۔"

اسی سلسلے میں آگے چلکر مولانا نے وہ باتیں بیان کی ہیں جو آج بھی ہر ہندستانی کے لئے
مشعل ہدایت ہیں۔ انھوں نے فرمایا :-

"صدیوں کی مشترک تاریخ نے ہماری ہندستانی زندگی کے تمام گوشوں کو
اپنی تعمیر سامانوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں۔ ہماری شاعری۔ ہمارا
ادب۔ ہماری معاشرت۔ ہمارا ذوق۔ ہمارا لباس۔ ہمارے رسم و رواج۔
ہماری روزانہ زندگی کی بیشمار حقیقتیں۔ کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں جس پر
اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ سکی ہو۔ ہماری بولیاں الگ تھیں
مگر ہم ایک زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے
بیگانہ تھے مگر انھوں نے مل جل کر ایک نیا سانچہ پیدا کر لیا۔ ہمارا
پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے مگر وہ اب
ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا۔ یہ تمام مشترکہ سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی
ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے
جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہم اگر ایسے ہندو
دماغ ہیں جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس
لائیں تو انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں اور وہ

نظر آنے لگے۔ اور اپنا ملک پرایا اور اپنے لوگ غیر دکھائی دینے لگے ۔ دونوں ——— (REVIVALISM) یا احیائے ماضی کی اس نئی تحریک کے تیز و تند دھاروں میں ایسے بہہ گئے کہ ایک دوسرے سے کوسوں دور ہو گئے۔ کسی کو یہ جنت نشان کفرستان نظر آنے لگا اور کسی کو ہندو استھان کسی نے خیال کیا کہ ہر وہ شے جو عجم اور عرب سے آتی ہے جنتی ہے تو کسی نے یہ گمان کر لیا کہ ہر وہ پتھر یا سنگ ریزہ جو بنارس یا متھرا سے آئے نجات دہندہ ہے۔ اس طرح پورا ہندستان ایک ایسا راگ محل بن گیا جہاں ہندو اور مسلمان اپنی اپنی جدا گانہ تان اڑانے میں مشغول ہو گئے ۔ اور ایسی ایسی بے ہنگم صدائیں سنانے لگے کہ صاحبان ذوق اپنے کانوں پر ہاتھ دھرنے پر مجبور ہو گئے اور ہندستانی قومیت اور تہذیب و کلچر کا وہ نشاۃ ثانیہ جو صدیوں کے میل جول سے وجود میں آرہا تھا ترجنے سے پہلے مرجھا گیا اور ایک ایسے دورِ خزاں میں اگر ہندستان کی خوش قسمتی سے رانا ڈے۔ دادا بھائی نوروجی۔ مہاتما گاندھی۔ اور مولانا آزاد کا وجود نہ ہوتا تو وہ ہمیشہ کے لئے مر چکا ہوتا۔

ان مشاہیر ہند میں خاص طور پر مولانا آزاد نے ہندستانی کلچر کے تحفظ کے سلسلہ میں اس ملک پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ انھوں نے ایک ایسے زمانے میں جب ہندی مسلمان ناامیدی اور رجعت پسندی کے باعث شدید طور پر علحدگی پسند ہوتا جارہا تھا اپنی تقریروں اور تحریروں اور اپنے اخبار الہلال اور سب سے زیادہ اپنے طرز عمل سے یہ ثابت کر دکھایا کہ ہندی مسلمان بھی اسی طرح ہندی ہے جس طرح ہندو ۔جین ۔ بدھ ۔سکھ ۔ یا عیسائی ۔ اور اس ملک کے سنوارنے اور اس کے پروان چڑھانے میں اس نے برابر کا حصہ لیا ہے ۔لہذا اس متروکہ میں وہ برابر کا حصہ دار بھی ہے۔

سنہ ۱۹۴۰ء میں جب وہ کانگریس کے صدر منتخب ہوئے تو اپنے خطبۂ صدارت میں اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے اسلام کے ساتھ اپنی وابستگی پر فخر کرتے ہوئے فرمایا کہ :-

اور اس لئے کہ انسانوں سے ہم کو طمع خیر ہے حالانکہ خیر کی کنجیاں صرف ایک ہی کے ہاتھ میں ہیں۔

"جب ہم پُر رعب ناموں سے مرعوب ہو جاتے تھے اور جب ہم حق و باطل کا معیار افراد کی شخصیت قرار دیتے تھے، تمام امور سے قطع نظر کر کے دیکھو کہ پہلا سے علوم و فنون کو اس سے کتنا نقصان پہنچا۔ ہر علم و فن میں ہمارا وجود معطل ہو گیا۔ زبانیں تھیں لیکن بولتے نہ تھے۔ دل تھے مگر سمجھتے نہ تھے۔ قید تحریر میں جو چیز آگئی وہ تنسیخ کے لائق نہ تھی۔ ہر کتابی مخلوق جو کسی خالق ممکن کی طرف منسوب تھی صداقت و معصومیت کا پیکر تھی۔ ہر صادق العہد وجود انسانی بعد کے آنے والوں کی عقول و آراء پر حکومت کرتا تھا الغرض ہر صادق ہستی کا حکم اس قدیم ہستی کے حکم کی طرح تسلیم کیا جاتا تھا جس کی شان یہ ہے کہ :-

باطل نہ اس کے آگے آ سکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے آ سکتا ہے۔"

مولانا کی یہ جدت پسندی صحیح معنوں میں حقیقت پسندی تھی اور تعجب ہوتا ہے کہ ایک ایسے آدمی کے مزاج میں وہ کیونکر دخل پا سکی جس کی آنکھیں مخصوص خاندانی روایات اور خاص مسلک وعقائد کے گہوارہ میں کھلی تھیں "غبار خاطر" میں اپنے بچپن کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

"میں نے ہوش سنبھالتے ہی ایسے بزرگوں کو اپنے سامنے پایا جو عقائد و افکار میں اپنا ایک خاص مسلک رکھتے تھے۔ اور اس میں اس درجہ متصلب اور بے لچک تھے کہ بال برابر بھی ادھر اُدھر ہونا کفر و زندقہ تصور کرتے تھے۔ میں نے بچپن سے اپنے خاندان کی جو روایتیں سنیں وہ بھی سرتاسر اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اور میرا دماغی ورثہ اسی تصلب اور جمود سے بوجھل تھا۔ میری تعلیم ایسے گردوپیش میں ہوئی جو چاروں طرف سے قدامت پرستی

کبھی پورا ہونے والا نہیں۔ اسی طرح اگر ایسے مسلمان دماغ موجود ہیں
جو چاہتے ہیں کہ اپنی گذری ہوئی تہذیب و معاشرت کو پھر تازہ کریں
جو وہ ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے تو میں
ان سے کہوں گا کہ وہ اس خواب سے جس قدر جلد بیدار ہو جائیں بہتر ہے
کیونکہ یہ ایک غیر قدرتی تخیل ہے اور حقیقت کی سرزمین میں ایسے خیالات
اُگ نہیں سکتے"

واقعہ یہ ہے کہ مولانا آزاد بچپن سے ہر قسم کی اندھی قدامت پسندی اور خوش اعتقادی اور رجعت پسندی کے انتہائی مخالف تھے۔ یہی فطری جدت پسندی ان کی بے پناہ ذکاوت اور فراست کے ساتھ مل کر ایسی فوق فطری قوت کی حامل ہو گئی جس کی نظیر بدھ اور شنکر کے بعد ہندستان کی تاریخ میں شاید ہی ملتی ہو۔ ماضی پرستی کا کوئی حیلہ خواہ بادی النظر میں وہ کتنا ہی دلکش اور پُر از جذبات ہو ان کو محض تہذیب یا ثقافت کے نام سے مسخر نہیں کر سکتا تھا۔ انھوں نے بہت پہلے لکھا تھا :-

"ہمارا دل کیوں آزاد نہیں۔ ہم حق کے کیوں حامی نہیں۔ ہم استقلال فکر کے
کیوں طالب نہیں۔ تقلید اشخاص کی زنجیروں کو کیوں ہم اپنے پاؤں کا زیور
سمجھتے ہیں۔ ہم طوق غلامی کو تمغۂ شرف کیوں جان رہے ہیں۔ اس لئے
کہ حسن اعتقاد کو ہم نے معصومیت کی سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچا دیا ہے
حالانکہ ایک ہی ہے (یعنی خدا) جس کی ذات ہر نقص سے پاک اور ہر خطا
سے مبرا ہے اور ایک ہی جماعت ہے (یعنی انبیا) جو گناہوں سے معصوم
بنائی گئی ہے اور پھر اس کی رضا جوئی میں ہر محبت غیر ہم رتبۂ عداوت ہے
اور اس لئے کہ ہم دنیا کے ذرہ ذرہ سے خوف کرتے ہیں حالانکہ ایک ہی ہے
جس کا آسمان و زمین میں خوف ہے یعنی وہ جو دنیا کے ذرہ ذرہ پر قابض ہو۔

ایک بالکل نئی حرکت پیدا کر دی۔ پہلے وہ اپنے ہندو بھائیوں کی پولیٹکل سرگرمیوں میں سے نہ صرف الگ تھے بلکہ ان کی مخالفت کے لئے بیرو کریسی کے ہاتھ میں ایک ہتھیار کی طرح کام دیتے تھے۔ گورنمنٹ کی تفرقہ انداز پالیسی نے انھیں اس فریب میں مبتلا کر رکھا تھا کہ ملک میں ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ہندوستان اگر آزاد ہو گیا تو ہندو گورنمنٹ قائم ہو جائے گی۔ مگر "الہلال" نے مسلمانوں کو تعداد کی جگہ ایمان پر اعتماد کرنے کی تلقین کی اور بے خوف ہو کر ہندوؤں سے مل جانے کی دعوت دی۔ اس سے وہ تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کا نتیجہ متحدہ تحریک خلافت و سوراج ہے۔

میں بتلانا چاہتا ہوں کہ الہلال تمامتر آزادی یا موت کی دعوت تھی"

نئے دور، نئی نسل اور نئے ہندستان کی صلاحیتوں میں مولانا آزاد کا ایقان تھا۔ ہندستان کے مستقبل پر ان کو بھروسہ تھا اور ہندستان کی ملی جلی تہذیب و تمدن کے ابھرتے ہوئے نقوش سے ان کو غیر معمولی دلچسپی تھی۔ اور یہ سب منطقی نتیجہ تھے مولانا کی اس نفرت اور بیزاری کا جو ماضی کی فرسودہ طلسمات سے ان کو تھی۔ انھوں نے ہر موقع پر تحریک احیائے ماضی کی مخالفت کی اور ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو ایک ایسے وقت میں بھی للکارا جب کہ فرقہ پرستی کا خونریز دیو اپنی پوری طاقت کے ساتھ قوم پرستی پر حملہ کر رہا تھا۔

دو قومی نظریہ کے خلاف بھی مولانا آزاد کی جد و جہد کا پس منظر یہی ہے۔ وہ جانتے تھے کہ جب چین روس اور مصر جیسے ملکوں میں مختلف مذاہب کے پیرو صدیوں تک ایک ساتھ رہتے ہوئے ایسے گھل مل سکتے ہیں کہ نئی ابھرتی ہوئی قوموں کی صف اول میں شریک ہو سکیں تو پھر ہندستان جیسے ملک میں جس کی صلح پسندی اور رواداری ضرب المثل ہے اور جس میں ایک ہزار سال تک ایک ساتھ رہنے کے بعد دونوں کا کلچر ایک ہو چکا ہے اور معاشرتی و تمدنی حیثیت سے دونوں ایک دوسرے میں پیوست ہو چکے ہیں، دونوں کو ایک دوسرے

اور تقلید کی چار دیواری میں گھرا ہوا تھا۔ اور باہر کی مخالف ہواؤں کا وہاں
تک گذر ہی نہ تھا۔"

جس انسان نے قدامت پرست روایات میں پرورش پائی ہو جس نے قدیم علوم کے حصول میں رات دن صرف کردیے ہوں اور ان میں وہ دستگاہ حاصل کی ہو جس کی مثال شاید ہی مل سکے وہ بلا تکلف یہ فیصلہ سُناتا ہے کہ اس قسم کی قدیم طرز تعلیم آئندہ نسلوں کے لئے فضول اور بیکار ہے، اور نوجوان نسلوں کی اوقات ضائع کرنا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:۔

"پھر خود اس تعلیم کا حال کیا تھا جس کی تحصیل میں تمام ابتدائی زمانہ بسر ہوا۔
ایک ایسا فرسودہ نظام تعلیم، جسے فن تعلیم کے جس زاویۂ نگاہ سے بھی
دیکھا جائے یکسر تاسر عقیم ہو چکا ہے۔ طریقۂ تعلیم کے اعتبار سے ناقص،
مضامین کے اعتبار سے ناقص، انتخاب کے اعتبار سے ناقص، درس و
املا کے اسلوب کے اعتبار سے ناقص"۔ (صفحہ ۱۱۷)

آج بھی کتنے لوگ ایسے ملیں گے جو قدیم طرز کی تعلیم پانے کے باوجود بلا خوف وخطر اس قدامت پرستی کی مخالفت محض اس لئے کریں گے کہ وہ مخلصانہ طور پر آئندہ نسل کے لئے، اسے اچھا نہیں سمجھتے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ الفاظ صرف اسی ہستی کو زیب دیتے ہیں جس نے تصویر کے دونوں رخ دیکھے ہوں۔ اور جو احیائے ماضی کی رجعت پسندی کے خلاف ہو اور اجتہادی شان رکھتا ہو۔ مولانا نے ہندستانی مسلمانوں اور غیر مسلموں کی تحریک رجعت پسندی کے خلاف جس قسم کے غیر معمولی مساعی سے کام لیا وہ ایک اعلیٰ پایہ کے مجتہد العصر اور امام وقت ہی کا حصہ تھا۔ دوسروں کی تقلید سے نکل کر انھوں نے ایک ایسا صحت مند نظریۂ حیات قائم کیا جو مسلمانان ہند کی باعزت زندگی کا ضامن تھا۔ مولانا نے یہ کام آزادئ ہند کے بعد نہیں بلکہ اس سے سالہا سال قبل الہلال کی اشاعت کے ساتھ ہی شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے لکھا تھا:۔

"الہلال نے تین سال کے اندر مسلمانان ہند کی مذہبی و سیاسی حالت میں

سے دست بردار ہو جاؤں گا مگر اس سے دست بردار نہ ہونگا کیونکہ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندستان کا نقصان ہوگا لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے "

ہندستانی قومیت پر اس ایقان کے باوجود وہ جانتے تھے کہ ہندستان کے معاشرت کی خصوصیت اور اس کا حسن اس متنوع طرز زندگی میں پنہاں ہے جو مختلف کلچروں کے لطیف آمیزے کی شکل میں وجود میں آیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی ساری زندگی میں کسی فرقہ کو یہ تلقین نہیں کی کہ وہ اپنی مخصوص طرز معاشرت میں یک رنگی اور یکسانی کی خاطر ترک کردے۔ زبان کے معاملہ میں بھی گو وہ قانونی طرز پر ہندی کو بحیثیت سرکاری زبان قبول کر چکے تھے لیکن دوسری زبانوں اور خصوصاً اردو سے ان کا تعلق خاطر کبھی متزلزل نہیں ہوا۔ بلکہ انھوں نے تمام صوبہ جات کی زبانوں کی ترقی کے لئے ہر آن کوشش کی۔ ہندستانی ساہتیہ اکاڈیمی ان کے اس عقیدے کی آئینہ دار ہے۔ اور اس کو قائم کر کے انھوں نے ہندستان کی دیگر زبانوں اور صوبوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ ہندستان کی جملہ زبانوں میں ان کی مختلف شکلوں اور رسم الخطوں کے باوجود ہندستان ہی کا دل دھڑک رہا ہے اور یہ سب ایک ہی کلچر اور سماج کی آئینہ دار ہیں۔ اور اگر ان کے آپس میں کوئی اختلاف یا ناگوارگی ہے تو اس کے سمجھنے یا ہم آہنگ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ باہمی ترجموں کے ذریعہ سے ان کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے۔ اگر مولانا کا لگایا ہوا یہ پودا اسی طرح نشو و نما حاصل کرتا رہا تو بہت جلد ہندستان کی زبانیں اور صوبے ایک دوسرے کے قریب آجائیں گے اور ہندستانی کلچر کا نشاۃ ثانیہ تکمیل کو پہونچ سکے گا۔

مولانا آزاد خود بھی تمام عمر ہندستانی کلچر کی وحدت میں کثرت کے جواز کو ثابت کرنے کے لئے اپنے لباس اور وضع و قطع میں ایک مخصوص طرز کے حامل رہے۔ اکثر و بیشتر تنگ نظروں نے ان پر اس بارے میں تنقید کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ان کو معلوم تھا کہ اگر جنوب کے مدراسی اور میسوری وطن پرست اپنی مخصوص پگڑیوں اور دستاروں اور لباس میں بھی

سے جدا کرنا فطرت اور حقیقت کے خلاف ہے۔ چنانچہ جب دو قومی نظریہ کا نعرہ لگایا گیا اور بڑے بڑے لوگ اس کے علمبردار ہو گئے تو مولانا نے اعلان حق میں پس وپیش محسوس کیا اور کہا کہ:-

"مسلمانوں کو پورا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے حقوق اور مفادات کے لئے جس قسم کی جدوجہد کرنا چاہیں کریں۔ یہ انکا اندرونی قضیہ ہے لیکن انھیں کسی حالت میں کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہیئے جو ہندستان کی آزادی کے خلاف دلیل لایا جا سکے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کو ہندستان کی آزادی کی راہ میں سنگ رہ بنایا جا رہا ہے۔ میں نے ۱۹۱۲ء ہی میں مسلمانوں کو اس خطرہ سے متنبہ کیا تھا۔ میرے دل کی گہرائیاں اس خیال سے مجروح ہوتی ہیں کہ آج ۲۷ سال کے بعد پھر وہی بات کہنی پڑی۔"

جیسا کہ خود مولانا نے فرمایا تھا یہ اعلان حق ان کا کوئی نیا اور جذباتی اقدام نہیں تھا۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء میں بھی ہر مرتبہ وہ مسلمانوں کو اس جانب متوجہ کرتے رہے تھے کہ ان کے ہندستانی ہونے پر ہی نہ صرف ان کا، ہندستان کا بلکہ انسانیت کا بھلا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:-

"ہندستان کے لئے آزادی کے لئے صداقت وحق پرستی کے بہترین اور اعلیٰ فرائض ادا کرنے کے لئے ہندستان کے ہندو اور مسلمانوں کا اتحاد اور ان کی یکجہتی ضروری ہے۔"

پھر ان کے یہ الفاظ ان کے اس غیر متزلزل ایقان کو ظاہر کرتے ہیں جو ہندو مسلمان اتحاد کے بارے میں اور انسانیت کی بھلائی کے لئے ان کی نظر سے کبھی اوجھل نہ ہوا۔

"آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں میں سے اتر آئے اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑا ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج ۲۴ گھنٹوں کے اندر مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندستان ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے تو میں سوراج

اجلاس منعقدہ ۲۲ - مئی ۱۹۵۸ء کی صدارت جناب پنڈت شیام لال صراف وزیر تعلیمات حکومت جموں وکشمیر نے کی تھی۔ موصوف نے صدارتی تقریر برجستہ کی جس کا خلاصہ افسوس ہے کہ کوشش کے باوجود حاصل نہ ہوسکا۔

محب وطن اور کانگریسی ہو سکتے ہیں، اور اگر پنڈت مدن موہن مالوی جنھوں نے عمر بھر اپنی ایک خاص وضع قطع رکھی، قومی رہنما بن سکتے ہیں تو پھر ایک ایسا شخص بھی جس کا قلب حب الوطنی سے مالامال ہو ایک مخصوص لباس پہنے بغیر بھی ہندو دوست اور ہندستانی رہ سکتا ہے۔ شاید اپنی مخصوص طرز روش سے وہ متعصب اور تنگ نظر ساتھیوں کو یہ دکھلانا چاہتے ہوں کہ اپنی انفرادیت کھو دینا قومیت کے لئے ضروری اور لازمی نہیں ہے۔ مولانا کی زندگی اور رفتار و گفتار ہندستانی کلچر کا بہترین نمونہ تھی۔ اور کلچر کے سمجھنے اور سمجھانے کے لئے ایک اعلیٰ اور معیاری مثال کا کام دیتی تھی۔

آخر میں مولانا آزاد کے سب سے بڑے کارنامے ترجمان القرآن کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس میں انھوں نے بتایا کہ خدا رب المسلمین نہیں رب العالمین ہے۔ اور بنیادی سچائیاں اصلاً تمام مذاہب عالم میں موجود ہیں۔ اسی لئے قرآن پاک دوسرے پیغمبروں کی نفی نہیں کرتا بلکہ تائید کرتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اسلام ایک وسیع دعوت ہے نیکی اور انسانیت کی رواداری اور صلح و آشتی کی۔ اسلام کے معنی ہیں شانتی کے۔ اس نظریہ نے بھی متحدہ قومیت کی بنیاد دل کو استوار کیا اور اس میں وہ جاذبیت پیدا کر دی جو ہندستانی تہذیب اور کلچر کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔

اس پس منظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مولانا آزاد کا کارنامہ ہندستانی کلچر کی نشاۃ ثانیہ میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اور جب تک آزادی کا جذبہ اور ہندستانی تمدن کی ملی جلی روایات زندہ ہیں یہ کارنامہ بھی دلوں پر ثبت رہے گا۔



جناب ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی

ادیب اور تنقید نگار۔ کئی کتابوں کے مصنف

ممبر، ساہتیہ اکادمی، ہند۔ الف۔ آر۔ اے۔ ایس۔ ایم۔ آئی۔ سی۔ او

صدر شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی



جناب ڈاکٹر اختر اورینوی

ادیب، ناقد، افسانہ نگار اور شاعر

کئی کتابوں کے مصنف

صدر شعبۂ اُردو۔ پٹنہ یونی ورسٹی



جناب ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی

ادیب، ناقد اور شاعر

کئی کتابوں کے مصنف

اُستاد اُردو۔ مسلم یونی ورسٹی۔ علی گڈھ

مولانا آزاد کی صحافتی عظمت

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی

مولانا ابوالکلام آزاد کی موت، ایک فرد کی موت نہیں، پورے ایک عہد کا خاتمہ ہے۔ ان کی زندگی کے ۷۰ سال میں، ہماری قومی تاریخ اس طرح تحلیل ہو گئی ہے کہ بغیر اس زمانہ کے واقعات اور ان کے پس منظر کو سامنے رکھے ہوئے ان کی صحافتی عظمت کو سمجھنا مشکل ہے۔ اس کے علاوہ ان کی شخصیت اور نصب العین کو سمجھنا بھی ضروری ہے جو ان کے یہاں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ دوئی کا احساس یا مرکز و محیط کا فرق باقی نہیں رہتا۔

صحافت کا سلسلۂ نسب ادب سے ملتا ہے۔ دونوں میں مخالفت نہیں، دوستی کا رشتہ ہے۔ ایک کو دوسرے سے مدد ملتی ہے۔ انگلستان میں بعض اچھے ادیب صحافی بھی تھے۔ مثلاً ڈیفو، کارج لیمب اور رسلے ہنٹ ——— اسی لئے ان کی نگارشات ادب کا بھی لائق رشک حصہ ہیں ——— مولانا آزاد بھی ان دونوں حیثیتوں کے جامع تھے۔ وہ ایک نادرہ کار صاحب قلم، ایک فصیح و بلیغ مقرر، ایک جادو بیان اور آتش نوا خطیب ہی نہیں، آزادی کے مجاہد اور نئے ہندوستان کے معمار بھی تھے۔ وہ اس صحیفہ کا آخری ورق تھے جس کی تزئین و آرایش میں علم و فضل کی بہترین روایات شامل تھیں۔ وہ ہندوستان کے مشہور لیڈروں کی طرح سیاست کے میدان میں ادب اور صحافت کے راستے داخل ہوئے تھے۔ یہ راستہ نیا نہیں ہے۔ امریکہ میں فرینکلن، مارک ٹوین (MARK TWAIN) والٹ وہٹ مین، روزولٹ سب نے یہی راستہ اختیار کیا تھا۔

انگلستان میں ایڈیسن، جانسن، میکالے۔ تھیکرے۔ گلیڈسٹن، چرچل، سیاست میں داخل ہونے سے پہلے مستقل مضمون نگار تھے۔ یہی سلسلہ فرانس میں رشیلو (RICHELIEU) سے لیکر کلیمنشو (CLEMENCEAU) تک جاری رہا، جرمنی میں گوئٹے اور شلر صحافی ہی تھے، بعد میں ادیب، شاعر اور مفکر بنے۔

مولانا آزاد کی سیاسی شہرت کا آغاز بھی ہندوستان میں اور ہندوستان کے باہر ان کی تحریروں کی وجہ سے ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ انھوں نے سیاست کو نہیں ڈھونڈا، سیاسی ہنگاموں نے ان کو ڈھونڈھ نکالا۔ لیکن بقول پنڈت نہرو "ان کی اصلی خصوصیت علم و فضل ہے۔ ان کو دیکھ کر وہ فرانسیسی قاموسی یاد آجاتے ہیں جو انقلاب فرانس سے کچھ عرصہ پہلے وہاں موجود تھے"

مولانا آزاد کی صحافت میں اُن کے علم و فضل نے چار چاند لگا دئے تھے۔ یہ خیال غلط ہے کہ معمولی قابلیت کا آدمی اچھا صحافی بن سکتا ہے۔ بقول واکھم۔ اسٹیڈ صحافی کو قدما کے فلسفہ، عصر حاضر کی تاریخ اور سائنسی علوم کی بہت اچھی واقفیت ہونا چاہیے لیکن اس کو یہ سلیقہ آتا ہو کہ اس علم کو اس طرح چھپائے جس طرح ایک سچا دین دار اپنی دین داری کو چھپاتا ہے اور اس علم کو صرف ضرورت کے وقت لاکھوں آدمیوں کے سامنے اس انداز سے پیش کرے کہ وہ اُن کے ذہن و دماغ کا جزو بن جائے۔

صحافت نگاری کا ملکہ زور بازو یا اکتساب سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ بڑا صحافی پیدا ہوتا ہے۔ کسی مدرسہ میں تعلیم اور تربیت سے نہیں نکلتا۔ مولانا آزاد نے سامرسٹ ماہم کی طرح لکھنا ایسے سیکھا تھا جیسے مچھلی تیرنا سیکھتی ہے یا بچہ سانس لینا۔ انشا کے قواعد ان کے ضمیر میں اس طرح جاگزیں تھے جیسے فولاد میں جوہر۔ وہ باغ وجود کے ثمر پیش رس تھے اور ان کی نمود میں ایک طرح کی عزابت تھی۔ جو تمدن اُنکو ایشا ملا



جناب مولانا سید اختر علی تلہری
عربی اور فارسی کے فاضل
ناقد، مقالہ نگار اور شاعر
کئی کتابوں کے مصنف



جناب علی سردار جعفری
ادیب، ناقد اور شاعر
کئی کتابوں کے مصنف



علی جواد زیدی
ادیب، ناقد اور شاعر
کئی کتابوں کے مصنف
پرائیویٹ سکریٹری، وزیر اعظم جموں و کشمیر، سری نگر

سید جمال الدین اسد آبادی کے متعلق مولانا نے ایک مضمون میں لکھا ہے :-

"اُس کی ، ذہنیت ایک ایسی ذہنیت ہے جو رسمی اسلام کے موثرات کی پوری طرح مقاومت کر سکتی ہے۔ میں جب اُس شخص سے باتیں کر رہا تھا تو اس کے افکار کی آزادی ، طبیعت کی فضیلت اور اظہار حقیقت کی جرأت دیکھکر مجھے خیال ہوا کہ میں اس وقت اُن مشاہیر عالم میں سے کسی ایک کو مخاطب کر رہا ہوں جو دنیا کے گزشتہ علمی زمانوں میں گزر چکے ہیں اور جن سے تاریخ کے ذریعہ ہم نے واقفیت حاصل کی ہے۔ میں گویا ابن سینا ، ابن رشد یا ان حکما، عظام میں سے کسی حکیم کو اپنے سامنے دیکھ رہا تھا جنھوں نے فکر انسانی کو جہل اور گمراہی کے قیود سے نجات دلانے کے لئے تاریخ عالم کی پانچ صدیوں تک اپنی شجاعانہ جدو جہد جاری رکھی تھی ـــــ"

حضرت مولانا نے سید جمال الدین افغانی ، ان کے شاگرد شیخ محمد عبدہ اور مصر جدید کے مشہور رہنما سعد پاشا کا ذکر اس انداز سے کیا ہے کہ خود ان کے خلوت کدۂ ذات کا حجاب اُٹھ گیا ہے لہٰذا ان کی عقیدت مندی اور اثر پذیری کے متعلق اتنی گراں قدر اندرونی شہادت فراہم ہو جاتی ہے کہ پھر کسی مزید ثبوت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا کو ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کی جو چنگاریاں ورثتاً ملی تھیں وہ اس ماحول میں اس طرح چمکیں کہ ان کی ساری زندگی ، جذبۂ حریت اور اعلائے کلمۃ الحق کی پُرسوز تفسیر بن گئی اور اسی لئے ان کی تحریریں ایک سلگتی ہوئی آگ اور ایک بھڑکتا ہوا شعلہ بن کر سامنے آئیں۔

مولانا ایک خاص ذہن اور دماغ کے ساتھ صحافت کے آسمان پر اس وقت طلوع ہوئے جب ہماری فضائے ادب روشن اور تابناک ستاروں سے مزین تھی۔ اُردو کے

وہ اسی پر قانع نہیں رہے بلکہ اُس میں جدید کی بیداری اور اس کے احساس و شعور کو بھی شامل کیا ـــــ وہ ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے تھے جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ و آشوب سے خاص طور پر متاثر ہوا تھا۔ یہ خاندان ان واقعات کا تماشائی نہیں، اس قلزم خون کا شناور رہا تھا۔ حالات اس کے سامنے سے گزرتے ہی نہیں رہے تھے بلکہ یہ خانوادۂ رشد و ہدایت ان کے اندر کھڑا رہا تھا۔ اس نے ایک ایک حالت کو دیکھا اور اسکی تلخی کو چکھا تھا۔ بقول مانٹگومری (MONTGOMERY MARTIN) انگریزوں کی فتح دہلی کے بعد دلی کی ایک بڑی آبادی دار پر کھینچ دی گئی۔ یہ تعداد معمولی نہیں تھی۔ ایک ایک گھر میں چالیس چالیس پچاس پچاس آدمی روپوش تھے۔ یہ لوگ باغی نہیں تھے۔ دہلی کے معصوم اور بے گناہ رہنے والے تھے جنھوں نے لڑائی کے بعد رحم کی درخواست کی تھی۔ لیکن مارٹن لکھتا ہے "مجھے خوشی ہے کہ ان کو مایوسی کا منھ دیکھنا پڑا۔ ناچار حضرت مولانا کے والد مولانا خیر الدین جو قادری نقشبندی سلسلہ کے مشہور صوفی بزرگ تھے اور جن کے اسلاف ہمیشہ فضل و کمال اور حق گوئی و راستبازی میں ممتاز رہے تھے، دہلی چھوڑ کر مکہ معظمہ چلے گئے جہاں مشہور عالم شیخ محمد ظاہر کی بھانجی کے بطن سے ۱۸۸۸ء میں حضرت مولانا پیدا ہوئے۔ اس طرح عربی ان کی مادری زبان تھی اور علم و فضل کی بہترین روایات ان کو ماں اور باپ دونوں کی طرف سے وراثت میں ملی تھیں۔

مولانا کا ابتدائی زمانہ حجاز میں گزرا۔ اس کے بعد کلکتہ میں انھوں نے درس نظامی کی تکمیل کی جس میں بالعموم ۱۳ یا ۱۴ برس صرف ہوتے ہیں۔ لیکن مولانا نے اپنے غیر معمولی حافظہ ادراک صحیح اور ذہن سلیم کی مدد سے یہ منزل چار سال میں پوری کر لی۔ اس کے بعد وہ عراق، مصر اور شام بھی مطالعہ اور تعلیم کی غرض سے تشریف لے گئے جہاں سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ کی قومی اور سیاسی تحریکات نے ان کے دل و دماغ پر غیر معمولی اثر ڈالا۔

پرچہ احسن الاخبار نکلا جس کا بیشتر کام حضرت مولانا کے سپرد تھا۔ اس میں بھی انھوں نے مضامین لکھے اور تبادلہ کے اُن عربی اخبارات کا جو مصر، قسطنطنیہ، طرابلس اور ٹیونس وغیرہ سے آتے تھے بغور مطالعہ کیا۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر مصر کے الہلال اور المنار ہیں۔ ان کے متعلق مولانا نے لکھا ہے :۔"بلا شبہ اس بارے میں الہلال اور المنار کے مجھ پر بہت سے حقوق ہیں"

مولانا نے احسن الاخبار میں ہر طرح کے مضامین لکھے"کئی مضمون ایسے بھی نکلے کہ ان کی وجہ سے ردّو بحث کا سلسلہ چھڑ گیا۔ اشہری مرحوم اور بعض اور کہنہ مشق اردو مضمون نگار جو احسن الاخبار میں باقاعدہ لکھا کرتے تھے، بحث و جدال میں شریک ہوگئے اور ایک ایک بحث ہفتوں جاری رہی"۔ اُس زمانہ میں مولانا کو فارسی نظم و نثر کے مطالعے کا بہت ذوق تھا۔ متعدد مضامین شعرائے ایران کے حالات اور ان کے کلام پر ریویو کے لکھے تھے۔ ازاں جملہ حافظ شیرازی اور عمر خیام پر پورا ایک سلسلہ شائع ہوا۔ اس سلسلہ میں یہ بحث چھڑ گئی کہ ان شعراء کے کلام سے ان کی زندگی اور کیریکٹر پر روشنی پڑتی ہے یا نہیں اور اس کا امکان ہے یا نہیں کہ ان کے جام و ساقی کی صدائیں محض شاعرانہ ہی نہ ہوں بلکہ واقعی ہوں "

اس زمانہ میں لکھنؤ سے منشی نوبت رائے نظر خدنگ نظر نکالتے تھے جب اس میں بتقلید مخزن، مضامین کا حصہ شامل کیا گیا تو مولانا اس کے اڈیٹر مقرر ہوئے۔ مولانا شبلی نے اسی کے ایک مضمون کی بنا پر انھیں خط لکھا تھا جو عکس ریز یعنی ضوء غیر مرئی کی تاریخ، انکشاف اور حقیقت سے متعلق تھا۔ ۱۹۰۲ء میں مولانا کی عمر چودہ برس کی تھی۔ اس زمانہ میں انھوں نے جو مضامین مرقع عالم ہردوئی میں لکھے ہیں وہ راقم الحروف کی نظر سے گذرے ہیں۔ ایک خط میں جو انھوں نے حکیم محمد علی اور مرقع عالم کو لکھا تھا اس میں اس پر زور دیا ہے کہ اس رسالہ کو ناولوں سے زیادہ سائنسی اور علمی مباحث اور موضوعات

عناصر خمسہ میں حالی، شبلی اور نذیر احمد زندہ تھے لیکن مولانا آزاد نے بقول شخصے دہلیز پر قدم رکھتے ہی نقارے پر ایسی زبردست چوٹ لگائی کہ سب کے کان ان ہی کی طرف لگ گئے اور سب کی نگاہیں یک بارگی ان ہی پر اُٹھ گئیں۔

سنہ ۱۹۰۴ء میں مولانا اپنا اخبار لسان الصدق نکالتے تھے۔ اسی زمانہ میں اُن کی مولانا حالی سے ملاقات ہوئی جن کو کسی طرح اس کا یقین نہ آتا تھا کہ یہ لڑکا اتنے اچھے اخبار کا اڈیٹر ہو سکتا ہے۔ اسی سنہ میں ان کی مولانا شبلی سے ملاقات ہوئی جو یہ سمجھے کہ وہ مولانا سے نہیں بلکہ مولانا کے صاحبزادے سے گفتگو کر رہے ہیں۔!

لیکن لسان الصدق مولانا کا پہلا اخبار نہیں تھا۔ انھوں نے در اصل سنہ ۱۸۹۹ء اور سنہ ۱۹۰۰ء سے شوقیہ کاغذ سیاہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اگرچہ انھیں ان تحریروں کو اشاعت کے لئے بھیجنے کی جرأت نہ ہوتی تھی لیکن وہ بار بار لکھتے اور خود ہی ایک نکتہ چیں نظر سے حک و اصلاح کرتے۔ بقول اُن کے "سب سے بڑا، بلند تر مقام جو کسی انسان کے لئے ہو سکتا تھا، یہ نظر آتا تھا کہ مضامین لکھے جائیں اور وہ ہمارے نام سے شائع ہوں۔ اس کے بعد اس سے بلند تر مقام یہ تھا کہ کسی اخبار یا رسالے کے اڈیٹر ہوں۔"

سنہ ۱۹۰۰ء کے اواخر کی بات ہے جب مولانا کی عمر صرف بارہ برس کی تھی کہ انھوں نے مصر کے اخبار مصباح الشرق کی تقلید میں ہفتہ وار المصباح نکالا جس کا پہلا ہی مضمون عید اتنا مقبول ہوا کہ اسے کئی اخباروں نے نقل کیا۔ لیکن یہ پرچہ تین چار مہینے سے زیادہ نہ چل سکا اور بند ہو گیا۔

سنہ ۱۹۰۱ء میں اُردو کا مشہور رسالہ مخزن جاری ہوا۔ مولانا نے اس میں اخبار اور اس کے فوائد پر اور دوسرا مضمون خاقانی شروانی کے حالات پر لکھا۔ اُس وقت مولانا کا ارادہ تھا کہ آبِ حیات کی طرح ایک تذکرہ شعرائے ایران کا لکھیں۔ یہ مقالہ اسی ارادے کے سلسلہ میں تھا لیکن خوش قسمتی سے اسی زمانہ میں کلکتہ سے ایک

ہر طاقت کے لئے ایک مخصوص بت ہوتا تھا۔ یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ رزق کا دیوتا علم کے دیوتا کے کاموں میں مداخلت کرے یا کیوپڈ، وینس کی حکومت میں خلل ڈالے لیکن ان لوگوں نے صرف ایک ہی بُت بنایا ہے اور اس کے اختیارات اتنے وسیع ہیں کہ علم و عمل کا کوئی گوشہ اس سے خالی نہیں۔"

مولانا آزاد، جمال الدین افغانی اور محمدؐ عبدہ کے وطن پرستانہ خیالات سے متاثر ہو چکے تھے اور انھوں نے مصر میں "عروسِ آزادی" کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھ لی تھی اس لئے وہ علیگڑھ اسکول کے ان خیالات کی حمایت نہ کرسکے جن میں برطانیہ کی وفاداری بھی لازمی شرط کے طور پر شامل تھی۔ انھوں نے پوری شدت کے ساتھ علی گڈھ کے قلعہ پر حملہ کیا لیکن بقول پنڈت نہروؔ "بخط مستقیم نہیں بلکہ ایسے افکار کی اشاعت کرکے جنھوں نے علی گڈھ کی روایات کی بنیاد کو ہلا دیا۔"

ہندوستان میں انگریزی سیاست نے نفاق کے بیج اچھی طرح بو دیئے تھے۔ بنگال کو دو حصے میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ مسلمانوں کو کانگرس سے الگ رکھنے اور برطانوی حکومت سے وفاداری پیدا کرنے کے لئے مسلم لیگ قائم کی جا چکی تھی ـــــــ اور ہندوستان کے باہر مراکش کے متعلق انگریزوں اور فرانسیسیوں میں سازباز ہو رہا تھا۔ ایران، انگریزوں اور روسیوں کے درمیان تقسیم ہو چکا تھا۔ طرابلس پر اطالویوں نے حملہ کر دیا تھا اور یورپ کے مرد بیمار ترکی کو فنا کرنے کے منصوبے ہو رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برطانوی سامراجیت، مشرق کی روح آزادی کو کچلنے کے لئے پوری طرح کمربستہ ہے۔

یہ حالات تھے جب مولانا آزاد نے ۱۹۱۲ء میں اپنا اخبار الہلال جاری کیا جو اپنی قوم اور اپنے ہم وطنوں کے لئے ایک نئی آواز، ایک نئی دعوت اور ایک نیا پیغام تھا۔

کی طرف توجہ دینا چاہیے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ اس وقت بھی مولانا کی نظر کا پیمانہ بلند اور نظر کا معیار ارجمند تھا۔

مولانا شبلی ان سے فرمایا کرتے تھے کہ تمھارا ذہن و دماغ عجائب روزگار میں سے ہے تمھیں تو کسی علمی نمائش گاہ میں بطور ایک اعجوبے کے پیش کرنا چاہیے اسی عقیدت کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے ندوہ کی ادارت مولانا آزاد کے سپرد کر دی اور انھوں نے اس خدمت کو سات آٹھ مہینے بڑی خوبی سے انجام دیا۔

مولانا آزاد نیرنگ عالم۔ تحفۂ محمدیہ کلکتہ۔ وکیل امرت سر اور اخبار دارالسلطنت کلکتہ کے بھی اڈیٹر رہے "یہ سب کچھ چند سالوں کا واقعہ ہے۔ ایک حالت سے دوسری حالت تک بشکل چند ماہ پیش آتے تھے" لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سالوں کی راہ مہینوں میں اور مہینوں کی ہفتوں میں طے کی ہے۔ اس سے ان کی مشق میں اضافہ ہوا اور ذمہ دارانہ تحریر و تربیت کے اچھے مواقع ملے۔

یہ وہ دور ہے جب مولانا آزاد سرسید احمد خاں کے خیالات سے بے حد متاثر تھے اور اس راہ میں وہ تقلید سے لے کر انکار و الحاد تک سب ہی منزلوں سے گزر چکے تھے لیکن بہت جلد فطری ودیعتوں نے ان کی مدد کی اور انھوں نے از خود ایک ایسی راہ پیدا کر لی جو سرسید سے قطعی الگ تھی۔ اس تیز رفتاری سے تلووں میں چھالے تو پڑ گئے لیکن "راہ کے خس و خاشاک بھی صاف ہو گئے"۔

اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی زندگی "وفا کیشی اور رعایات و حقوق کے اسی دائرہ میں محدود تھی جو سرسید، بک، آرچ بولڈ اور آغا خان نے اُن کے گرد کھینچ دیا تھا۔ ان کی حالت اس بھیڑ کی طرح تھی جو دھوپ میں کھڑے ہو کر اپنے بال سکھاتی ہے۔ بقول مولانا آزاد" ان لوگوں نے اپنی تقلید اور پرستش کا ایک نیا بت بنایا ہے اور اس کا نام رکھا ہے "سرسید کی پالیسی"۔ یونانی علم الاصنام میں

ظلم و عدوان کے بعد بھی ہمارے لئے باقی رہے؟ آدم کی اولاد دو دو کی محکوم نہیں ہو سکتی۔ وہ ایک سے ملے گی۔ دوسرے کو چھوڑے گی۔ ایک سے جوڑے گی۔ دوسرے سے کٹے گی۔ پھر خدارا مجھے تبلاؤ کہ ایک مومن کس کو چھوڑے گا اور کس سے ملے گا؟"

ایک اور موقع پر اسی خیال کو دوسرے انداز میں پیش کرتے ہیں :۔

"یاد رہے کہ ہر اطاعت کے لئے ایک سرکشی، ہر وفاداری کے لئے ایک دشمنی، اور ہر عاجزی کے لئے ایک غرور و تمرد لازمی ہے۔ آپ ایک آقا کے نوکر ہو نہیں سکتے جب تک کہ اور تمام آقاؤں سے انکار نہ کر دیں۔ زید سے اگر آپ کو محبت ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اسکے تمام دشمنوں کے آپ دشمن ہو گئے۔ ایک چوکھٹ پر جب ہی سر جھک سکتا ہے جب اور تمام سر جھکانے والی چوکھٹوں پر سے مغرورانہ گزر جایئے۔ جب آپ نے کہا کہ میں روشنی ہی کو پسند کرتا ہوں تو ضمناً اس کا بھی اقرار کر لیا کہ تاریکی سے متنفر ہوں۔ آپ ایک ہی جانب اپنا منہ کر نہیں سکتے جب تک اور ہر طرف سے منہ پھیر نہ لیں اور ایک ہی سے اپنا رشتہ جوڑ نہیں سکتے جب تک ہر طرف سے رشتے کاٹ نہ لیں۔ پس خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کے لئے پہلی چیز یہ ہے کہ اس کے سوا اور جتنی قوتیں اپنی اطاعت کی طرف بلاتی ہیں، ان سب سے باغی ہو جایئے اور اس کے آگے جھکنے سے پہلے اور تمام جھکانے والوں کے آگے مغرور ہو جایئے۔ جو لوگ اس کی اطاعت کے مدعی ہیں ان کی اطاعت سے پہلے سرکشی کا، وفاداری سے پہلے بغاوت کا، اور دوستی سے پہلے

مولانا نے بتلایا کہ مسلمانوں کا کیا فرض ہے۔

"اسلام ایک مجموعہ فرائض ہے جو ہر پیرو کے ذمہ اللہ کی طرف سے چند فرائض عاید کر دیتا ہے۔ ان فرائض میں جس طرح پہلا فرض اقرار شہادتین ہے، بالکل اسی طرح فرض جہاد ہے یعنی حق اور عدل کے قیام کے لئے اپنا مال، اپنا نفس اور اپنا خون بہانا۔"

مولانا نے توحید کی وضاحت کرتے ہوئے اس پر زور دیا ہے کہ وہ برطانوی حکومت جو ظلم و عدوان پر قائم ہے اس سے سرکشی کی جائے۔ لکھتے ہیں :۔

"دنیا میں ہر انسان کے لئے بے شمار حاکم اور بہت سی جھکانے والی قوتیں ہیں لیکن مومن کے لئے صرف ایک ہی ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں۔ وہ صرف اسی کے آگے جھک سکتا ہے اور صرف اسی کو مانتا ہے۔ اس کی اشاعت کا حق ایک ہی کو ہے۔ اس کی پیشانی کے جھکنے کی چوکھٹ ایک ہی ہے اور اس کے دل کی خریداری کے لئے بھی ایک ہی خریدار ہے۔"

اسکے بعد لکھتے ہیں :۔

"سرور کائنات اور سید المرسلین صلعم سے بڑھ کر مسلمانوں کا کون آقا ہو سکتا ہے لیکن خود اس نے بھی جب عقبہ میں انصار سے بیعت لی تو فرمایا و الطاعۃ فی معروف "میری اطاعت تم پر اسی وقت تک کے لئے واجب ہے جب تک کہ میں تم کو نیکی کا حکم دوں۔ جب اس شہنشاہ کونین کی اطاعت مسلمانوں پر نیکی و معروف کے ساتھ مشروط ہے تو پھر دنیا میں کون بادشاہ، کون سی حکومت، کون سے پیشوا، کون سے رہنما اور کون سی قوتیں ایسی ہو سکتی ہیں جن کی اطاعت

اس سب کے مقابلہ پر حضرت مولانا کا یہ رجز ملاحظہ ہو :۔

"آہ کاش مجھے وہ صور قیام قیامت ملتا جس کو میں لے کر پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر چڑھ جاتا۔ اس کی ایک صدائے رعد آسائے غفلت شکن سے سرگشتگان خواب ذلت و رسوائی کو بیدار کرتا اور چیخ چیخ کر پکارتا کہ اٹھو! کیوں کہ بہت سو چکے اور بیدار ہو کیوں کہ اب تمہارا خدا تمھیں بیدار کرنا چاہتا ہے۔ پھر تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ دنیا کو دیکھتے ہو پر اس کی نہیں سنتے جو تمھیں موت کی جگہ حیات، زوال کی جگہ عروج اور ذلت کی جگہ عزت بخشتا ہے۔"

یہ اخبار در اصل صور قیامت تھا۔ اس نے مردہ دلوں میں ایک نئی جان پیدا کر دی اور وہ شعلۂ حیات جو سرد ہو رہا تھا اس کو بھڑکا دیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ اسلام اپنے پیرووں سے آخری فرض کے ادا کرنے کا طالب ہے جس میں سب سے پہلے جہاد لسانی و مالی، اور سب کے آخر میں جہاد جان و نفس ہے۔ مولانا نے الہلال کے ذریعہ اعلائے کلمۃ الحق کیا ہے اور حق گوئی اور راست گفتاری کی وہ مثال قائم کی ہے جو ہماری صحافت کی تاریخ میں بالکل نئی ہے ـــــ انھوں نے قرآن کی معرفت اور تفسیری ترجمہ سے اسلام کی سچی تعلیم کے احیا کی کوشش کی جس میں سب سے زیادہ زور سچ بات کہنے اور آزادی کے لئے لڑنے پر ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے ثمر بار مقالوں کی دھوم سارے ملک میں مچ گئی اور وہ جاگیردار مسلمان جن کی سیاست سرتاسر رجعت پسندانہ تھی اور جو ابھی روپہلی مصلحتوں کے پیش نظر حکومت کی خوشنودی ہی میں دنیا و عقبیٰ کی نجات سمجھتے تھے اب آزادی کے میدان میں بیش از بیش حصہ لینے لگے اور اُن کے مذہبی افکار میں اور پھر اُن کے ذریعہ اُن کے سیاسی افکار میں زبردست تبدیلی واقع ہو گئی۔ مولانا محمود الحسن مولانا محمد علی

دشمنی کا ثبوت دینا چاہیئے۔ ان کو آزمائش میں پڑ کر ثابت کرنا چاہیئے
کہ خدا کی وفاداری کے لیے انھوں نے کن کن قوتوں سے بغاوت
کی ہے ؟"

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں :۔

"یاد رکھو ہر محبت کے لیے ایک بغض دنیا میں لازمی ہے۔
اور کوئی عاجزی نہیں کر سکتا جب تک کہ متکبر و مغرور بھی نہ ہو۔
نیکی کو اگر پسند کرو گے تو اس کی خاطر بدی کو برا کہنا ہی پڑے گا
اور خدا کو خوش رکھنا چاہتے ہو تو شیطان کی دشمنی کی پرواہ مت کرو۔"

اس وقت مسلمان پستی کے گڑھے میں پڑے تھے۔ ان کے قوائے عمل شل ہو چکے تھے اور ان کے پاس بجز اوہام کے تار و پود کے کچھ نہ تھا۔ سیاست میں وہ اس حد سے آگے بڑھنے کے لیے آمادہ نہ تھے جو سرسید نے قائم کر دی تھی۔ ساری قوم اسی تعلیمی بانسری کی خواب آور موسیقی سے مست تھی۔ ۱۸۵۷ء میں انھوں نے ایثار و عمل کی جو اعلیٰ روایات قائم کی تھیں وہ بھلائی جا چکی تھیں۔ برطانیہ کی وہ پالیسی جس کا مقصد مسلمانوں کو وفادار بنانا اور ملکی سیاست سے الگ رکھنا تھا کامیاب ہو چکی تھی۔ اس حد تک کامیاب کہ نواب مشتاق حسین علی گڑھ کالج کے سکریٹری نے کھڑے ہو کر اعلان کیا تھا کہ مسلمانوں کی تلوار ہمیشہ برطانیہ کی حفاظت کے لیے بے نیام رہے گی۔ مولانا محمد علی کی بھی آزادیٔ فکر اس وقت اس سے آگے نہ بڑھ سکی کہ آغاز جنگ طرابلس کے موقع پر وائسرائے سے دریافت کرتے ہیں: "مسلمانوں کا مجروحین طرابلس کے لیے چندہ جمع کرنا گورنمنٹ کے خلاف تو نہ ہوگا ؟" لیگ کے اعلان وفاداری پر حضرت مولانا نے اعتراض کیا تو مولانا محمد علی فرماتے ہیں کہ اعلان وفاداری کا بار بار دُہرایا جانا اسی طرح ضروری ہے جس طرح کلمہ طیبہ کا بار بار پڑھا جانا۔

لکھ رہے ہیں لیکن دیکھئے ابتدا کیسی ادیبانہ اور فلسفیانہ ہے :-

"یحیٰ برمکی نے صحرا میں ایک اعرابی کو دیکھا تھا کہ میدان سے
پتھروں کے ٹکڑوں کو جمع کرتا ہے اور جب ایک ڈھیر جمع ہو جاتا
ہے تو پھر ایک ایک ٹکڑے کو اٹھاتا ہے اور جہاں سے لایا تھا اسی
طرف پھینکنے لگتا ہے۔ کیا انسانی ہستی کی پوری تاریخ اس مثال
میں پوشیدہ نہ تھی۔ ہماری زندگیاں جن کے ہنگامۂ حیات سے
کارگاہ عالم میں شورش و کش مکش کے طوفان اٹھتے ہیں، غور کیجئے
تو امید کے ایک تار عنکبوت اور حسرت کے ایک جلتے ہوئے تنکے
سے زیادہ کیا ہستی رکھتی ہیں؟ ساری عمر دو ہی کاموں میں بسر
کر دیتے ہیں یا صحرائے دجلہ کے اعرابی کی طرح صبح تمنا میں امیدوں
کے سنگ ریزے جمع کرتے ہیں یا پھر شام نامرادی میں جہاں سے لائے
تھے وہیں پھینک دیتے ہیں کہ ہمیشہ کے لئے مدفون ہو جائیں ؎
مثال یہ میری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے"

بہار و خزاں کے ان انقلابات کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں :-

"یہ انقلابات قدرتی ہیں اور نہیں معلوم اس دنیا میں کتنے
دور قوموں اور ملکوں پر اسکے گزر چکے ہیں .... قدرت الٰہی کی
نیرنگیوں نے اکثر ایسا دکھلایا ہے کہ یاس و نا امیدی جب حد انتہا
کو پہنچ گئی ہے۔ تو اس کی زمین میں امید کی از سر نو تخم ریزی ہوئی
ہے .... دنیا میں مسلمان مایوسی کے لئے نہیں پیدا کئے گئے۔ وہ
صرف امید کے لئے ہیں اور جس دن اس کے لئے نہ ہوں۔ اس دن وہ مسلم
بھی نہیں۔ لا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین"۔

حکیم اجمل خاں، حسرت موہانی، ڈاکٹر ذاکر حسین سب ہی ان کی تحریروں سے متاثر ہوئے۔ پرانی اقدار بدلنے لگیں اور ہندوستانی مسلمانوں کے معتقدات میں ایک انقلاب عظیم رونما ہوگیا۔

صحافت اور ادب میں بڑا فرق ہے۔ ایک صحافی ہنگامی ضرورتوں عجلت اور تنگی وقت کی وجہ سے اس پر زیادہ محنت نہیں کرسکتا۔ لیکن مولانا آزاد کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے اس کی سرحدوں کو تخلیقی ادب سے ملا دیا ہے۔ الہلال اور البلاغ میں عمر خیام اور غالب پر بھی لکھا گیا ہے اور بلقان کی لڑائیوں پر بھی ـــــ زگلون کی بوقلمونی۔ فاطمہ بنت عبداللہ۔ محرم الحرام۔ سقوط ادرنہ۔ انقلاب طرابلس۔ ندوے اور علی گڑھ کی سرگرمیوں اور مسلم لیگ اور کانگریس کے جھگڑوں پر بھی خامہ فرسائی کی ہے لیکن ان کی انقلابی شدت ہر جگہ نمایاں ہے۔ ہر جگہ بیان کی قوت ابھارنے اور اسکے ذریعہ غلامی سے نجات حاصل کرنے پر زور ہے۔ مگر مولانا نے ان بحثوں کو اس طرح پھیلایا ہے کہ وہ حلقۂ شام وسحر سے نکل کر جاوداں ہوگئی ہیں۔ اور آج بھی ہمارے دلوں میں حرارت، اور ہمارے ذہنوں میں روشنی پیدا کرسکتی ہیں۔

ایک صدی پہلے شوپنہار نے لکھا تھا "اب زندگی قدم اٹھا کر نہیں چلتی، جست لگاتی ہے۔ اس کا اثر ادب پر یہ ہوا ہے کہ اس میں بلا کی سطحیت آگئی ہے۔" مولانا کے زمانے میں زندگی اس سے زیادہ رواں دواں تھی جس کا ذکر شوپنہار نے کیا ہے۔ ہر چند کہ ہندوستان میں اس کی رفتار اس وقت بھی یورپ کے مقابلہ میں بہت سست تھی لیکن الہلال کو دیکھئے اور اس کا مقابلہ اس کے پہلے کے اخبارات سے کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ صدیوں کا بند ٹوٹ گیا ہے اور یہ جادۂ صد سالہ ایک آہ آتشین سے طے ہوگیا ہے۔ لیکن ان ہنگامی ضرورتوں میں بھی ایک مقام ایسا نہیں جہاں انھوں نے ادب کے تقاضوں کو ملحوظ نہ رکھا ہو۔ سقوط ادرنہ پر مضمون

وہ تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کا نتیجہ متحدہ تحریکِ خلافت و سوراج ہے"

مصباح اور لسان الصدق سے وکیل تک مولانا کا یہ دور ذہنی اور ادبی نشو و نما کا دور ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا صدف ایک گوہر کی پرورش میں مصروف ہے۔ لیکن الہلال تک پہنچ کر یہ قطرہ موتی بن گیا ہے جس سے برابر نور کی لہریں نکلتی رہتی ہیں۔ مولانا نے یہ نور افشانی حکمت اور بصیرت کے ذریعہ کی ہے۔ ان کی زندگی میں نئے تقاضوں کا احترام اور مستقبل کی نبض شناسی موجود ہے۔ لیکن ان کی غیور طبیعت کو یہ ہرگز گوارا نہ تھا کہ حال کو "لا معاوضہ" ماضی کے قرض سے گراں بار کر دیا جائے اس لئے ان کا گوشۂ چشم ہمیشہ مستقبل کی طرف رہا۔ الہلال اور البلاغ کی تحریروں کو پڑھئے اور بعد کے واقعات پر غور کیجئے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ان کی نظر تاریکی کے کتنے پردوں کو نفوذ کر سکتی تھی۔ ۱۹۴۰ء میں انھوں نے لکھا تھا۔

> "میں اپنے ہم مذہبوں کو یاد دلاؤں گا کہ میں نے ۱۹۱۲ء میں جس جگہ سے انھیں مخاطب کیا تھا، آج بھی اسی جگہ کھڑا ہوں۔ .... اس تمام عرصہ میں ان سے کہتا رہا ہوں اور آج بھی ان سے کہتا ہوں کہ ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں کے لئے صرف وہی ایک راہ عمل ہو سکتی ہے جس کی میں نے ۱۹۱۲ء میں انھیں دعوت دی تھی"

مولانا کی یہ دعوت، غلبۂ حق کا یقین اور توحید کی قوت پر ایمان پیدا کرتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جو سر خدائے واحد کے سامنے جھکا۔ وہ پھر کسی کے آگے نہیں جھک سکتا۔ توحید سے مقصود ہے کہ خدا کو اس کی ذات اور صفات میں ایک ماننا۔ یعنی ڈرنے اور سامنے جھکنے کی سزاوار صرف خدا ہی کی عظمت و جبروت ہے

مولانا آزاد کے سامنے ایک مشن، ایک لائحہ عمل تھا اسی لئے ان کا دل ہمیشہ پُر امید رہا۔ ناکامی اور مصائب کے ہجوم میں بھی وہ امید کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ یہ ایمان و یقین ان کی زندگی کا جوہر ہے۔ اسی کی بدولت انھوں نے پرانی اصطلاحوں کو نئے معنی پہنائے اور تاریخ کی تخلیقی رو کو حسب منشا موڑ دیا۔

مولانا آزاد کی صحافت فرانس کی صحافت سے ملتی جلتی ہے۔ وہاں کے اخبارات میں خبریں ذیلی اور ضمنی حیثیت رکھتی ہیں۔ اصلی چیز اخبار کی ادبیت ہے اور خبروں سے زیادہ اہم ان پر تبصرے ہیں۔ امریکی اخبارات غیر شخصی ہوتے ہیں۔ ان کے اداریہ کی اہمیت بھی کم ہوتی جاتی ہے۔ ان کے پیچھے زبردست تنظیم ہوتی ہے۔ ان کو ایک ماہر نہیں، بہت سے ماہرین مل کر مرتب کرتے ہیں۔ اس کا سبب امریکہ کے یورپ سے مختلف حالات ہیں لیکن ہندوستان میں شخصی صحافت کا دور دورہ رہا ہے۔ دلگداز شرر کی وجہ سے مرقع عالم حکیم محمد علی کی وجہ سے اور نگار، نیاز فتحپوری کی وجہ سے مشہور ہوا۔ اسی طرح ہماری تاریخ صحافت میں ہمدرد اور مولانا محمدؐ علی یا ہمدم اور جالب دہلوی مترادف الفاظ رہے ہیں۔ یہی حال الہلال اور البلاغ کا ہے کہ ان کو مولانا کا کاغذی پیراہن سمجھنا چاہیئے۔ ان کے دوسرے مضمون نگار صرف کسب نور کرتے ہیں اور ان کی زیب وزینت کو اس طرح بڑھاتے ہیں جیسے چھوٹے چھوٹے ستارے چاند کی رونق کو۔

الہلال کا اسلوب نیا ہے، خیالات نئے ہیں۔ انداز فکر نیا ہے۔ اس نے سوتوں کو جگایا، بے عملوں کو عمل پر آمادہ کیا، مذہب اور اخلاق کے معاملہ میں عقل اور دماغ کے دروازے کھولے، ذہن کے جالوں کو صاف کیا اور ان طاقتوں کو نئے گلدستوں سے آراستہ کیا۔ الہلال نے مسلمانوں کی تعداد کی جگہ ایمان پر اعتماد کرنے کی تلقین کی اور بے خوف ہو کر ہندوؤں سے مل جانے کی دعوت دی۔ اس سے

ہماری آزادی کی جدوجہد بڑے نازک مرحلوں سے گزری ہے۔ اس میدان میں مقصود تک پہنچنے کے لئے پرامید ہونا اور سچا یقین رکھنا بڑا ضروری ہے۔ یہ خصوصیت مولانا کی ہر تحریر میں نظر آتی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

"صداقت کی مظلومی کوئی نیا واقعہ نہیں۔ اس پر ابتلا و آزمائش کے ایسے ایسے ہلاکت آفریں وقت آئے ہیں جب خدا کی زمین پر چند دلوں کے سوا اس کا کہیں نشیمن نہ تھا۔ لیکن باوجود اس کے سچ سچ رہا اور باطل باطل ۔"

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں :۔

"اگر آسمان کی تمام بجلیاں اتر آئیں۔ ہمالیہ کی چٹانیں اپنی صفیں کھڑی کر لیں تو وہ ایک منٹ کے لئے ایمان کو شکست نہیں دے سکتیں۔"

مولانا کی زندگی ایک مشن تھی اور الہلال ایک دعوت زندگی بسر کرنے کے لئے ایک اعلیٰ اور شورش انگیز مقصد کا ہونا ضروری ہے۔ حضرت مولانا نے اپنے مقصد اور محل کا انتخاب خوب سوچ سمجھ کر کیا تھا اور جب فیصلہ کر لیا تو اس پر سختی کے ساتھ جم گئے یہاں تک کہ پہاڑ ہل گئے لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔ ان کا مقصد بلند تھا اس لئے ان کی وفا کا درجہ بھی بلند تھا اور وفاداری بھی ایسی وفاداری جیسے قبلہ نما کی سوئی قبلہ کی سمت کرتی ہے ــــ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں الہلال، البلاغ اور دوسری تحریروں میں ایک ہی قسم کے خیالات کا اعادہ کیا گیا ہے لیکن ان کے لئے پیرایۂ بیان نئے سے نیا ڈھونڈا ہے۔

جب میں مولانا کی تحریروں کو پڑھتا ہوں تو مجھے بے اختیار ایک لطیفہ یاد آجاتا ہے۔ مشہور مصور DEGAS مصوری کے دوران میں سانٹ بھی تبدیلی ذائقہ کے طور پر لکھتا تھا۔ ایک روز کیا ہوا کہ اس کے ذہن میں اچھے خیالات کا تو ہجوم تھا لیکن وہ باوجود کوشش

اس کے سوا کوئی نہیں۔ اسی سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس سچائی کا مسلمان کو علم و یقین دیا گیا ہے وہ ہمیشہ اس کا اعلان کرتا رہے۔ اس لئے کہ وہ خدا کی زمین میں شاہد ہے اور کتمان شہادت سب سے بڑا جرم ہے۔ مولانا نے توحید ہی کے اصول کو سامنے رکھ کر ہندو مسلم اتحاد پر بھی زور دیا اور کہا کہ ایک خدا کے سامنے جھکنے والے سب ایک ہی آستانہ کے غلام ہیں۔ اس لئے کہ خدا رب العالمین ہے، رب المسلمین نہیں۔

ان خیالات کو سیاسی محاورے میں تحویل کرکے فرماتے ہیں:۔

"میں یقیناً یہ کہتا رہا ہوں کہ ہمارے فرض کے سامنے دو ہی راہیں ہیں۔ برطانوی گورنمنٹ ناانصافی اور حق تلفی سے باز آجائے۔ اگر باز نہیں آسکتی تو مٹا دی جائے۔ یہ تو انسانی عقائد کی اتنی پرانی سچائی ہے کہ صرف پہاڑ اور سمندر ہی اس کے ہم عمر کہے جا سکتے ہیں۔ جو چیز بری ہے اسے یا تو درست ہو جانا چاہیئے یا مٹ جانا چاہیئے۔ تیسری بات کیا ہو سکتی ہے؟"

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "میرا یہ اعتقاد اس لئے ہے کہ میں ہندوستانی ہوں۔ اس لئے ہے کہ میں مسلمان ہوں۔ اس لئے ہے کہ میں انسان ہوں"

ہندو مسلم اتحاد کے متعلق لکھتے ہیں: "آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں میں سے اتر آئے اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑا ہو کر یہ اعلان کرے کہ سوراج تین گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے تو میں سوراج سے دست بردار ہو جاؤں گا مگر اس سے دست بردار نہ ہوں گا۔ کیوں کہ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے"

ہے۔ بعض جگہ بوجھل۔ ثقیل۔ عربی آیتوں اور فارسی اشعار سے گراں بار، لیکن اس قسم کی رائے ظاہر کرتے وقت ہمیں الہلال اور البلاغ کی دعوت، حالات کے تقاضوں اور اور اس کے مخاطبوں کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ مولانا کے علم و فضل، ان کی افتاد طبیعت اور اس آب و ہوا کی بھی جس میں یہ پرچے شائع ہوئے تھے۔ ان کا انداز تحریر ایک نہر ہے جو الفاظ کی جھاڑیوں اور کلاسکی تلمیحات و قوافی کی پہاڑیوں سے گزرتی ہے لیکن ہے وہ نہر رواں سراب نہیں ہے۔ اس میں ایسی خطیبانہ بلند آہنگی ہے جو عربوں کی یاد دلاتی ہے۔ ایسا خلوص اور سوز ہے جو دل کے زخموں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ایسا طنز ہے جو ان کے مذاق سلیم اور خوش طبعی کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے۔ ان کی تحریروں میں ایک ڈرامائی انداز ہے جس میں لفظ اور خیال متحد ہوکر ایکٹر بن جاتے ہیں اور وہ اپنے صوتی اثر اور اپنی مصورانہ خوبیوں کی وجہ سے چشم و گوش دونوں کو متاثر کرتے ہیں۔

مولانا کے یہاں جو مرصع کاری، مترادفات کی کثرت، کرسی نشینی الفاظ، استخواں بندی تراکیب، ابداع سخن اور اختراع معانی ہے اس کا اہتمام کبھی بھی اردو صحافت میں اس سے پہلے اور اس پیمانہ پر نہیں ہوا تھا۔ پھر یہ لفظی گل کاری محض نمود و نمائش کے لئے نہیں تھی، اس کے ساتھ ایک مقصد وابستہ تھا۔ ایک تحریک وابستہ تھی۔ سرسید اور حالی کے زمانے میں ہمارے ادب کی کشتی، دریا کی پُر سکون موجوں پہ بہہ رہی تھی۔ الہلال اور البلاغ میں وہ دفعتاً سمندر کے تھپیڑوں سے دوچار ہوگئی ہے۔ ہر چیز بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ زمین نئی ہے۔ آسمان نیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پُرانا شہر کھود کر پھینک دیا گیا ہے اور نیا بسایا گیا ہے جس کے باشندے بھی نئے ہیں، ان کا انداز فکر بھی نیا ہے، استدلال بھی اور ہے اور ان کی بولی بھی کچھ نئی نئی ہے۔ مولانا آزاد نے آئینہ خانہ میں زنگیناں قید نہیں کیں، اپنے اسلوب سے قومی کام لیا ہے اور آزادی کی تحریک کو مہمیز کیا ہے۔ ہم ان کے جملے اشعار کی طرح بار بار پڑھتے ہیں۔ اور اُن سے لطف اندوز ہوتے

کے ایک مصرع بھی موزوں نہ کر سکا۔ وہ بھاگا ہوا اپنے دوست ملارمے کے پاس گیا اور کہا "عجیب معاملہ ہے دماغ میں خیالات کا ہجوم ہے لیکن شعر نہیں ہو رہا ہے" ملارمے نے کہا "دوست شعر خیالات کی مدد سے نہیں، الفاظ کی مدد سے کہے جاتے ہیں"

مولانا نے نثر میں شاعری کی ہے لیکن الفاظ کی مدد سے۔ وہ لفظوں کی جوہری انفرادیت کو پہچانتے تھے اور جو لفظ جہاں سجتا تھا اسے وہیں کھپاتے تھے۔ ان کی ابتدائی نثر میں اس دور کی سیاست کے تمام تیور موجود ہیں۔ فقروں میں مسلح اور خوش ترتیب فوج کا سا جلال اور شکوہ ہے۔ الفاظ میں نقارہ و دھل کا شور اور ہنگامہ ہے۔ جملوں میں آتش خانوں کی سی گرمی ہے جس نے مصلحتوں کی برف کو پگھلا دیا اور محاربی فطرت میں آگ سی لگا دی۔ لیکن یہ شاندار اور پرشکوہ نثر الہلال اور البلاغ تک رہی۔ غبار خاطر اور کاروان خیال کا اسلوب دوسرے موثرات خارجی کا نتیجہ ہے اور وہ ارتقا کی منزلوں سے گزرا ہے۔ اسی لئے اس میں ادب اور لطافت کی جو گلکاریاں ہیں وہ سب سے الگ ہیں۔ ترجمان القرآن کے مقدمہ میں جو سادگی اور پرکاری ہے اس کا اردو ادب میں جواب نہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوثر و سلسبیل کی موجیں ہیں جو بہہ نکلی ہیں۔

الہلال کے متعلق مولانا محمد علی نے لکھا ہے کہ اس نے اردو صحافت میں ایک نئی روایت قائم کی۔ اس کے خریداروں کی تعداد بہت جلد گیارہ ہزار تک پہنچ گئی۔ اردو میں یہ تعداد معمولی نہیں ہے بالخصوص جب کہ اس کا چندہ بارہ روپے تھا۔ ایسے حلقے قائم کئے گئے جہاں ایک پرچہ آتا تھا لیکن دس بیس آدمی اسے لفظاً لفظاً اور سبقاً سبقاً پڑھتے تھے میرے ایک عزیز علحدہ کمرے میں لیکن سب بچوں کو بٹھا کر اس کو دست افشاں اور پاکوباں پڑھتے تھے۔ اور پڑھنے کے بعد پرچہ بکس میں بند کر دیتے تھے —!

حکومت اس آتش نوائی کی بہت دیر تک متحمل نہیں ہو سکتی تھی چنانچہ اسے بند کرنا پڑا لیکن ۱۹۱۵ء میں مولانا نے البلاغ نکالا۔ دونوں کا انداز و اسلوب ایک ہی جیسا

نذرِ آزاد

جناب جسٹس جیالال کلم صاحب جج جموں و کشمیر ہائی کورٹ

مجھے از حد مسرت ہے کہ مولانا آزاد کی یاد منانے کے لئے آج جو جلسہ ہو رہا ہے اُس کی صدارت کے فرائض انجام دینے کے لئے مجھے مدعو کیا گیا ہے۔ لیکن جب میں ان فضلا و ادبا کو جو اس وقت میرے سامنے بیٹھے ہیں دیکھتا ہوں تو میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ اگر میری جگہ پر کسی اور صاحب کا نام تجویز کیا گیا ہوتا تو کہیں بہتر تھا۔ بہر حال جب مجھے یہ عزت بخش ہی دی گئی ہے تو ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنی عقیدت کا اظہار کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

مولانا آزاد ایک ایسی شخصیت کے مالک تھے جس کے کارنامے صدیوں تک فراموش نہیں ہو نگے بلکہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائیگا اُن کے گوناگوں صفات زیادہ سے زیادہ واضح اور روشن ہوتے جائیں گے۔ مولانا آزاد نے جب ہوش سنبھالا تو انگریزی سامراج اپنے شباب پر تھا۔ ہندستان تو پہلے ہی سے غلام تھا، ایشیا کے بعض اور ممالک بھی برطانیہ اور دوسری مغربی طاقتوں کے زیر اقتدار آ گئے تھے۔ دوسری طرف اسلامی ممالک پر بھی مغربی طاقتیں حریصانہ نگاہیں ڈال رہی تھیں۔ مولانا آزاد نے یہ سب کچھ دیکھا اور سمجھا۔ ان کی دور رس نگاہوں سے یہ امر پوشیدہ نہ رہ سکا کہ اگر ایشیا اور اسلامی ممالک یورپین ملکوں کے دست نگر بن گئے تو صدیوں تک اُن کی غلامی سے نجات حاصل نہ کر سکیں گے۔ چنانچہ مولانا پریس اور پلیٹ فارم کے ذریعہ اپنے انقلابی خیالات کے پروپگنڈے میں مصروف ہو گئے۔ انگریزی حکومت مولانا کی ان سرگرمیوں کو بڑے خطرے کی نگاہ سے دیکھتی تھی اس لئے انھیں کئی مرتبہ قید و بند کی مصیبتیں جھیلنا پڑیں لیکن مولانا کے پائے استقامت میں لغزش نہ آنے پائی اور بیسویں صدی کے اوائل سے وہ قوم پرور مسلمانوں کی قیادت کا فرض پچاس سال تک انجام دیتے رہے۔ مسلم لیگ نے جب ہندستان کی تقسیم کا نعرہ لگایا تو مولانا نے

ہیں۔ ان کی انفرادیت اور شخصیت ہر جملہ میں جلوہ نشیں ہے۔ وہ ایک خوشبو ہے جو تحریر کے گلہائے رنگ رنگ میں بسی ہوئی ہے۔ ندرتِ ادا کی اس شیشہ گری کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ آرٹ ہی نہیں وہ صحافت بھی ناقص ہے جس میں کوئی طرز اور اسلوب نہیں۔

الہلال اور البلاغ نے کیا خدمت انجام دی، اس بحث کو میں مخدومی ڈاکٹر سید عابد حسین کے ایک اقتباس پر ختم کرنا چاہتا ہوں:۔

"اس صدی کے شروع میں ہندوستان کے مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگانے اور ان کے مردہ دلوں میں زندگی کی روح پھونکنے کے لئے تین آوازیں بلند ہوئیں۔ ایک اقبال کی بانگ درا۔ ایک محمد علی کا نعرۂ تکبیر۔ ایک ابو الکلام کا رجز حرّیت ــ ممکن ہے لفظوں کے پرستاروں کو ان تینوں کے پیغاموں میں فرق معلوم ہوتا ہو مگر معنی کے محرم، تینوں کی زبان سے ایک ہی بات سنتے اور اس کا ایک ہی مطلب سمجھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ دین کی کنجی سے دنیا کا دروازہ کھولو، اسلام کے اسم اعظم سے آفاق کو تسخیر کرو ـــ اُن کا یہ خطاب پہلے مسلمانوں سے پھر ہندوستانیوں سے اور آخیر میں سب انسانوں سے ہے۔"

ابوالکلام آزاد کے مکاتیب

ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی

بیسویں صدی کی اہم ادبی شخصیتوں میں مولانا ابوالکلام آزاد پر کچھ لکھنا جتنا آسان ہے اتنا ہی دشوار بھی۔ آسان ان معنوں میں کہ ان کی شخصیت ایک ایسے دیوتا کے مانند ہے جس کے بُت کے سائے میں رقص کرکے پوری عمر گزاری جاسکتی ہے اور دشوار اس طرح کہ ان کے ادبی کارناموں کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لئے جب ہم ادب کے مروجہ اصولوں کو سامنے رکھتے ہیں یا اس کسوٹی کو استعمال کرتے ہیں جس پر عام ادیبوں کا کھرا کھوٹا پرکھا جاسکتا ہے تو قدم قدم پر یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ یا تو ہم ان کارناموں کے ساتھ پورا انصاف نہیں کررہے ہیں یا وہ کسوٹی جھوٹی ہے جس کی صداقت پر اب تک ہمارا ایمان تھا۔ آزاد ہمارے ان نثر نگاروں میں ہیں جن کے ابتدائی کارناموں پر ہمارے بڑے بڑے انشا پرداز سربسجود ہوگئے تھے۔ مہدی افادی نے ایک نجی خط میں لکھا تھا کہ "اپنی زندگی میں اگر مجھے کسی پر رشک آتا ہے تو مہ جبین رانچی پر" اور سجاد انصاری نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ "اگر قرآن اردو زبان میں اُترتا تو ابوالکلام کی نثر میں اُترتا"۔ دوسری طرف تنقید کے نام سے رام بابو سکسینہ اور مولوی عبدالحق سے لیکر شیخ محمد اکرام اور حسن عسکری تک نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اُردو میں مصنوعی اور کتابی زبان کو رواج دینے میں مولانا کا بڑا ہاتھ ہے اور انھوں نے اپنے طرز تحریر سے اُردو نثر کو اس عہد سے بھی پیچھے ڈھکیل دیا ہے جہاں وہ سرسید سے پہلے تھی۔ اُردو کے بعض تنقید نگاروں نے مولانا کے الہلال اور البلاغ کے مضامین کی مقبولیت کا راز

اسکی شدید ترین مخالفت کی۔ وہ ہندستان کی تقسیم، ہندستان اور مسلمان دونوں کے لئے خطرناک سمجھتے تھے۔ اپنے ان خیالات کی تبلیغ کے لئے انھوں نے بڑی قربانیاں کیں اور اُن کی یہ قربانیاں قیامت تک یاد رکھی جائیں گی۔ ایک طرف اُن کی انگریز دشمنی تھی اور دوسری طرف اپنے ہم مذہبوں کی ایک کثیر جماعت کی مخالفت۔ وہ ہر طرف سے بُرے بن رہے تھے لیکن کوئی چیز بھی انھیں راہ راست سے نہ ہٹا سکی۔ مولانا کا علم و فضل، اُن کی حب الوطنی اور اُن کی مستقل مزاجی نے دراصل انھیں ایک حیات ابدی بخش دی ہے اور ہم اور ہماری آنے والی نسلیں ہمیشہ ان کا ذکر عقیدت اور احترام سے کریں گی۔ سمینار بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور مجھے امید ہے کہ اس کے ذریعہ مولانا کی زندگی کے بعض پہلوؤں پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے گی۔

بے کیف بنا دیا تھا۔ ابوالکلام اور اقبال جس بحرانی دور کے ادیب اور خطیب تھے اس میں ٹھنڈی اور معقول نثرنگاری کے لئے کوئی گنجایش نہ تھی۔ یہ زمانہ شدید ہیجانات کا زمانہ تھا۔ اس پرخروش زمانے میں حالی کی نثر کی وہی حیثیت رہ گئی تھی جو میدانِ جنگ میں بھیرویں الاپنے والے کی ہو سکتی ہے۔ اس پر آشوب فضا میں نے نوازی کیا کام دے سکتی تھی۔ بگل باجے اور طنبورہ ہی کام دے سکتے تھے "

وہی ڈاکٹر سید عبداللہ جب غبارِ خاطر پر اظہارِ خیال کرتے ہیں تو اس طرح کہ :-

"غبارِ خاطر مولانا ابوالکلام کی تصانیف میں اول درجے کی تصنیف نہیں۔ ان کے بلند پایہ ادبی کارناموں میں غبارِ خاطر ہی ایک ایسی کتاب ہے جو ابوالکلام کی اصلی نثر سے بہت دور ہے۔ اس میں ابوالکلام کی تصویر بہت مدھم اور دھیمی ہے۔ اس میں ابوالکلام کا قلم بیمار اور ضعیف معلوم ہوتا ہے۔ غبارِ خاطر ایک لحاظ سے بیکاری کا مشغلہ ہے، اس میں خیال نے فرضی مکتوب الیہ کے نام فرضی خط لکھوائے ہیں۔ اسکی اکثر بحثیں فرضی ہیں۔ البتہ فارسی اشعار کا انتخاب بہترین ہے جس پر ابوالکلامی ذوق کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ غبارِ خاطر جوان سال ابوالکلام کی تصنیف نہیں کہن سال ابوالکلام کی تصنیف ہے۔ بمبئی میں ایک مرتبہ کانگرس نے جب امتناعِ مسکرات کی مہم جاری کی تو بہت سے مے فروشوں نے شربت سوڈا واٹر کا کام شروع کر دیا تھا۔ غبارِ خاطر میں بھی ابوالکلام کی عظمت اسی طرح گھٹی ہوئی ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ غبارِ خاطر میں وہ خصوصیات موجود نہیں جس کے سبب ابوالکلام ابوالکلام بنے تھے۔

ان کی جذباتیت اور پرجوش بلند آہنگ صحافت نگاری بتایا ہے۔ تذکرہ کے متعلق یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ اس کی صنف ادبی متعین نہیں کی جا سکتی۔ اس میں ایک طرح کی بے قیدی اور بے قاعدگی ہے۔ کہنے کو یہ تذکرہ ہے لیکن یہ ایک طرح کی تاریخ ہے جس کا اسلوب مورخانہ نہیں بلکہ خطیبانہ ہے۔ غبار خاطر کو جسے مولانا کا آخری ادبی کارنامہ کہا جا سکتا ہے جہاں سینے سے لگایا گیا ہے وہاں اس کی قدر و قیمت کو اردو تنقید نے مشتبہ نظروں سے بھی دیکھا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ جو مولانا کی علمیت اور ان کی ادبی عظمت کے بہت قائل ہیں اور جو ان کے طرز نگارش کے جواز میں یہ لکھتے ہیں کہ

"طرز اظہار ادیب کے شخصی جھکاؤ اور طبعی تقاضوں کے تابع ہے۔ اس کے لئے شخصیتوں کا انفرادی رنگ اور زمانے کی خاص روح فیصلہ کن عنصر ہے۔ کوئی شخص بڑا ادیب یا چھوٹا ادیب محض اس لئے نہیں سمجھا جا سکتا کہ وہ مشکل نگار یا سہل نگار ہے۔ اگر یہ صحیح ہو تو ہم غالب اور اقبال دونوں کو ان کی مشکل نگاری کے سبب بلند پایہ شاعروں کی صف میں کبھی جگہ نہیں دے سکیں گے۔ ادب کے ارتقائی سفر میں میر، غالب، حالی اور اقبال سب ہی ایک رتبۂ خاص کے مالک ہیں۔ جانچنے کا معیار سادگی یا سلاست نہ ہوگا بلکہ وہ صداقت اور وہ سچائی ہوگی جس کے زیر اثر کوئی شخص بے ساختہ طور پر اپنے لئے کوئی طرز اظہار اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ابوالکلام کی نثر پر اعتراض کی بہت کم گنجایش ہے۔ اُن کی نثر عصری تقاضوں کی پیداوار ہے۔ اس کو سر سید اور حالی کے بے رنگ اسلوب کے خلاف رد عمل سمجھنا چاہیئے خصوصاً حالی کے انداز بیان کے خلاف جس کی خنکی اور خشکی نے نثر کو کاروباری نثر کی حد تک

دیکھا جائے تو غبار خاطر کو ہم سب سے زیادہ اہمیت دے سکتے ہیں اس لئے کہ جہاں ان کے دوسرے کارنامے تصنیف کی حیثیت رکھتے ہیں وہاں غبار خاطر کے لئے ہم "تخلیق" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ جس منزل میں یہ نثر لکھی گئی ہے وہاں ابوالکلام کا علم ان کے خون میں حل ہو چکا ہے اور ان کی زندگی کے بعض اہم تجربات جو مختلف ادوار میں متفرق اور منتشر تھے یکجا ہو کر ان کی شخصیت کی تکمیل کرتے ہیں۔ غبار خاطر کا ابوالکلام محض پیغامبر خطیب یا داعئ حق نہیں ہے۔ اس کی شخصیت کا شاعر، فلسفی، مصور اور مغنی بیدار ہو کر ایک اکائی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ غبار خاطر ایک ایسا پردہ ہے جس پر ابوالکلام کی روح پورے طور پر جلوہ گر ہوئی ہے اسی لئے اسے محض خطوں کا مجموعہ سمجھ کر پڑھنا بھی زیادہ صحیح نہیں ہے۔ خط یہاں محض ایک "پردہ" ہے۔ جس طرح "مکالمات افلاطون" پڑھتے وقت ہم مکالمہ کے وہ معنی نہیں لیتے جو ڈرامہ میں لیتے ہیں اسی طرح غبار خاطر میں ہم مکتوب نگاری کے عام اسلوب یا معیار کو نظر انداز کر دینے پر مجبور ہیں۔ یہاں "ورائے شاعری چیزے دگر ہست" والی بات ہے۔

غبار خاطر پڑھنے کے بعد فنکار کی حیثیت سے ابوالکلام کی جو تصویر ہمارے سامنے آتی ہے اس میں وہ جوش، ولولہ اور قوت حیات نہیں ہے جو خطیب یا صحافی ابوالکلام میں ہے۔ ابوالکلام کی یہ نثری شاعری ان کے اندرونی تصادم کی پیداوار ہے۔ غالب نے جو اپنے بارے میں کہا تھا کہ

نے گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز ۔۔۔ میں ہوں اپنی شکست کی آواز

ابوالکلام کے غبار خاطر میں بھی "گل نغمہ" اور "پردۂ ساز" محض طلسم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی تہ میں ان کی "انا" کا سوز و کرب اور ان کی گھائل شخصیت کی پکار ہے۔ شخصیت کی یہ "انا" اپنے اظہار کے لئے جو بیتابی رکھتی ہے اس کے متعلق خود مولانا لکھتے ہیں۔

"ہماری درماندگیوں کا عجب حال ہے۔ ہم اپنے ذہنی آثار کو ہر چیز

ایک تو اس میں ع آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش یہ بڑا عمل ہے جو ابو الکلام کی اصل فطرت کے خلاف ہے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ غبار خاطر میں ابو الکلام کی وہ علمی شان بہت کم نمودار ہوئی ہے جس کے طفیل وہ عزت اور عظمت کے مستحق بنے تھے اور سچ یہ ہے کہ غبار خاطر اس داعیۂ عظیم اور جذبۂ شدید سے بھی خالی ہے جس کے شعلے الہلال میں مشتعل ہو کر اقصائے ہند میں آگ لگا چکے تھے۔ اردو ادب میں ابو الکلام کا امتیاز خاص ان کی بارعب اور پر جلال نثر ہے جس کی اصل روح قوت اور توانائی، سخت کوشی اور دشوار پسندی میں مضمر ہے۔ غبار خاطر ایک جوئے نغمہ خواں ہے جو حیات کے ضعف اور ولولہ ہائے زندگی کی غنودگی کی ترجمانی کر رہی ہے۔ اس میں صد ہزار نوائے جگر خراش کا سماں پایا نہیں جاتا۔"

ڈاکٹر عبد اللہ سے یہاں غبار خاطر کے پرکھنے میں وہی چوک ہوئی ہے جو دوسرے تنقید نگاروں سے مولانا آزاد کے عام ادبی کارناموں اور ان کے طرز نگارش کی روح کو سمجھنے میں۔ ڈاکٹر عبد اللہ ابو الکلام کی نثر کو عصری ماحول کی پیداوار سمجھتے ہیں اور اُسے اردو نثر کی ارتقا کی ایک کڑی سے تعبیر کرتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ وہ اس باب میں ادب اور زندگی کے تعلق اور اس کی جدلیاتی ماہیت کو سمجھتے ہیں لیکن غبار خاطر پر تنقید کرتے وقت وہ یہ فراموش کر جاتے ہیں کہ جس طرح عصری ماحول کوئی جامد شے نہیں ہے اسی طرح ادیب کی شخصیت بھی ارتقا پذیر ہوتی ہے۔ جس طرح غالب کے فن نے طرز بیدل سے لے کر سہل ممتنع تک فن کی ارتقائی منزلیں طے کیں اسی طرح ابو الکلام کی ادبی شخصیت لسان الصدق اور الوکیل سے لے کر الہلال و البلاغ، تذکرہ و ترجمان القرآن سے ہوتی ہوئی غبار خاطر تک ارتقائی منزلیں طے کرتی ہے۔ ادبی اور فنی حیثیت سے

"طبیعت کی اس افتاد نے بڑا کام یہ دیا کہ زمانے کے بہت سے حربے میرے لئے بے کار ہو گئے۔ لوگ اگر میری طرف سے رخ پھیر لیتے ہیں تو بجائے اس کے کہ دل گلہ مند ہو اور منت گزار ہونے لگتا ہے کیونکہ جو ہجوم لوگوں کو خوش کرتا ہے میرے لئے بسا اوقات ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ میں اگر عوام کا رجوع و ہجوم گوارا کرتا ہوں تو یہ میرے اختیار کی پسند نہیں ہوتی۔ اضطرار و تکلیف کی مجبوری ہوتی ہے۔ میں نے سیاسی زندگی کے ہنگاموں کو نہیں ڈھونڈا تھا سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے مجھے ڈھونڈھ نکالا۔ میرا معاملہ سیاسی زندگی کے ساتھ وہ ہوا جو غالب کا شاعری کے ساتھ ہوا تھا ؎

شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما ۔۔۔ ما بود یم بدیں مرتبہ راضی غالب

جب کبھی میں قید خانے میں سن کرتا ہوں کہ فلاں قیدی کو قید تنہائی کی سزا دی گئی تو حیران رہ جاتا ہوں کہ تنہائی آدمی کے لئے سزا کیسے ہو سکتی ہے۔ اگر دنیا بھی اسی کو سزا سمجھتی ہے تو کاش ایسی سزائیں عمر بھر کے لئے حاصل کی جا سکیں "

مولانا کی اس افتاد طبع کے بارے میں دوسروں کا جو ردعمل ہو سکتا ہے اس کا احساس بھی انھیں ہے۔ لکھتے ہیں :-

"اس افتاد طبع کے ہاتھوں ہمیشہ طرح طرح کی بدگمانیوں کا مورد رہتا ہوں اور لوگوں کو حقیقت حال سمجھا نہیں سکتا۔ لوگ اس حالت کو غرور اور پندار پر محمول کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ میں دوسروں کو حقیر تصور کرتا ہوں اس لئے ان کی طرف بڑھتا نہیں حالانکہ مجھے خود اپنا ہی بوجھ اٹھنے نہیں دیتا "

سے بچا سکتے ہیں مگر خود اپنے آپ سے نہیں بچا سکتے۔ ہم کتنا ہی ضمیر غائب اور مخاطب کے پردوں میں چھپ کر چلیں لیکن ضمیر متکلم کی پرچھائیں پڑتی ہی رہے گی۔ ہم جہاں جاتے ہیں ہمارا سایہ ہمارے ساتھ جاتا ہے"

یہ "انا" جب خارجی زندگی کے جھگڑوں میں اپنے آپ کو نہیں رکھ سکتی تو پھر اپنے اندر ایک دنیا آباد کر لیتی ہے۔ لکھتے ہیں۔

"زندگی کی مشغولیتوں کا وہ تمام سامان جو اپنے وجود کے باہر تھا اگر چھن گیا ہے تو کیا مضائقہ؟ وہ تمام سامان جو اپنے اندر تھا اور جسے کوئی چھین نہیں سکتا سینے میں چھپائے ساتھ لایا ہوں۔ اُسے سجاتا ہوں اور اس کے سیر و نظارہ میں محو رہتا ہوں۔

باہر کے سارے ساز و سامان عشرت مجھ سے چھن جائیں لیکن جب تک یہ میکدۂ خلوت نہیں چھنتا میرے عیش و طرب کی سرمستیاں کون چھین سکتا ہے"

یہ خلوت پسندی آہستہ آہستہ مولانا کی افتادِ طبع بن جاتی ہے۔

"ابتدا ہی سے طبیعت کی افتاد کچھ ایسی واقع ہوئی تھی کہ خلوت کا خواہاں اور جلوت سے گریزاں رہتا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ زندگی کی مشغولیتوں کے تقاضے اس طبع وحشت سرشت کے ساتھ نبھائے نہیں جا سکتے اسلئے بہ تکلف خود کو انجمن آرائیوں کا خوگر بنانا پڑتا ہے مگر دل کی طلب ہمیشہ بہانے ڈھونڈتی رہتی ہے۔ جوں ہی ضرورت کے تقاضوں سے مہلت ملی وہ اپنی کام جوئیوں میں لگ گئی"

خلوت اور انجمن کی اس کشمکش میں مولانا کا یہ نقطۂ نظر سیاسی یا قومی زاویے سے جیسا بھی ہو لیکن اُن کے آرٹ کو سمجھنے کے لئے بہت کارآمد ہے۔ لکھتے ہیں:-

یہ وہی حالت ہوئی جسے مرزا غالب نے ذوق خامہ فرسائی ستم زدگی سے تعبیر کیا تھا۔"

ایک خط کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے :-

"صدیق مکرم۔ وہی چار بجے صبح کا جانفزا وقت ہے۔ چائے کا فنجان سامنے دھرا ہے اور طبیعت دراز نفسی کے لئے بہانے ڈھونڈھ رہی ہے۔ جانتا ہوں کہ میری صدائیں آپ تک نہیں پہنچ سکیں گی۔ تاہم طبع نالہ سنج کو کیا کروں کہ فریاد و شیون کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ آپ سن رہے ہوں یا نہ سن رہے ہوں میرے ذوق مخاطبت کے لئے یہ خیال بس کرتا ہے کہ روئے سخن آپ کی طرف ہے۔ ع

اگر نہ دیدی تپیدن دل   شنیدنی بود نالۂ ما

بانسری اندر سے خالی ہوتی ہے مگر فریادوں سے بھری ہوتی ہے۔ یہی حال میرا ہے۔"

مولانا کے تخلیقی عمل میں ان تجربات و کیفیات کو بھی دخل ہے جو تحت الشعور میں دبے ہوئے بعض خزانوں کے یکایک کھل جانے سے ذہن میں طاری ہو جاتی ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"معلوم نہیں ایک خاص طرح کے ذہنی واردہ کی حالت کا آپ کو تجربہ ہوا ہے یا نہیں ؟ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بات برسوں تک حافظہ میں تازہ نہیں ہوتی گویا کسی کونے میں سو رہی ہے۔ پھر کسی وقت اچانک اس طرح جاگ اٹھے گی جیسے اسی وقت دماغ نے کواڑ کھول کر اندر لے لیا ہو۔"

ان خوابیدہ کیفیتوں کو بیدار کرنے کے لئے مولانا نے چائے کا سہارا لیا ہے اور چائے کی لطافت و نزاکت سے اپنے شعری عمل میں مولانا نے جو کام لئے ہیں اس کے سامنے خمریاتی شاعری کے بڑے بڑے امام بھی ہیچ معلوم ہوتے ہیں۔

اپنی شخصیت کا یہ بوجھ ہی مولانا کی مکتوب نگاری کا اصل محرک ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اپنے ایک مضمون میں شاعری کے تخلیقی مراحل کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ شاعر کو شعر در اصل شخصیت کے اسی بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے کہنا پڑتا ہے۔ وہ جب تک اپنے اندر کی کیفیات کو کسی پیمانے میں ڈھال نہیں لیتا یہ کیفیات اس پر آسیب کی طرح سوار رہتی ہیں۔ وہ کہتا ہے جب مسلسل کرب سے گزرنے کے بعد میری کوئی نظم مکمل ہو جاتی ہے تو میں اس سے کہتا ہوں کہ اب تم جا کر کسی بیاض میں آرام کرو تاکہ میں چین کی نیند سو جاؤں۔ غبارِ خاطر کے مکاتیب در اصل اسی طرح کا پیمانہ ہیں۔ یہ مکاتیب مکتوب الیہ کے لئے نہیں لکھے گئے ہیں بلکہ اول اول اپنے لئے لکھے گئے ہیں اور تخلیقی سانچے میں ڈھل جانے کے بعد اس کا مکتوب الیہ یا مخاطب ہر وہ شخص ہے جس کے لئے ادب و آرٹ میں دلکشی ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"یقین کیجئے آج کل بعینہ ایسا ہی حال اپنے سینے کا بھی محسوس کر رہا ہوں۔ غبارے کی طرح اس میں بھی کوئی پر جوش عنصر بھر گیا ہے اور نکلنے کے لئے بیتاب ہے۔"

ایک خط اس طرح شروع ہوتا ہے :۔

"رات کا پچھلا حصہ شروع ہو رہا ہے۔ دس بجے حسب معمول بستر پر لیٹ گیا تھا لیکن آنکھیں نیند سے آشنا نہیں ہوئیں۔ ناچار اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں آیا، روشنی کی اور اپنے اشغال میں ڈوب گیا۔ پھر خیال ہوا قلم اٹھاؤں اور کچھ دیر آپ سے باتیں کرکے جی کا بوجھ ہلکا کروں۔"

ایک خط کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتے ہیں :۔

"یہ بھی نہیں معلوم بحالت موجودہ میری صدائیں آپ تک پہنچ بھی سکیں گی یا نہیں، تاہم کیا کروں افسانہ سرائی سے اپنے آپ کو باز نہیں رکھ سکتا۔

دو مشغلوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ دونوں مشغلے مولانا کی شخصیت کا سمبل ہیں۔

"میں آپ کو بتلاؤں، میرے تخیل میں عیش زندگی کا سب سے بہتر تصور کیا ہو سکتا ہے؟ جاڑے کا موسم ہو اور جاڑا بھی قریب قریب درجۂ انجماد کا۔ رات کا وقت ہو۔ آتشدان میں اونچے اونچے شعلے بھڑک رہے ہوں اور میں کمرے کی ساری مسندیں چھوڑ اس کے قریب بیٹھا ہوں اور پڑھنے لکھنے میں مشغول ہوں۔

"عجیب معاملہ ہے۔ میں نے بارہا غور کیا کہ میرے تصور میں آتشدان کی موجودگی کو اتنی اہمیت کیوں مل گئی ہے؟ لیکن کچھ نہیں بتلا سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ سردی اور آتشدان کا رشتہ چولی دامن کا رشتہ ہوا۔ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ میں سردی کے موسم کا نقشہ اپنے ذہن میں کھینچ ہی نہیں سکتا اگر آتشدان نہ سلگ رہا ہو۔ پھر آتشدان بھی وہی پرانی روش کا ہونا چاہیئے جس میں لکڑیوں کے بڑے بڑے کندے جلائے جا سکیں۔ بجلی کے ہیٹر سے میری تسکین نہیں ہوتی بلکہ اسے دیکھکر طبیعت چڑ سی جاتی ہے۔ ہاں گیس کے آتشدان کی ترکیب اتنی بے معنی محسوس نہیں ہوتی کیونکہ پتھر کے ٹکڑے رکھکر انگاروں کے ڈھیر کی سی شکل بنا دیتے ہیں اور اس کے نیچے سے شعلے نکلتے رہتے ہیں۔ کم از کم شعلوں کی نوعیت باقی رہتی ہے۔ پھر بھی میں اسے ترجیح دینے کے لئے تیار نہیں۔ در اصل میں صرف گرمی ہی کے لئے آتشدان کا شیدائی نہیں ہوں۔ مجھے شعلوں کا منظر چاہیئے۔ جب تک شعلے بھڑکتے نظر نہ آئیں دل کی پیاس بجھتی نہیں۔ بے دردوں کو جو دل کی جگہ برف کی سل سینے میں چھپائے پھرتے ہیں ان معاملات کی کیا خبر؟"

میرے جغرافیہ میں اگر چین کا ذکر کیا گیا ہے تو اس لئے نہیں کہ جنرل چیانگ کائی شک اور مادام چیانگ کائی شک وہاں سے آئے تھے بلکہ اس لئے کہ چائے وہیں سے آتی ہے۔

مے صافی ز فرنگ آید و شاہد ز تتار
ما نہ دانیم کہ بسطامے و بغدادے ہست

ایک مدت سے جس چینی چائے کا عادی ہوں وہ وہائٹ جیسمین کہلاتی ہے۔ یعنی یاسمین سفید یا ٹھیٹ اردو میں یوں کہئے کہ گوری چمبیلی۔

کسے کہ محرم راز صباست می داند
کہ باوجود خزاں بوئے یاسمن باقی ست

اس کی خوشبو جس قدر لطیف ہے اتنا ہی کیف تند و تیز ہے۔ رنگت کی نسبت کیا کہوں؟ لوگوں نے آتش سیال کی تعبیر سے کام لیا ہے۔

مے میانِ شیشۂ ساقی نگر
آتشے گویا بہ آب آلودہ اند

لیکن آگ کا تخیل پھر ارضی ہے اور اس چائے کی علویت کچھ اور چاہتی ہے۔ میں سورج کی کرنوں کو مٹھی میں بند کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ یوں سمجھئے جیسے کسی نے سورج کی کرنیں حل کرکے بلوریں فنجان میں گھول دی ہیں۔ ملا محمد مازندانی صاحب بت خانہ نے اگر یہ چائے پی ہوتی تو خان خاناں کی خانہ ساز شراب کی مدح میں ہرگز یہ نہ کہتا۔

نمی ماند ایں بادہ اصلاً بہ آب
تو گوئی کہ حل کردہ اند آفتاب "

اپنی شخصیت کے اندرونی تصادم کے اظہار کے لئے مولانا نے اپنے ایک مکتوب میں اپنے

بے حس دل نے اس مطالبہ کا جواب دینا نہ سیکھا ہو"

غالباً غبارِ خاطر کے ذریعہ ہی پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ تذکرہ و ترجمان القرآن کے مصنف کے اندر ایک نغمہ موسیقار بھی چھپا ہوا ہے۔

"میں آپ سے ایک بات کہوں۔ میں نے بارہا اپنی طبیعت کو ٹٹولا ہے۔ میں زندگی کی احتیاجوں میں سے ہر چیز کے بغیر خوش رہ سکتا ہوں لیکن موسیقی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آوازِ خوش میرے لئے زندگی کا سہارا، دماغی کاوشوں کا مداوا اور جسم و دل کی ساری بیماریوں کا علاج ہے۔

"رات کا سناٹا تاروں کی چھاؤں، ڈھلتی ہوئی چاندنی اور اپریل کی بھیگی ہوئی رات۔ چاروں طرف تاج کے کنارے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ برجیاں دم بخود بیٹھی تھیں۔ بیچ میں چاندنی سے دھلا ہوا مرمریں گنبد اپنی کرسی پہ بے حس و حرکت متمکن تھا۔ نیچے جمنا کی رو پہلی جدولیں بل کھا کھا کر دوڑ رہی تھیں اور اوپر ستاروں کی ان گنت نگاہیں حیرت کے عالم میں تک رہی تھیں۔ نور و ظلمت کی اس ملی جلی فضا میں اچانک پردہ ہائے ستار سے نالہ ہائے بے حرف اٹھتے اور ہوا کی لہروں پہ بے روک تیرنے لگتے۔ آسمان سے تارے جھڑ رہے تھے اور میری انگلی کے زخموں سے نغمے"

غبارِ خاطر کا ابوالکلام نہ صرف یہ کہ اپنی شخصیت کے اس مغنی کو پالیتا ہے بلکہ تاریخ کی اس مستی میں بھی اسے اس مغنی کا سراغ مل جاتا ہے جس کے بارے میں مسلّمہ طور پر مشہور ہے کہ وہ موسیقی کا دشمن تھا!

"برہان پور کے حوالی میں ایک بستی زین آباد کے نام سے بس گئی تھی۔ اسی زین آباد کی رہنے والی ایک مغنیہ تھی جو زین آبادی کے نام سے

——— اب دوسری تصویر بھی دیکھئے :—

"میری طبیعت کا بھی عجیب حال ہے۔ دوسروں سے پہلے خود اپنی حالت پہ ہنستا ہوں۔ بچپنے میں چند مہینے چنورہ میں بسر کئے تھے کیونکہ کلکتہ میں طاعون پھیل رہا تھا۔ یہ جگہ عین دریائے ہوگلی پہ واقع ہے۔ میں نے یہیں سب سے پہلے تیرنا سیکھا۔ صبح و شام گھنٹوں دریا میں تیرتا رہتا پھر بھی جی سیر نہ ہوتا۔ اب بھی تیرائی کے لئے طبیعت ہمیشہ ترستی رہتی ہے۔ سبحان اللہ طبع بوقلموں کی نیرنگ آرائیاں دیکھئے۔ ایک طرف دریا سے ہم عنانی کا یہ ذوق و شوق، دوسری طرف آگ کے شعلوں سے سیراب ہونے کی یہ تشنگی! شاید یہ اس لئے کہ اقلیم زندگی کی سطح پہ پانی بہتا ہے، تہ میں آگ بھڑکتی رہتی ہے۔"

غبارِ خاطر کے ابوالکلام کے بارے میں ابتدا میں کہا جا چکا ہے کہ یہ ایک تکمیل یافتہ شخصیت ہے یعنی نوجوان ابوالکلام کے تصنیفی کارناموں میں قوت و توانائی، سخت کوشی اور ولولۂ حیات کا عنصر غالب ہے جسے جلال کہا جاتا ہے لیکن ان کی شخصیت کی رعنائی ان کے مکاتیب میں ہی نکھر کر سامنے آئی ہے۔ غالب نے اپنے بارے میں کہا تھا۔

در عشق غنچہ ام کہ لرزد ز باد صبح
در کار زندگی صفت سنگ خارہ ام

ان مکاتیب کا لکھنے والا بھی اپنی شخصیت کے ان دونوں عناصر کو پا لیتا ہے۔ جب ہم ابوالکلام کے یہ الفاظ پڑھتے ہیں تو سب سے پہلے ہمارے سامنے ابوالکلام کا چہرہ ایک فنکار کا چہرہ معلوم ہوتا ہے۔

حسن آواز میں ہو یا چہرے میں، تاج محل میں ہو یا نشاط باغ میں حسن ہے اور حسن اپنا فطری مطالبہ رکھتا ہے۔ افسوس اس محروم ازلی پر جس کے

کہ کہیں اس کے دامن صبر و وقار پر بے حالی اور پریشاں خاطری کا کوئی
دھبّہ نہ لگ جائے۔

بدہ یارب دلے کیں صورت بے جاں نمی خواہم

بالآخر ۹ر اپریل کو زہر غم کا یہ پیالہ لبریز ہوگیا۔

"مجھے ان چند دنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنی پڑی ہے میرے
عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا اگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں
شل ہو گئے ہیں۔"

غبار خاطر کے بیشتر مکاتیب پر خود مولانا کی اصطلاح میں انانیتی ادب (EGOISTIC LITERATURE) کی چھاپ لگی ہوئی ہے لیکن ان مکاتیب میں اس طرح کا مواد نہیں ملے گا جس کی مدد سے ایک سوانح نگار کو واقعات کی کھتونی تیار کرنے میں آسانی ہو۔ یہاں ہم مولانا کی شخصیت سے اسی طرح دوچار ہوتے ہیں جس طرح کسی فنکار کی فنی تخلیق میں۔ یہاں خارجی زندگی کے تجربات بھی ان کے خون جگر میں جذب ہو کر سامنے آتے ہیں۔ یہ خیال درست نہیں کہ ان مکاتیب میں وہ علمیت نہیں جس سے ابوالکلام، ابوالکلام بنے تھے بلکہ غور سے دیکھا جائے تو ان مکاتیب میں ان کا علم ان کی زندگی کے تجربات کے ساتھ حل ہو کر ایک نئی تخلیق کا منبع بن گیا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے ہم "داستان بے ستون و کوہکن" "حکایت بادۂ و تریاک" "حکایت زاغ و بلبل" اور "چڑیا چڑے کی کہانی" کو انشائیہ (PERSONAL ESSAYS) سمجھ کر پڑھیں یا مذہب، فلسفہ و اخلاق، سائنس، تہذیب، وحدت الوجود، اشراقیت اور ارتقا وغیرہ پر ان کے خیالات ملاحظہ فرمائیں یا وہ خط پڑھیں جس میں پانچویں صلیبی حملے کی سرگذشت بیان کی گئی ہے تو اندازہ ہوگا کہ اس نوع کے ادبی مضامین جو تخلیقی نوعیت کے بھی ہوں اور جن کی نظم فلسفیانہ ہو ایک اعلیٰ درجے کے ادیب کے ہی قلم سے نکل سکتے ہیں جس کا فن اپنی پختگی کو پہنچ چکا ہو۔

مشہور ہوئی اور اس کے نغمۂ وحسن کی تیر افگنیوں نے اورنگ زیب کو زمانۂ شہزادگی میں زخمی کیا۔ صاحب مآثرالامرا نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کیا خوب شعر لکھا ہے۔

عجب گیرندہ دامے بود در عاشق ربائی ہا
نگاہ آشنائے یار پیش از آشنائی ہا

اورنگ زیب کے اس معاشقے کی داستان بڑی ہی دلچسپ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اولوالعزمیوں کی طلب نے اسے لوہے اور پتھر کا بنا دیا تھا لیکن ایک زمانے میں گوشت و پوست کا آدمی بھی رہ چکا تھا۔

موسیقی کے بارے میں مولانا نے جو طویل مکتوب غبار خاطر میں شامل کیا ہے وہ علمیت سے قطع نظر خیالات کے اعتبار سے اس نوعیت کا ہے کہ بقول قاضی عبدالغفار "جبہ و دستار کی اقلیم میں نہ جانے کتنے زلزلے پیدا کر چکا ہوگا"

"لرزو زباد صبح" والی شخصیت ۱۱ اپریل ۱۹۴۳ء کے مکتوب میں واضح طور پر سامنے آئی ہے۔ یہ تحریر مولانا نے اپنی رفیقۂ حیات کے انتقال کے دو دن بعد لکھی ہے۔

"اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا میں اسے چھپانا نہیں چاہتا۔ میری کوشش تھی کہ اس صورت حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کروں۔ اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا لیکن شاید باطن نہ ہوسکا اور میں نے محسوس کیا کہ اب دماغ بناوٹ اور نمایش کا وہی پارٹ کھیلنے لگا ہے جو احساسات اور انفعالات کے ہر گوشہ میں ہم ہمیشہ کھیلا کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو باطن کی طرح نہیں بننے دیتے۔

"میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ تمام ظاہرداریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں جسے دماغ کا مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا اور اس لئے کھیلتا تھا

کے خطوں میں طوالت ہو اور ہر قدم پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے کی طبع رواں کا بہاؤ رکنے کا نام نہیں لیتا اور ہر خط یہ پکار کر کہہ رہا ہے ع :- کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے ۔ ان کے مکاتیب ہونے پر ہی اگر کسی کو اصرار ہے تو اس مکتوب نگاری کا رشتہ غالب کی سادہ و بے تکلف مکتوب نگاری کے بجائے اعجاز خسروی اور انشائے ابوالفضل سے ملانا ہوگا۔ اسی طرح جس طرح غالب کی غزل کے شجرۂ نسب کو ہم ولی اور میر کے بجائے خسرو اور پھر رودکی سے ملاتے ہیں۔ پھر اگر اعجاز خسروی اور انشائے ابوالفضل کے خط ادب عالیہ میں شمار کئے جاتے ہیں تو غبار خاطر اس ذخیرے میں ایک نادر اضافہ ہے۔

اب تک ہم نے مولانا کے مکاتیب پر صرف غبار خاطر کے دائرے میں رہ کر گفتگو کی ہے جو ایک طرح سے "نغمات اسیری" کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی تخلیق احمد نگر جیل کی تنہائیوں میں ہوئی ہے۔ ان خطوں سے مولانا کی اندرونی شخصیت کے اہم عناصر کا سراغ مل جاتا ہے لیکن مولانا کی مجلسی و سماجی زندگی اور ان کی بیرونی شخصیت کو سمجھنے کے لئے ہمیں ان خطوں کی طرف رجوع کرنا پڑیگا جو صحیح معنوں میں خط ہیں یعنی جس میں خود کلامی کے بجائے واقعی مخاطبت ہو اور جن میں کاتب کے ساتھ مکتوب الیہ بھی اپنی شخصیت رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مولانا نے اپنی ادبی و سیاسی زندگی کے آغاز سے لیکر اپنے معاصرین کو ہزاروں کی تعداد میں خط لکھے ہوں گے۔ خود غبار خاطر کے دیباچے میں محمد اجمل خاں صاحب نے سیاسی خطوط کا ذکر کیا ہے۔ یہ خطوط جو مکتوب نگاری کے عام تصور کے مطابق دلچسپ بھی ہوں گے اور مولانا کے سوانح نگار کے لئے کارآمد بھی ابھی تک معلوم نہیں ہو سکے ہیں۔ ہماری رسائی ان کے بہت قلیل حصے تک ہوئی ہے جو کاروان خیال کے نام سے مدینہ پریس بجنور اور مکاتیب ابوالکلام کے نام سے ادبستان لاہور نے شائع کئے ہیں۔ کاروان خیال کے مکتوب الیہ بھی غبار خاطر کے مکتوب الیہ یعنی نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمن خاں شروانی ہیں لیکن یہ خطوط مذکور کی اسیری سے پہلے کے ہیں۔ مکاتیب ابوالکلام میں حالی، شبلی، سید سلیمان ندوی، مولوی محی الدین قصوری، غلام رسول مہر اور ثناء اللہ پانی پتی وغیرہ کے نام خطوط ہیں۔

اُردو زبان میں اس نوع کا کوئی (ESSAYIST) مولانا کے علاوہ اور نظر نہیں آتا ——— حکایت " زاغ و بلبل " اور " چڑا چڑیا کی کہانی " ایک تاثراتی نظم کی طرح شروع ہوتی ہے لیکن آہستہ آہستہ اس میں پھولوں اور چڑیوں کے کردار فلسفۂ زندگی کا سمبل (SYMBOL) بن جاتے ہیں۔ قاضی عبدالغفار نے آثار ابوالکلام میں مولانا کے فلسفۂ حیات کا موازنہ اقبال کے فلسفۂ خودی سے کیا ہے اور ان کا خیال ہے کہ مولانا کا فلسفہ زیادہ ہمہ گیر اور انسانیت کے لئے قابل قبول ہے۔ لکھتے ہیں :-

"وہ (مولانا ابوالکلام) اقبال سے زیادہ مذہبی ہونے کے باوجود خود شناسی کے فطری تقاضوں کو انسانیت حتیٰ کہ ہر جاندار کے ساتھ منسوب کرتے ہیں اور چڑیا کے بچے کے لئے بھی خود شناسی کا تقاضا اتنا ہی ضروری سمجھتے ہیں جتنا کہ انسانوں کے لئے۔ اقبال نے بھی شہباز و شاہین کو ضمناً اپنا موضوع بنالیا ہے لیکن اقبال صرف مسلمانوں کے لئے قوت عمل کا ایک نسخہ تجویز کرتے ہیں اور مولانا تمام مخلوقات کی اس قوت نمو کا ذکر کرتے ہیں جو اس میں ودیعت ہے۔ مولانا شاہین و شہباز کے بجائے صرف "چڑیا چڑے کی کہانی" میں ساری انسانیت کو حرکت کا ایک پیام دیتے ہیں مگر اقبال اپنے بلند ترین افکار میں انسانیت کے اس تصور سے اس قدر وابستہ نظر نہیں آتے جتنے کہ صرف اسلام اور مذہب کے تصور سے۔"

غبارِ خاطر کے مکاتیب کا مطالعہ کرنے کے لئے ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ اُن سے صحیح معنوں میں لطف اندوز ہونے کے لئے عام معنوں میں مکتوب نگاری یا نجی خط و کتابت کے تصور کو ذہن سے نکال دینا ہوگا۔ اس کا سبب نہ صرف اس کے "غیر کاروباری" موضوعات ہیں بلکہ ان خطوں میں عام خطوں کے برخلاف سادگی و بے تکلفی اور روزمرہ کی زبان کے بجائے رنگینی و خیال آفرینی اور انشاپردازی کارچاؤ ہے۔ دوسرے یہ کہ عام طور پر ہمارے یہاں خط کی خوبی اس کا اختصار بتایا گیا ہے۔ اس کے برخلاف غبارِ خاطر

وہ کیا گئے کہ علم و فن کی صحبتوں کا سرتا سر خاتمہ ہو گیا۔ مولانا مرحوم سحر خیزی کے عادی تھے۔ والد مرحوم کی سحر خیزی نے مجھے بھی بچپن سے اس کا عادی بنا دیا ہو۔ اس اشتراکِ عادت نے ایک خاص رشتۂ انس پیدا کر دیا تھا جب کبھی یکجائی ہوتی تو صبح چار بجے کا وقت عجیب لطف و کیفیت کا وقت ہوتا۔ چائے کا دور چلتا اور علم و فن کے چرچے رہتے۔ ہر وادی میں وہ اپنے ذوق و فکر کی ایک خاص اور بلند جگہ رکھتے تھے اور یہ کتنی بڑی خوبی تھی کہ باوجود [illegible] علم طلب کے ملائیت کی پرچھائیں بھی ان پر نہیں پڑی تھی، خشکیِ طبع جو اس راہ کے سالک کو آفات میں سے ہے انہیں چھو تک نہیں گئی تھی۔ شاعری کے ذوق و فہم کا جو اعلیٰ مرتبہ ان کے حصہ میں آیا تھا اس کی تو نظیر ملنی دشوار ہے۔ ہندوستان میں فارسی شاعری کی عمر غالب پر نہیں اُن پر ختم ہوئی۔"

علامہ شبلی سے اس عقیدت کی ایک جھلک خود علامہ شبلی کے نام کے ایک خط میں دیکھئے۔

"نمائش الہ آباد کا ضعیف سا خیال ہو گر مشاہدہ تیام پیشِ نظر۔ الہ آباد میں میری کسی سے ایسی ملاقات نہیں کہ اپنا بوجھ ڈالوں مگر بر سبیلِ طفیلی جب آپ کہیں ٹھہر جائیں گے تو آپ کے خدام و وابستگان بھی۔ لامحالہ میں بھی ایک چاکر گستاخ تھا کہ ٹھہر گیا۔"

شبلی اکاڈمی یعنی دار المصنفین کے قیام پر مولانا سید سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"دار المصنفین کا پراسپکٹس پہنچا۔ آپ مجھے اس سلسلے میں جو کچھ بنانا چاہیں منظور ہے۔ آنریری فیلو تو ایک عمدہ بات ہے اگر اس میں کوئی جگہ قلی کی ہو جب بھی میں منظور کر لوں گا۔"

شبلی سے تو خیر ذہنی طور پر وہ متاثر ہی ہیں، دوسرے بزرگوں کا احترام بھی جا بجا ان کے خطوں میں ملتا ہے۔

الہلال شائع ہوا تو مولانا حالی کی خدمت میں اعزازی طور پر جاتا تھا۔ مولانا حالی ان پرچوں کو اس لئے

کاروانِ خیال کے خطوں میں بھی غبارِ خاطر کی طرح شوق کی بے پایانی ہے۔ تہران ریڈیو سے احمد تبریزی کی زبانی حافظ کی ایک غزل سُن کر ذہن کے بعض دریچے کُھل جاتے ہیں اور ماضی کی تصویریں اُبھر آتی ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"وقت کے تضادات کا کرشمہ دیکھئے بعینہ یہی غزل آج سے تیس برس پہلے ایک بزمِ انس میں سُنی تھی اور کہاں سُنی تھی؟ بغداد کی شبِ ماہ میں عین دجلہ کی لہروں پر۔"

اس خط میں سفرِ بغداد کا حال لکھا ہے اور وہاں کے اہلِ کمال شیخ العصر محمود شکری، آلوسی زادہ شیخ ابوحمزہ کردی، سید عبدالرحمٰن نقیب، سید فضل اللہ اصفہانی، شاعرِ عراق جمیل صدقی الزہاوی، سید صدرالدین عالمی، سید محمد کاظم طباطبائی، اخوند ملا محمد کاظم خراسانی اور مرزا محمد حسین دانش وغیرہ سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے۔ اس خط کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتے ہیں۔

"دیکھئے آپ کی صدائے دلنواز نے دلِ ہزار شورش کے ساتھ کیا کیا۔ جدید آدابِ مکاتبت سے قطعِ نظر کر کے کاغذ کے دونوں صفحے سیاہ کرتا رہا پھر بھی پانچ ورق ختم ہو چکے اور شوقِ مخاطبت ہے کہ رُکنے کا نام نہیں لیتا۔ ع

بہ صد دفتر نمی گنجد حدیثِ دردِ مشتاقے

ہر چند چاہتا ہوں کہ قلم روکوں لیکن روک نہیں سکتا۔ دماغ سینما کا پردہ بن گیا ہے ایک تصویر ہٹتی ہے تو دوسری نمودار ہو جاتی ہے۔ جی چاہتا ہے صحبت ختم نہ ہو۔ ایک ذکر ختم ہو جائے تو دوسرا چھیڑ دوں۔"

ایک خط میں علامہ شبلی کی یاد آ جاتی ہے۔ لکھتے ہیں۔

"فی الحقیقت مولانا کی ذات نوع بنوع و کمال کے رنگارنگ مظاہر کا ایک عجیب مجموعہ تھی اور جیسا کہ فارسی میں کہتے ہیں سرتاسر بے مغز و بے پوست تھی۔ بمشکل کوئی مہینہ ایسا گزرتا ہے کہ دو تین مرتبہ ان کی یاد ناخن بدل نہ ہوتی ہو۔

لکھ کر نظر ثانی کے لئے بھیجا تھا۔ میں نے واپس نہیں بھیجا اس لئے کہ وہ موجود
حالت میں کتاب کو پہلا حصہ کر کے شائع کرنا چاہتے تھے اور میں مُصر تھا کہ ایک ہی
مرتبہ میں پوری کتاب شائع کر دی جائے۔ خیال کیا کہ مقدمہ کا واپس نہ کرنا اشاعت
میں روک ہوگا لیکن انھوں نے بجنسہ چھاپ کر ایک ایک نسخہ بھیج دیا اور ان
ساری باتوں کو مزاح سمجھتے رہے۔ علاوہ ڈاکٹر اقبال وغیرہ والے ٹکڑے کے
پورا مقدمہ طرز تحریر و استدلال کے لحاظ سے بھی بالکل لغو ہے۔ لطف یہ کہ اس
مرتبہ جب وہ جلسہ کے موقع پر آئے اور میں نے پوچھا کہ اقبال کی نسبت آپ نے
کیونکر تبدیلی معلوم کی تو خود میرے ہی قول کا حوالہ دیا جو کبھی کہا تھا حالانکہ میں نے
جو بات کہی تھی وہ صرف یہ تھی کہ اقبال پہلے آج کل کے عامۃ الناس کے تصوف
میں مبتلا تھے، اب ان کے خیالات اس طرف سے ہٹ گئے ہیں اور وہ لوگ نئی بولی
میں جو بات ظاہر کرنا چاہتے ہیں وہ وہی ہیں جو میں ہمیشہ لکھتا رہا ہوں۔"

مولانا حسرت موہانی کے بارے میں بیگم حسرت کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"الحمد للہ کہ اللہ نے اپنے فضل و کرم سے حسرت کو مقام یوسفی کے کامل
اتباع کی توفیق دی اور اس فضیلت میں ان کا کوئی دوسرا شریک و نظیر نہیں۔۔۔
حسرت جو کچھ کر رہا ہے ہندستان اس کو پچاس برس بعد سمجھے گا۔"

ان ذاتی اور کاروباری خطوں میں بھی مولانا کی وہی باعظمت شخصیت اپنا جلوہ دکھاتی ہے جو
اپنی "انا" کا احساس رکھنے کے باوجود زندگی کے اعلیٰ اقدار کا عرفان رکھتی ہے۔ مولانا ان باکمالوں میں
سے ہیں جو اس گُر سے بخوبی واقف ہیں کہ کمال کی سرحد وہیں سے شروع ہوتی ہو جہاں ہمیں یہ احساس ہو جائے کہ ع
یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے

غلام رسول مہر کے نام ایک خط میں بے اختیار ان کے قلم سے یہ الفاظ نکل گئے ہیں۔

"افسوس ہو کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کر سکا۔

واپس کر دیئے تھے کہ بڑھاپے کی وجہ سے لکھنا لکھانا تقریباً ترک کر چکے تھے اور اپنے طور پر یہ محسوس کرتے تھے کہ جب میں اس اخبار کی قلمی امداد نہیں کر سکتا تو اسے مفت کیوں لوں۔ اس سلسلے میں حالی کے نام ابوالکلام کا خط دیکھئے۔

"دفتر سے معلوم ہوا کہ الہلال کے جو پرچے خدمت عالی میں جاتے ہیں بجنسہ واپس آجاتے ہیں۔ میرے دل عقیدت کیش کے لیے تو اتنی نسبت ہی بہت ہے کہ آستانۂ مبارک تک الہلال پہنچے اور محروم واپس آگئے۔ تاہم اس بے التفاتی کا سبب معلوم کرنے کے لیے بے قرار ہوں۔ میں نے پیشتر ہی عرض کر دیا تھا کہ حاضری سے ارادت کیشوں کو نہ رد کیجئے۔ ردی کی ٹوکری میں تو آخر جگہ مل سکتی ہے۔"

اپنے معاصرین کو وہ کس محبت سے یاد کرتے ہیں اس کے لیے حکیم اجمل خاں مرحوم کے بارے میں مولانا کی رائے دیکھئے۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو لکھتے ہیں۔

"وہی صبح چار بجے کا وقت تھا۔ آصف علی صاحب کی کوٹھی کے ایک کمرے میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ یکایک حکیم صاحب مرحوم کی یاد تازہ ہو گئی۔ ان کی یاد دہلی کے ساتھ اس طرح وابستہ ہو گئی ہے کہ یہ لفظ بغیر انھیں یاد کئے نہیں بول سکتا۔"

تذکرہ شائع ہوا تو اس کے دیباچے میں اس کے ناشر مسٹر فضل الدین نے کہیں کہا کہ علامہ اقبال نے اسرار خودی و رموز بے خودی مولانا ابوالکلام سے متاثر ہو کر لکھی ہے۔ اس بات پر اقبال نے مولانا سید سلیمان ندوی کو ایک خط لکھا جس میں اس خیال کی نہ صرف تردید کی بلکہ اس پر آزردگی کا اظہار کیا۔ اس سلسلے میں مولانا سید سلیمان صاحب کو لکھتے ہیں۔

"ڈاکٹر اقبال کا شکوہ بے جا نہیں۔ یہ نہایت ہی لغو اور سبک بات ہو کہ فلاں نے فلاں بات فلاں کے اثر سے لکھی ہے۔ در اصل اس کمبخت تذکرہ کی ساری باتیں میرے لئے تکلیف دہ ہوئیں۔ مسٹر فضل الدین نے یہ مقدمہ

نوائے نیازمندی

جناب جسٹس مرتضیٰ فضل علی صاحب جج جموں وکشمیر ہائیکورٹ

جناب صدر، سکریٹری، خواتین اور حضرات!

میں کلچرل سب کمیٹی کے پریسیڈنٹ اور سکریٹری کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے آج کی نشست کی صدارت کرنے کے لئے دعوت دی۔

اس سال تاریخ عالم کا ایک انتہائی غمناک حادثہ رونما ہوا ہے۔ یہ حادثہ ہے مولانا ابوالکلام آزاد کی اچانک وفات کا جو نہ صرف ہندستان کی ایک اہم سیاسی شخصیت تھے بلکہ سیاسیات، علم وفضل اور فلسفہ میں بھی جن کا کوئی عدیل نہ تھا۔ بدقسمتی سے مجھے اس عظیم ہستی سے کبھی ملنے کا شرف حاصل نہیں ہوا لیکن میں ان کی اردو دانی، ان کی علمیت اور ان کی زبردست شخصیت سے جس کا اظہار ان کی تحریروں اور تقریروں سے ہوتا ہے، اپنے زمانۂ طالب علمی سے متاثر ہوں اور ان کے ادبی اور شخصی صفات کا ہمیشہ معترف رہا ہوں۔

مولانا عالمان دین ومفسرین مذہب کے خاندان میں پیدا ہوئے اور علم وفضل اور نیکیوں کی خاندانی صفات ورثہ میں پائیں۔ وہ مکہ معظمہ میں جو علوم مشرقیہ کا ماحول پیدا کرنے کا بہترین مرکز تھا پیدا ہوئے۔ پھر اُن کے والد ماجد کلکتہ واپس چلے آئے جہاں مولانا آزاد کی زندگی کا اوائل حصہ بسر ہوا۔ اُنکے والد ماجد خود بھی ایک بڑے عالم دین تھے اور عوام کی نظروں میں اُن کی بڑی عزت و توقیر تھی۔

مولانا کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ ابھی سولہ سترہ برس ہی کے تھے کہ انھوں نے علوم دینی کی تکمیل کر لی اور انھیں دستار فضیلت بھی باندھ دی گئی۔ ابھی انھوں نے اپنی زندگی کی دوسری دہائی بھی مکمل نہ کی تھی کہ علوم دینی کا باقاعدہ درس دینے لگے اور اپنی زبردست فضیلت کا ہر شخص سے اعتراف کرا لیا انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ساری دُنیا میں جو زبردست سماجی اور سیاسی

غالب کو تو صرف اپنی شاعری کا رونا تھا نہیں معلوم میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں ساتھ جائیں گی ؎

ناروا بود بہ بازار جہاں جنس وفا
رونقے گشتم و از طالع دکاں رفتم

بعض اوقات سوچتا ہوں تو طبیعت پر حسرت والم کا ایک عجیب عالم طاری ہو جاتا ہے۔ مذہب، علوم و فنون، ادب، انشاء، شاعری کوئی ایسی وادی نہیں جس کی بیشمار نئی راہیں مبدأ فیاض نے اس نامراد کے دل و دماغ پر نہ کھول دی ہوں اور ہر آن ہر لحظہ بخششوں سے دامن مالا مال نہ ہوا ہو۔ بحالیکہ ہر روز اپنے آپ کو عالم معنی کے ایک نئے مقام پر پاتا ہوں اور ہر منزل کی کرشمہ سنجیاں پچھلی منزلوں کی جلوہ طرازیوں کو ماند کر دیتی ہیں لیکن افسوس جس ہاتھ نے فکر و نظر کی ان دولتوں سے گراں بار کیا اس نے شاید سروسامان کار کے لحاظ سے تہی دست رکھنا چاہا۔ میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا مگر اس کے حوالے کر دیا گیا۔"

یہ محض شاعرانہ تعلی نہیں بلکہ اپنی شکست کی آواز ہے جس نے ابوالکلام کے آرٹ کو ان ارتقائی منزلوں تک پہنچایا جہاں نظم و نثر کا امتیاز مٹ جاتا ہے۔ اس بے سروسامانی کے اعتراف کے باوجود بیسویں صدی کے ہندستانی ادب میں ان کا قد و قامت اتنا بلند ہے کہ ٹیگور اور اقبال کے ساتھ صرف ابوالکلام ہی کا نام لیا جا سکتا ہے۔

یہ خطوط اُردو نثر کی تاریخ میں ایک مخصوص درجہ رکھتے ہیں جس شستہ زبان میں یہ خط لکھے گئے ہیں اُس نے اردو زبان میں مولانا آزاد کے لئے ایک نمایاں درجہ مخصوص کر دیا ہے۔ ان خطوط کو جو شخص بھی پڑھے گا وہ لکھنے والے کی وسیع القلبی اور زبردست شخصیت سے کافی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے گا۔ بعض اوقات ان خطوط سے یاس کی جھلک نظر آئیگی اور بعض مرتبہ مقاومت کا ایک جذبہ ان میں دکھائی پڑیگا لیکن ان تمام خطوں میں جن جزئیات سے بحث کی گئی ہے اس سے مولانا کے تبحر علمی کا پتہ چلتا ہے اور اس کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے خیالات کو کس وضاحت سے ظاہر کیا ہے۔

اگر کانگریس میں ایسی کوئی ہستی تھی جو اپنے مستحکم اور اٹل اصولوں پر برابر قائم رہی تو وہ مولانا آزاد کی ہستی تھی، یہ انکا ذہن رسا اور سیاسی مسائل میں ان کی دُور بینی تھی جس کے باعث کانگریس کے اکابر مشکل مسائل میں ان سے مشورہ کرتے اور وہ ان تمام مشکل مسائل کا فوری حل اُن کے سامنے پیش کر دیتے۔ شاید یہی وجہ تھی جو صدر جمہوریۂ ہند اور وزیر اعظم دونوں نے اپنی تقریروں میں یہ کہا تھا کہ اُن کی وفات سے ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جو برسوں تک نہ پورا ہو سکے گا۔

مولانا کا ایک اور عظیم کارنامہ ان کی تفسیر قرآن تھی جو اپنے اسلوب اور صفائی بیان میں ایک منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ عربی زبان دنیا کی مشکل ترین زبانوں میں ہے اور یہ مولانا آزاد ہی ایسے فرد کی شخصیت تھی جو اپنی زبردست فارسی و عربی دانی کی بدولت پیروان مذہب اسلام نیز حق کے متلاشیوں کی ہدایت کے لئے آیات قرآنی کا صحیح مفہوم پیش کر سکتی تھی۔

میں جب وکالت کرتا تھا تو دنیائے سیاسیات سے بالکل الگ رہتا تھا۔ اس لئے میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ مولانا کی اعلیٰ صفات اور سیاسیات کے شعبہ میں ان کے اہم کردار پر کما حقہ روشنی ڈال سکوں اور میں یہ مناسب بھی نہیں سمجھتا کہ یہ اسکے لئے مناسب موقع ہے۔ اس لئے میں نے اپنے خیالات کو اُن کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں تک محدود رکھا ہے، بالخصوص ان کے خطوط تک جو آج کی نشست کا موضوع ہیں۔

آخر میں میں یہ کہوں گا کہ مولانا آزاد کی وفات سے ہندستان علوم مشرقیہ کے ایک زبردست

تبدیلیاں اور انقلابات ہو رہے تھے انھوں نے اُن کی ہمہ گیر اور جوشِ عمل سے بھری ہوئی شخصیت کو متاثر کیا اور انڈین نیشنل کانگریس نے فوراً ان کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لی۔ تاریخِ جنگِ آزادی کی بڑی مبارک گھڑی تھی جب مولانا نے آزادی کی مقدس جنگ میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ اُن کی سیاسی دوربینی اور زبردست جذبۂ حبُّ الوطنی انھیں جنگِ آزادی کی صفِ اول میں لے آیا، اور آزادی کے رہنماؤں میں انھوں نے بہت جلد ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں انھوں نے لسان الصدق نکالا اور پھر جلد ہی انھوں نے وہ مشہور معروف اور حیاتِ ابدی رکھنے والا اخبار شائع کرنا شروع کیا جس کا نام الہلال تھا۔ انھوں نے اس اخبار میں اپنے مضامین سے عوام میں، بالخصوص مسلمانوں میں جو ابھی تک سیاسی بیداری سے الگ تھلگ تھے ایک سیاسی اور سماجی شعور پیدا کر دیا۔ فطرتاً ایک مطلق آزاد مزاج رکھنے کے باعث وہ ہر قسم کے فرقہ وارانہ خیالات سے بلند تھے اور فرقہ وارانہ سیاسیات سے بالکل کنارہ کش۔

ان کی قربانیوں اور آزادی کی راہ میں اُن کی خدمتوں نے انھیں جلد ہی انڈین نیشنل کانگریس کا ایک رہنما بنا دیا اور بہت کم عمری میں وہ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر منتخب ہو گئے یہ ایک ایسا واقعہ تھا جس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی۔

جنگِ آزادی کے دوران، انھیں متعدد بار جیل جانا پڑا اور جیل خانہ ہی میں انھوں نے غبارِ خاطر لکھی۔ یہ ایک اُن خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے لکھے لیکن وہ مکتوب الیہ کو اُس وقت بھیجے نہیں جا سکے۔ ان خطوط سے آزاد بحیثیت ایک انسان پر اچھی طرح روشنی پڑتی ہے۔ ان خطوط کو اردو ادب میں بلند درجہ حاصل ہے اور یہ بہت سے موضوعات کا جو سیاسی بھی ہیں سماجی بھی، مذہبی بھی ہیں اور فلسفیانہ بھی، احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ ان خطوط کا اسلوب بڑا پُر زور، پُر اثر، خود رس اور اسی کے ساتھ خیال آفریں ہے۔ مولانا نے ان خطوط میں اپنی ادبی صلاحیتوں، اپنے علم و فضل کی وسعتوں، حالاتِ حاضرہ نیز انسانی زندگی کی گہرائیوں پر اپنے ادراک اور بصیرت کا مظاہرہ کیا ہے۔ (الہلال میں مولانا کا جو اسلوب تھا اس سے ان خطوط کا اسلوب مختلف ہے۔)

مولانا آزاد - فلسفی، انسان اور قائد کی حیثیت سے

ڈاکٹر اختر اورینوی

میں سب سے پہلے اپنا یہ فرض سمجھتا ہوں کہ اہلِ کشمیر اور سیمینار کے منتظمین کا شکریہ ادا کروں کہ انھوں نے مجھے اس اہم سیمینار میں شمولیت کا موقع عطا فرمایا اور پھر میں انھیں مبارکباد دیتا ہوں کہ ادبی و علمی سیمیناروں میں دو نہایت ہی اہم سیمیناروں کی تنظیم کا انھیں موقعہ ملا۔ یہاں پہلا سیمینار علامہ اقبال پر ہوا تھا اور اب یہ دوسرا سیمینار مولانا ابوالکلام آزاد پر منعقد ہو رہا ہے۔

حضرات! آپ نے جو خدمت میرے سپرد کی ہے وہ سہ گانہ ہے اور اس محدود وقت کے اندر میں ان تین موضوعات کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ بہرحال میں کوشش کروں گا کہ مختصراً میں مولانا آزاد کو ایک فلسفی، ایک قائد اور ایک انسان کی حیثیت سے پیش کروں۔

مولانا آزاد ایک فلسفی کی حیثیت سے

میں ابتدا ہی میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میں اختصاصی معنوں میں مولانا آزاد کو فلسفی تسلیم نہیں کرتا یعنی میں انھیں سقراط، افلاطون، ارسطو، ابن رشد، ابن سینا، فارابی، کانٹ، ہیگل یا برٹرنڈ رسل کی نوعیت کا فرد نہیں سمجھتا لیکن میں یہ مانتا ہوں کہ مولانا آزاد میں نمایاں فکری میلان پایا جاتا تھا اور اُن کی شخصیت میں فلسفیانہ عنصر

ماہر اور اپنے ایک بڑے فلسفی سے محروم ہو گیا ہے۔ مجھے اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ان کی وفات سے ادب اُردو اور اسلامی کلچر کے شعبہ میں بھی ایک خلیج پیدا ہو گئی ہے جو برسوں تک پُر نہ ہو سکیگی۔ اُن کے مضامین، اُن کی کتابیں اور اُن کے خطوط ان لوگوں کے لئے جو جدید اُردو اور ادب کی ترقی کی کوشش کر رہے ہیں ایک نمونہ ہونا چاہیئے۔ مختصراً اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب تک اُردو ادب موجود ہے مولانا آزاد اس کی ایک ممتاز ترین ہستی رہیں گے اور ایک زبردست فاضل، ایک فلسفی اور ایک زبردست نثر نگار کی حیثیت سے جو مولانا شبلی، حالی، شرر وغیرہ کے پایہ کا ہو ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔

مولانا کے نظریۂ حیات میں عرب کی استواری، عجم کی رنگینی اور ہند کی وسعت تھی۔ انھیں وراثتاً صوفیانہ دردمندی، رواداری، اور گداز دل ملا تھا۔ اُن کا نہایت ہی بالیدہ جمالیاتی ذوق بھی اُن کے اندر توازنِ فکر و نظر پیدا کرنے کا موجب ہوا۔

مولانا آزاد کی شخصیت میں نمایاں فکری میلان کے ساتھ عمل و اقدام کا رجحان بھی واضح رنگ میں پایا جاتا تھا۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ فلسفیانہ مذاق رکھنے والی شخصیتیں اور شعر و سخن کا ذوق رکھنے والے افراد عملی زندگی کی ذمہ داریوں اور سخت کوشیوں سے بالطبع گریزاں ہوتے ہیں۔ فلسفی اور شاعر عالمِ فکر و خیال میں گم رہتے ہیں۔ بلاشک مولانا کی شخصیت کو یہ غیر معمولی فیضانِ فطرت حاصل ہوا تھا کہ آپ کو فلسفہ و شعر و ادب کے ذوق و شوق کے ساتھ عملی سیاسیات سے گہری دلچسپی و وابستگی بھی تھی۔ یہ بھی توازنِ شخصیت کا ایک اہم ثبوت ہے۔ لہٰذا مولانا کے فلسفہ کو ہم عملی فلسفہ کہیں تو بالکل صحیح ہوگا خصوصاً جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے نظریۂ زندگی سے علیحدہ ہو کر، کبھی کوئی عملی قدم نہیں اُٹھایا۔ اُن کے بنیادی خیال اور اعمال میں تضاد نہیں پایا جاتا۔

مولانا آزاد کی فلسفیانہ شخصیت اور مفکرانہ میلانات کی تاسیس، تعمیر و تنظیم میں مختلف مہیّجات و تحریکات کے اثرات پڑے تھے۔ اس میں مولانا کے مطالعہ و مشاہدہ دونوں کا دخل تھا۔ اس راہ میں ماضی و حال دونوں نے شرکت کی تھی۔ میرے خیال میں مولانا کی ذہنی و فکری زندگی کی قماش بندی میں تین روایتی سلسلوں کی کارفرمائی کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اول اسلامی، دوم ہندی، سوم یورپی۔ ظاہر ہے کہ اس میں اول الذکر کی زیادہ اہمیت ہے۔ مولانا قدیم ائمۂ اسلام سے بھی متاثر تھے اور نسبتاً جدید بزرگوں سے بھی۔ مولانا پر حضرت ولی اللہ شاہ محدث دہلوی، حضرت سید احمد بریلوی، حضرات علمائے دیوبند اور حضرت مرزا غلام احمد قادیانی کے اثرات کسی نہ کسی رنگ میں ضرور پڑے ہیں۔ مگر مولانا کی بالیدہ انفرادیت انھیں کسی بزرگ سے مکمل طور پر متاثر ہونے سے ہمیشہ روکتی رہی۔ مولانا پر

موجود تھا۔ اُنھوں نے کوئی نظامِ فلسفہ تو نہیں پیش کیا لیکن وہ ہمیشہ غیر معمولی ذہانت و تدبّر کے ساتھ مسائلِ حیات پر غور و فکر کرتے رہے۔ اُنھوں نے ادب و فن، معاشرہ، سیاست واقتصاد اور دینیات کی گہرائی میں ڈوب کر بڑی انفرادیت و جرأت کا اظہار کرتے ہوئے حقائق کی تلاش و جستجو کی ہے۔

میرا مطالعہ یہ ہے کہ مولانا آزاد کا ایک خاص نظریۂ زندگی تھا۔ وہ اپنا ایک سوچا سمجھا ہوا نصب العین رکھتے تھے لیکن مولانا کا نظریہ جامد و ساکن نہیں تھا۔ حالات کی تبدیلی کے ساتھ اُن کے فکر و خیال کے نتائج میں بھی تبدیلی ہوتی تھی۔ مولانا معروضی حقایق کے ارتقا کے قایل تھے۔ اُن کے ہاں فکری کٹرپن اور نظری عصبیت نہیں ملتی۔ وہ نہایت وسیع المشرب دانشور تھے۔

حس، جذبۂ تخیّل اور ادراک و شعور کی بالیدگی و پختگی سے شخصیت اُبھرتی ہے اور عُمق و آزادیٔ فکر و نظر سے انفرادیت پیدا ہوتی ہے۔ مولانا آزاد ایک استوار شخصیت اور نمایاں انفرادیت کے مالک تھے۔ خود فرماتے ہیں :۔

"مذہب میں، اُدب میں، سیاست میں، فکر و نظر کی عام راہوں میں، جس طرف بھی نکلنا پڑا، اکیلا ہی نکلنا پڑا۔ کسی راہ میں بھی وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکا۔"

میرے خیال میں مولانا کا نظریۂ حیات ایک وسیع المشرب مسلمان کا نظریۂ حیات تھا۔ ممکن ہے کہ ابتدا میں وہ کسی خاص مسلک سے وابستہ رہے ہوں لیکن رفتہ رفتہ اُن میں آزاد خیالی پیدا ہوئی۔ ڈاکٹر ملّت کے اندر انھیں اسلامی لبرل کہا جا سکتا ہے۔ مولانا تعبیرِ حیات و تفسیرِ اسلام میں کٹرپن، اندھی تقلید اور رجعت پسندی کو نامردا سمجھنے لگے تھے۔ وہ اپنے بعض پہلے خیالات کی تردید یا اُن میں ترمیم کی ایک مردانہ جرأت بھی رکھتے تھے۔ وہ مجمعِ عام یا اجماعِ ذہنی و نظری سے مرعوب ہونا نہیں جانتے تھے۔

فلاح و بہبود کے لئے استعمال کرنے کو کہتے ہیں۔ فطری قوتوں اور اُن کے مظاہر کی تخریب و تصادم سے بچنا اور اُن کی تعمیری معاون طاقتوں کو منظّم کرنا انسانی کلچر کے فرائض ہیں۔ اَنفس و آفاق کو سمجھنا اور رازہائے کائنات کو معلوم کرنا کلچر کے مقاصد میں شامل ہے۔ لہذا کلچر کے تصوّر کو محدود نہیں کیا جاسکتا۔ کلچر انسانی ہوتا ہے قومی نہیں۔ ہاں مقامی احوال و آثار کی وجہ سے کچھ مقامی خصوصیات کسی علاقہ یا قوم کے کلچر میں شامل ہو جاتی ہیں۔ اور اس طرح عالمگیر بشری کلچر میں تنوّع اور رنگینی پیدا ہوتی رہتی ہے۔

عصرِ حاضر میں گاندھی جی نے اور پھر مولانا آزاد اور پنڈت نہرو نے گہرے تہذیبی و کلچری مسائل پر غور و فکر کیا۔ ان تینوں کے مزاج اور فکر و نظر میں آفاقیت پائی جاتی ہے۔ متحدہ ہندوستانی کلچر کے نظریہ کو جنم دینے میں مولانا آزاد کا بڑا حصہ ہے۔ ہندوستان کی تہذیب صرف گنگا جمنی نہیں بلکہ گلستانِ ہزار رنگ کی طرح ہے۔ جدید ہندوستانی تہذیب کول، دراوڑی، آریائی، عربی، ایرانی، ترکی، مُغلئی، اور انگریزی تہذیبوں کا مجموعہ ہے۔ موجودہ علاقائی میلانات اور مختلف عناصر ترکیبی کی خصوصیات کے اجتماع کے باوجود ہندوستانی تہذیب کے اندر کثرت میں وحدت کے جلوے ملتے ہیں۔ مولانا آزاد ہندو کلچر اور مسلم کلچر کے قایل نہیں تھے بلکہ وہ متحدہ ہندوستانی کلچر کے قایل تھے اور آفاقی انسانی کلچر کی سمت دیکھتے تھے۔ لہذا منطقی طور پر وہ دو قومی نظریہ کو بھی نہیں مانتے تھے۔ اُن کے نزدیک اختلافات کے ہوتے ہوئے بھی ہند کے ہندو، سکھ، مسلمان، عیسائی وغیرہ سب ایک ہندوستانی قوم میں داخل و شامل تھے۔

مولانا آزاد ایک قائد کی حیثیت سے

مولانا آزاد کی مفکرانہ حیثیت نے اُن کی صلاحیت قیادت کو بہت تقویت پہنچائی۔ بلند نظری اور بلند فکری سے ایک معمولی سیاست داں بطلِ سیاست اور رجلِ قیادت بن سکتا ہے۔ فکر و نظر کی رفعت و فلسفیت سے نصب العین کی صحت اور استواری پیدا ہوتی ہے، اور

کٹر علماء سے زیادہ متفکرین اور مجتہدین کا اثر پڑا تھا، مثلاً تفسیر قرآن اور تعبیر اسلام کے باب میں مولانا آزاد نے حضرت مرزا غلام احمد کے اثرات قبول کئے تھے۔ یاجوج و ماجوج اور دوسرے مسائل کی جس رنگ میں مولانا نے تشریحیں کی ہیں اس کے پیش رو حضرت مرزا صاحب تھے۔ "اخبار وکیل" امرتسر کی ادارت کے زمانہ میں مرزا صاحب کی وفات پر مولانا آزاد نے ایک بلیغ اداریہ لکھا تھا جس سے اس امر کا صاف اظہار ہوتا ہے کہ آپ حضرت مرزا صاحب کی تحریک سے اچھی طرح واقف اور اُن کی شخصیت سے متاثر تھے۔

جناب مولانا کی فکری زندگی میں راجہ رام موہن رائے کلکتوی، سوامی دیویکا نند اور مہاتما گاندھی کے افکار و خیالات بھی مولانا کی انفرادیت کا احترام کرتے ہوئے داخل ہوئے۔ مولانا کا معاشری، سیاسی اور مشرقی فلسفہ ہندی اثرات بھی قبول کرتا رہا ہے۔ ان اثرات کے علاوہ مولانا یورپ کی فکری تحریکات سے بھی اچھی طرح واقف تھے اور آپ کے اندر اتنی دانشورانہ کشادہ دلی اور روشن دماغی پائی جاتی تھی کہ آپ ان کا تخلیقی استعمال کر سکتے تھے۔ مولانا کے ذہن و دماغ میں رسمیت اور تقلید محض کا عنصر نہیں پایا جاتا تھا۔ وہ اچھے روایتی سرمایہ کو اپنی شخصیت کی آنچ میں نئے سرے سے ڈھال کر اپنی فکری قماش میں شامل کرتے تھے۔

مذہبی اور ادبی سرمایہ میں مولانا نے متفکرانہ اضافے کئے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ نے سیاسی عمق نظر اور تہذیبی بصیرت کا ثبوت بھی دیا۔ جدید ہندوستانی کلچر کے منہاج، سمت اور رفتار کے تعین میں مولانا کے فلسفیانہ مزاج نے بہت ہی نمایاں حصہ لیا ہے۔

کلچر و ثقافت کا دائرۂ عمل بہت وسیع ہے۔ زراعت، تجارت، صنعت و حرفت، علم و حکمت، فنون و فلسفہ، مذہب و معاشرت، سیاست و اقتصاد یہ سب کلچر کے مظاہر ہیں۔ دراصل کلچر نام ہے نیچر کی تسخیر، تنظیم، اور تحسین کا۔ ثقافت فطرت کی طاقتوں کو انسان کی

نہایت ہی نمایاں تھی۔ دینی علوم کی مہارت نے مولانا کو محترم بنا دیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ رفتہ رفتہ امام الہند کہلانے لگے تھے اور بڑے بڑے اجتماع میں امامت کے مقام پر کھڑے کئے جاتے تھے۔

مولانا کی حریت پسندی اور آزادئ ضمیر نے انھیں سیاست کے میدان کی طرف بھی بلایا اور یہاں بھی اُن کی شخصیت، تبحر علمی، حُب الوطنی اور جرأتِ اظہار نے انھیں قیادت کی جگہ دلوائی۔

برطانوی قیصریت کے مقابلہ پر کھڑا ہونا آسان کام نہیں تھا۔ یہ مُشکل کام مولانا نے انجام دیا اور اپنی قیادت سے کروڑوں نفوس کے اندر جرأت و اقدام کی توانائی پیدا کردی۔ ہاں، میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ہندوستان کی قومی تحریک ایک متحدہ قیادت کی مرہون منت رہی ہے۔ مولانا اس کہکشانِ رہنمائی کے ایک تابندہ ستارے تھے۔

مولانا آزاد ایک غیر مشروط ہندوستانی حُب الوطنی کے جاندادہ تھے۔ دورِ اوّل میں اُنھوں نے صرف مسلمانوں کو حرکت و عمل کے لئے پکارا۔ البلاغ میں یہی آواز گونجی اور الہلال میں یہی روشنی چمکی۔ دورِ وسطیٰ میں مولانا نے ہندو مسلم اتحاد کا نعرۂ جاں بخش لگایا اور مسلمانوں کو سرفروشی کے لئے کانگریس کے جھنڈے کے نیچے اکٹھا کرنا چاہا۔ یہ منزل بڑی پُرپیچ اور سخت بن گئی کیونکہ ہندو فرقہ پرستی نے قومیت کا لبادہ اوڑھ کر مُسلم فرقہ پرستی کو جنم دیا اور جب مُسلم فرقہ پرستی بلائے جان بنی تو پھر خالص حُب الوطنی کے نصب العین کو سامنے رکھ کر فرائض قیادت ادا کرنا جان گُسل ثابت ہونے لگا۔ مولانا امام الہند کے مقام پر کھڑے ہو کر بھی مُسلم فرقہ پرستی کے طوفان کو روک نہ سکے لیکن انھوں نے وفاداری بشرطِ استواری کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہوئے خالص حُب الوطنی اور متحدہ قومیت کے اصول سے مخلصانہ اور مجاہدانہ تعلق قائم رکھا۔ مولانا نے صحیح فیصلہ کیا یا غلط؟ اس سوال کا جواب مختلف ہو سکتا ہے۔ مگر اس امر میں کوئی دو رائے نہیں ہو سکتی کہ تقسیم ہند کے بعد والے پُر آشوب

نصب العین کی صحت و توانائی سے مرحلۂ قیادت آسان تر ہو جاتا ہے۔ مولانا کے فلسفیانہ مزاج نے انھیں ایک عظیم قائد بنایا۔ اس راہ میں مولانا کی ادبیت، تلکاری، صحافت و خطابت نے بھی بہت مدد دی۔ مولانا آزاد کو فطرت نے ایک سوچنے والا داغ، محسوس کرنے والا جری دل، طاقت ور زبان اور پُر تاثیر قلم عطا کیا تھا۔ البلاغ و الہلال، تذکرہ و ترجمان القرآن، اور غبار خاطر کے اسالیب اظہار کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں اثر و نفوذ کی کتنی بے پناہ طاقت پوشیدہ ہے۔ اس پر طرّہ مولانا کا زور بیان، فصاحت کلام اور بلاغت اظہار تھا۔ آزاد میں نہایت غیر معمولی صلاحیتِ خطابت پائی جاتی تھی۔ ان ساری خصوصیات نے مولانا کو ایک عظیم بطل قیادت بنا دیا۔

میں مولانا کی صحافی و سیاسی زندگی کی تفصیلات میں نہیں پڑنا چاہتا بلکہ میں مولانا کی قیادت کے صرف اہم خدوخال پیش کروں گا۔

ملوکیت، غیر ملکی حکومت، استبداد، فرقہ پرستی اور اکثریت کی متنگ نظری کے خلاف جرأت سے کھڑا ہونا درجۂ شہادت تک پہنچا دیتا ہے۔ انفرادی طور پر قصّۂ دار و رسن کو بازیٔ طفلانۂ دل سمجھ لینا اور بے خطر آتش نمرود میں کود پڑنا عشق و مستی تو قرار دیا جا سکتا ہے مگر داستانِ قیادت کے سارے ابواب محض سُرخیِ افسانہ سے نہیں لکھے جاتے۔ قیادت کے لئے بہت ہی متنوع صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ قیادت کے لئے نمایاں و بالیدہ و پختہ شخصیت، قوتِ جذب، دور اندیشی، نکتہ رسی، صبر و تحمّل، جرأت، عقدہ کشائی، دردمندی، عقل و بصیرت، رسم و راہ منزل سے واقفیت، مقصد و نصب العین کے واضح تصور، علمی صلاحیت، ایثار، پختگی اور قوتِ اثر و نفوذ کی قدم قدم پر ضرورت ہوتی ہے۔ مولانا آزاد کی شخصیت میں قیادت کے یہ سارے لوازم پائے جاتے تھے۔

قیادت کے لئے اپنے حلقہ میں نمایاں اور محترم یا محبوب ہونا لازمی ہے۔ مولانا کی شخصیت اپنے خاندانی وقار، اپنے علم و فضل اپنی قوت تحریر اور طاقتِ گویائی کی وجہ سے

مولانا آزاد ایک انسان کی حیثیت سے

مجھے یہ موقعہ تو کبھی نہیں ملا کہ میں مولانا آزاد کی صحبت میں کچھ دیر رہوں۔ بدقسمتی سے میں کبھی مولانا سے شرف ملاقات بھی حاصل نہیں کر سکا۔ لیکن میرے شریک کار برادر گرامی علامہ جمیل مظہری مولانا کی صحبتوں میں خوب خوب باریاب ہوتے رہے ہیں۔ ان سے مجھے مولانا کے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ اس ذریعہ کے علاوہ اور بھی اطلاعات کے واسطے میسّر آتے رہے ہیں۔

مولانا آزاد کی گفتگو کا طریقہ نہایت متین، پُر وقار، سنجیدہ اور خوبصورت تھا۔ آپ بڑے سکون سے سلجھا سلجھا کر باتیں کرتے تھے۔ "میرے بھائی" کہہ کر مخاطب فرماتے اور آپ جس سے کلام کرتے اس پر ہمیشہ نہایت خوش آئند اثر ہوتا تھا۔ مولانا کی صحبتوں میں جمہوری فضا اور رئیسانہ شائستگی پائی جاتی تھی۔ رعب و دبدبہ کی شمع سے محبت و اخلاص کی کرنیں پھوٹتی تھیں۔ مولانا کے مزاج میں نفاست و لطافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وزن و وقار کے ساتھ حُسن و جمال کا امتزاج درخشندہ و پُرکشش انسانیت پیدا کرتا ہے۔ مولانا کی سیرت و صورت میں جلال و جمال کے عناصر بہ خیر و خوبی ترکیب پا گئے تھے۔

ایک فن کار دردمند اور پُر گداز شخصیت کا مالک ہوتا ہے اور ایک قائد پُر سوز ہمدردانہ فطرت رکھنے کے باوجود ذاتی استواری اور مضبوطی کا مالک ضرور ہوتا ہے کہ وہ آنسو کے ریلے میں بہہ نہیں جاتا۔ وہ اپنی شخصیت کے پگھلے ہوئے لوہے کو اسپات بنا لیتا ہے۔ کامیاب قیادت اس مزاج آہنی کے بغیر ناممکن ہے۔ مولانا ایک دردمند دل رکھنے والے انسان تھے۔ وہ فن کار بھی تھے اور محبِ وطن بھی لیکن نہ جھکنے والے قائد بھی۔ آپ کی رفیقۂ حیات کا انتقال ہو گیا لیکن آپ نے اس بات کو پسند نہیں فرمایا کہ فرنگی کی قید سے آزاد ہونے کی درخواست کریں۔

دور میں بھی مولانا نے ہندو فرقہ پرستی کی زہرناکیوں کو دور کرنے میں نہ صرف فراستِ قیادت کا اظہار کیا بلکہ اُسی جرأت کا ثبوت بھی دیا جس کے بل بوتے پر انھوں نے تقسیم وطن کے پہلے مُسلم فرقہ پرستی کا دلیرانہ مقابلہ کیا تھا۔

مولانا کے صبر و تحمل کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ جب خود اہلِ حرم نے مولانا کی تذلیل و تضحیک کی تو وہ آپے سے باہر نہ ہوئے اور جب ۱۹۴۷ء میں کڑا وقت آیا تو انھوں نے مسلمانوں کی ڈھارس بندھائی اور ہندوؤں کی صحیح رہنمائی کی۔ پنڈت نہرو کی قیادت کا پتوار ہمیشہ مولانا آزاد کے ہاتھ میں رہا۔ مولانا نے اپنے سیاسی مخالفین کو ہمیشہ معاف کیا ہے۔

آزاد کی قیادت کے دورِ آخر کے کارناموں میں سے تین بڑے کارنامے ہیں۔ اوّل ہندوستان اور ممالک عربیہ کے درمیان روابط کو استوار بنانے کے لئے کامیاب اقدام۔ آج ہمارا ملک آزاد کی قیادت کا شیریں پھل نیل و دجلہ کے نخلستانوں سے توڑ کر کھا رہا اور اپنے باغہائے محبت کے تحفے انھیں بھیج رہا ہے۔

دوئم ہندو فرقہ پرستی کی اس وطن دشمنی سے اُسے بچانا جو مسلم یونیورسٹی کی شکست و ریخت کی صورت میں تخریبِ ملک کا مجنونانہ کھیل کھیلنے والی تھی۔

سوئم ہندی کے نادان دوستوں کی آمریت کے نقصانات سے خود ہندی زبان و ادب کو بچا لینا اور ملک کو علاقائی لسانی ردِّ عمل کی شعلہ فشانیوں سے بہت حد تک محفوظ رکھ لینا مولانا کے تدبر و توازنِ قیادت کا زرّیں کارنامہ ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا نے ہندی کی سگی بہن اُردو کی حفاظت کے سامان کر کے خانوادۂ ہندی کو لُٹنے اور برباد ہونے سے بچا لیا۔ کاش ہمارا ملک مولانا آزاد کی راہِ قیادت پر ہوش مندی سے گذرتا چلا جائے تا آنکہ وہ اقوامِ ایشیا اور مِلَلِ عالم کے درمیان عزت، وقارِ عدل و انصاف اور احترام کا مقام حاصل کر لے!

سلامِ عقیدت مندی

جناب پروفیسر محمد سلطان وانث صاحب پروفیسر انگریزی جموں کشمیر یونیورسٹی

مولانا آزاد کی وسعت نظر اور رواداری ہندستان کی قومی تحریک کے ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اس سلسلہ میں مولانا کا رول اس لئے اور اہم ہے کہ انھوں نے متحدہ قومیت کے وسیع اور ہمہ گیر تصور کو فروغ دینے کے لئے اپنی زندگی ہی وقف کر دی ۔ سوال یہ ہے کہ مولانا کے نقطۂ نظر میں اتنی وسعت اور گہرائی کہاں سے آگئی ؟

مولانا کی ابتدائی زندگی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک مذہبی ماحول میں آنکھ کھولی اور مولانا خود بھی اوائل عمر ہی میں علوم دینی کے ماہر ہو گئے ۔ مذہب اسلام کے اصولوں اور قرآن حکیم کے گہرے مطالعہ نے مولانا کے نقطۂ نظر میں وسعت اور جامعیت پیدا کر دی اور میرا عقیدہ ہے کہ مولانا کی نظر ہمیشہ قرآن مجید کی ان تعلیمات پر مرکوز رہی جہاں پر اللہ تعالیٰ نے عالمی رواداری اور باہمی یگانگت پر زور دیا ہے مثلاً یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۔ یہ مولانا کی وسیع النظری کا ثبوت ہے کہ انھوں نے مذہب کی اصلی روح کو سمجھ لیا اور ہمیشہ قرآن کریم کی اس آیت کو اپنی سیاسی زندگی کیلئے مشعل راہ بنایا یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ یہ مولانا کی فہم و بصیرت کا نتیجہ تھا کہ وہ عمر بھر ذہنی بے ربطی سے مبرا رہے ۔ حالانکہ ایک نازک دور آیا جبکہ ہند کا ایک با اثر حلقہ ان کے عقیدے سے متفق نہ تھا لیکن مولانا اپنے نظریات میں چٹان کی طرح ثابت قدم رہے اور اپنے طرز عمل سے یہ دکھا دیا کہ وہ منافقین کی طرح بیک وقت دو راہے پر گامزن نہیں اور منافقین وہ ہیں جن کیلئے اللہ تعالیٰ کہہ چکا ہے قَالُوْۤا اِنَّا مَعَكُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۔

مولانا کی زندگی کے گوشے گوشے میں قرینہ وسلیقہ کی جلوہ گری تھی۔ رفتار وگفتار، لباس ورہائش خورد ونوش، غرض آپ کے ہر پہلو میں حسین قرینہ اور نفیس سلیقہ پایا جاتا تھا۔

مولانا کو لوگ دلی کا مغل اعظم بھی کہا کرتے تھے اور یہ بہت ہی صحیح تعریف ہے۔ دلی کے مغل اعظم جلالت ونفاست دونوں کے مالک ہوتے تھے۔ وہ مست ہاتھیوں سے لڑ بھی جاتے تھے اور کسی نازک اندام کے ہاتھوں اڑتے ہوئے کبوتر دیکھ کر نثار بھی ہو جاتے تھے۔ وہ لال قلعہ کے بانی بھی تھے اور تاج محل کے خالق بھی۔ انھیں لشکر کشی اور جہانگیری کا شوق تھا تو شعر وشاعری اور ادب وفن کا ذوق بھی۔ مولانا آزاد پر بھی یہ شعر صادق آتا ہے ؎

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

سنتا ہوں کہ بڑے بڑے صاحبان اختیار بھی مولانا کے پاس نہایت مودبانہ آتے تھے۔ اور دوسری طرف یہ کہ ایک معمولی آدمی بھی اُن سے اسی طرح مل سکتا تھا جیسے کوئی کرسی نشین وزارت۔

مولانا کی باتوں میں نہایت تاثیر تھی۔ آپ میں خطابت کی جادو بیانی کے ساتھ ساتھ عام گفتگو کی سحر کاری بھی پائی جاتی تھی سیاسی گتھیوں کو سلجھانے میں مولانا کا کوئی نظیر نہ تھا۔ سیاست سے زیادہ اس میں مولانا کی شگفتہ شستہ ورفتہ انسانیت کا دخل تھا۔ اُن کی بالیدہ انسانیت مخاطب کی انسانیت سے ہم کلام ہوتی تھی اور اُسے اپنا گرویدہ بنا لیتی تھی۔ آزاد کی انسانیت اُن کے مخالفین کو بھی رام کر لیتی تھی۔ اُن کے شدید دشمن بھی اُن کی عزت کرنے پر مجبور تھے۔

مولانا اپنے شدید دشمنوں اور سیاسی حریفوں کو بھی بہ خوشی معاف کر دیتے تھے۔ ایسے مواقع بارہا آئے کہ انھوں نے نہ صرف معاندین کو معاف ہی کیا بلکہ اُن کے ساتھ حسن سلوک بھی فرمایا۔

مختصر یہ کہ مولانا کے تفکر وتدبر، سیاست وقیادت، حسن ذوق وانسانیت کا فیض نصف صدی تک اس ملک میں عام رہا ہے اور آپ کی وفات کے بعد بھی آپ کی شخصیت مستقبل کو متاثر کرتی رہے گی لیکن ابھی تو آپ کی علٰحدگی کا غم اتنا تازہ ہے کہ سارا ہندوستان یہ محسوس کرنے پر مجبور ہے کہ ؎

ہستی ز تیش رفت واثر نیست نفس را فریاد، کزیں قافلہ بردند جرس را

قرآن فہمی کو آسان بنانے کے لئے ابتدا ہی سے اس کی تفسیریں لکھی گئیں۔ نحوی و صرفی پیچیدگیوں اور معنی و بیان کی گتھیوں کو کھولنے کی سعی کی گئی۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ ان کوششوں میں شارحین و مفسرین کے قدم کبھی کبھی ادھر اُدھر بھی پڑتے گئے اور ایسے مقامات پر ان کی تشریحات سے پیچیدگیاں گھٹی نہیں بلکہ کچھ اور بڑھ گئیں لیکن خصوصیت سے وہ تفسیریں جو متاخرین نے لکھی ہیں ان میں کج اندیشیوں اور کج خیالیوں کی افراط ہے۔ اس دور میں یونانی فلسفیوں کی کتابوں کے ترجمے ہو گئے تھے۔ عربوں نے ان کے خیالات سے واقفیت بہم پہنچائی تھی اور وہ ان کے استدلالی گورکھ دھندوں سے اچھی طرح مرعوب ہو چکے تھے۔ چنانچہ قرآن کی فطری تعلیمات کو وہ انھیں سانچوں میں ڈھالنے لگے اور اس دور میں بعض قرآنی الفاظ مثلاً حجت، برہان، تثلیث وغیرہ نے جو اصطلاحی قالب اختیار کر لیا تھا ان کی تشریح اسی رنگ میں کی جانے لگی۔ حالانکہ یہ مفہوم قرآن کے نزول کے وقت ان الفاظ کا کہیں سمجھا ہی نہیں جاتا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس سلسلہ میں بالکل صحیح فرمایا ہے:۔

"یہ آفت صرف طریق استدلال ہی میں نہیں پیش آئی بلکہ تمام گوشوں میں پھیلی۔ منطق و فلسفہ کے مباحث نے طرح طرح کی نئی مصطلحات پیدا کر دی تھیں۔ عربی لغت کے الفاظ ان مصطلحہ معانی میں مستعمل ہونے لگے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآن کا موضوع فلسفہ یونانی نہیں ہے اور نہ نزول قرآن کے وقت عربی زبان ان مصطلحات سے آشنا ہوئی تھی۔ پس جہاں کہیں قرآن میں وہ الفاظ آئے ہیں ان کے معانی وہ نہیں ہو سکتے جو وضع مصطلحات کے بعد قرار پائے لیکن اب ان کے وہی مفہوم لئے جانے لگے اور اس کی بنا پر طرح طرح کی دوراز کار بحثیں پیدا کر دی گئیں۔

"اسی تخم کے یہ بھی برگ و بار ہیں کہ سمجھا گیا کہ قرآن کو وقت کی تحقیقات علمیہ کا ساتھ دینا چاہیئے۔ چنانچہ کوشش کی گئی کہ نظام بطلیموسی اس پر چپکا دیا جائے ٹھیک اسی طرح جس طرح آج کل کے دانش فروشوں کا طریق تفسیر یہ ہے کہ موجودہ علم ہیئت کے مسائل

مولانا آزاد کی مفسّرانہ حیثیت

علامہ سیّد اختر علی تلہری

قرآن کریم کی حیثیت ایک مکمل ضابطۂ اخلاق، ایک جامع دستورِ معاشرت و تمدن کی ہے۔ اس میں انسانی زندگی کے جتنے بھی شعبے ہیں ان سب کے بارے میں ہدایتیں موجود ہیں فلاح و نجات کے راستوں کی طرف قدم قدم پر اشارے نمایاں ہیں۔ گویا قرآنِ حکیم صحیح معنوں میں موعظت کی جامع و نافع کتاب ہے۔ اپنی اس خصوصیت کو مؤثر بنانے کے لئے اُسے ایک ایسا اسلوب وضع کرنا پڑا ہے جو مستقل طریقے سے دلوں کی گہرائیوں میں اترتا چلا جائے اور ان کی بصیرتوں کو تیز کردے۔ اگرچہ اس کا لباس عربی ہے اور وحی ایزدی نے اُنھیں محاوروں اور بولوں کا روپ دھارا ہے جنھیں اس دور کے عرب استعمال کرتے تھے لیکن اس کے باوجود اس کا لہجۂ خطاب، اس کا اندازِ گفتار، اُس کا طریق استدلال واضح طور پر اسی زبان میں ترتیب دی ہوئی دوسری چیزوں سے ممتاز ہے۔ اگر اس میں صحیح رہنمائی نہ کرنے والے خیالات سے مجادلہ ہے تو اس میں خشونت نہیں، درشتی نہیں اور اس طرح وہ مجادلہ "مجادلہ حسنہ" بن گیا ہے۔ اگر کہیں خطابت کا آہنگ ہے تو اس میں بھی شیرینی اور دلآویزی ہے مگر ان خصوصیات کا حکیمانہ احساس ہر شخص کو فوراً نہیں ہوجاتا۔ غیر مادّی نگاہوں کے سامنے اُس کی موعظت کے یہ گوشے فوراً ہی نہیں آجاتے۔ اس کو بار بار پڑھنے کی ضرورت ہے اور غور سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔ جو نگاہیں منجھی ہوئی نہیں ہوتیں حقیقتیں واشگاف طریقہ سے کم ہی ان پر منکشف ہوتی ہیں۔

امام رازی نیا او قات فکری پیچیدگیاں پیدا کر دیتے ہیں مگر ان کے قرار واقعی ازالہ کی طرف سے بے نیازانہ گزر جاتے ہیں۔ اور اسی لئے ان کے متعلق یہ فقرہ علماء میں متداول ہے کہ وہ اعتراض نقد کرتے ہیں اور جواب ادھار دیتے ہیں۔ لیکن مولانا آزاد کی تفسیری کاوشوں کا رنگ ہی دوسرا ہے۔ وہ خواہ مخواہ کے لئے مسائل پیدا نہیں کرتے اور نہ غیر اہم اور دور از کار باتوں سے اپنی کتاب کا حجم بڑھاتے ہیں۔ وہ قرآن فہمی کے متعلق ضروری اور کارآمد مسائل و مباحث ہی چھیڑتے ہیں۔ لیکن جب چھیڑتے ہیں تو پھر ان کو اس حد تک پھیلانے میں جس سے حل کی منزل مل جائے کوئی پس و پیش نہیں کرتے۔ اس مقصد میں مولانا کے مطالعہ کی حیرت انگیز وسعت اُن کے ذہن کی صفائی اُن کے حافظے کی قوت۔ بیان مفاہیم و اظہار مطالب پر غیر معمولی قدرت نے انھیں خاص طور سے کامیاب کیا ہے۔

قرآن کریم نے کثیر مقامات پر تفکر و تعقل و تدبر پر زور دیا ہے اور اس کی اہمیت اس طرح واضح کی ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تفکر و تعقل اسلام کی خاص چیز ہے اور جو افراد اس سے تہی دامن ہیں وہ اسلام کی حقیقی روح سے بیگانہ ہیں۔

مولانا نے اسلام کی اس خصوصیت کو اچھی طرح اپنایا ہے اور تفسیر کے نازک و اہم مقامات کو اس کے سہارے سے اس طرح طے کیا ہے کہ اسے پڑھ کر ایمان کی جلا ہوتی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قرآنی مفاہیم میں مولانا کے تفکر و تعقل پر یونانی افکار و نظریات کی چھاپ نہیں ہے اور نہ ان کا انداز نظر مدرسانہ اور معلمانہ نوعیت کا ہے۔ وہ قرآنی مطالب صحیح کی منزل تک پہنچنے کے لئے جدید ہئیت اور جدید فلسفہ کے مزعومات کا سہارا بھی نہیں ڈھونڈتے۔ وہ قرآن کو قرآن سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن کو ہدایتوں کا سرچشمہ سمجھ کر اس میں ڈوبتے ہیں۔ اس سے معانی و حقائق کے گہرہائے بیش بہا نکال لیتے ہیں۔ عربی محاوروں اور احادیث و اقوال سلف سے غض بصر نہیں کرتے۔ شاید کہا جائے کہ ان کی تفسیر کے بیشتر مقامات "تفسیر بالرائے" کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ مولانا نے سلف کے

قرآن پر چپکائے جائیں۔"

مولانا آزاد کے سامنے تفاسیر قرآن کا یہ سب ذخیرہ تھا۔ انھوں نے اس سرمایہ کا پوری بصیرت کے ساتھ جائزہ لیا تھا۔ ان میں گوناگوں موثرات کے تحت جو نقائص مختلف گوشوں سے دخل پاگئے تھے وہ سب ان کی نگاہ میں تھے مقتضیات عصر پر ان کی نظر تھی۔ ان کا عربی کا ذوق خاصا عرب العربائی تھا۔ ان کی فطرت سلیم تھی۔ اس پر تصنع کی تہیں نہیں چڑھی تھیں۔ ان کا دماغ صحت مند اور بیدار تھا عقل رسا تھی۔ دانش و خرد کے باریک نکتوں سے ان کا حافظہ مالا مال تھا۔ قرآن کریم کے تکرار و مرات کے مطالعے نے ان میں اس کی طرف بہت زیادہ شغف پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ انہماک و شوق کے ساتھ انھوں نے قرآن مجید کے اٹھارہ پاروں کا ترجمہ اپنے مخصوص دل کش رنگ میں تحریر فرما دیا۔ اور حسب ضرورت کے مطابق کہیں مختصر اور کہیں مبسوط تفسیری حاشیے لکھے۔ مولانا کی حکیمانہ قلمی کاوشوں سے جو کچھ سرانجام پاگیا وہ سر پر رکھنے کے قابل ہے۔ اس سے تفکر کے قدم آگے بڑھے ہیں فکر و نظر کے لئے نئے نئے راستے کھلے ہیں۔ مذہبی بصیرت میں اضافہ ہوا ہے۔ اوہام پرستی اور اسرائیلیات نے مذہب کے دائرے میں جن بے سروپا افسانوں کو گھسیٹ لیا تھا اور قصہ گوئی کے ذوق نے بہت سے قدیم تاریخ کے واقعات کو جو داستانی رنگ دے دیا تھا اُس سے اسلام کا دامن صاف کر دیا۔ شافی بیانات اور مستحکم دلائل سے یونانی فلسفہ سے مرعوب مفسرین کی تاویلات کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا۔ مولانا آزاد کی یہ وہ مفسرانہ خصوصیت ہے جس میں مشکل ہی سے ان کا کوئی شریک و سہیم نکل سکتا ہے۔ متاخرین میں تفسیری مساعی کا ارتقا تفسیر کبیر کی شکل میں ظہور پذیر ہوا ہے۔ امام رازی کی دقیقہ سنجیوں اور اُن کی نکتہ آفرینیوں کا اعتراف ناگزیر ہے لیکن اس کا بیشتر حصہ ایک یونانی فیلسوف کی فکر و نظر کی کاوشوں کا مرعوب کن مظاہرہ معلوم ہوتا ہے۔ یقیناً امام المشککین کی تشکیک گستری نظر انداز نہیں کی جاسکتی مگر گتھیوں کا ڈالنا اور گتھیوں کا کھولنا دونوں کی ایک حیثیت نہیں ہوسکتی۔

بلکہ اس لئے کی جائے کہ ہماری کوئی ٹھہرائی ہوئی رائے کیا چاہتی ہے اور کس طرح قرآن کو کھینچ تان کر اس کے مطابق کر دیا جا سکتا ہے۔

"مثلاً جب باب عقائد میں رد و کد شروع ہوئی تو مختلف مذاہب کلامیہ پیدا ہو گئے۔ ہر مذہب کے مناظر نے یہ چاہا کہ اپنے مذہب پر نصوص قرآنیہ کو ڈھالے۔ وہ اس کی جستجو میں نہ تھے کہ قرآن کیا کہتا ہے بلکہ ساری کاوش اس کی تھی کہ کس طرح اسے اپنے مذہب کا موید دکھلائیں۔ اس طرح کی تفسیر "تفسیر بالرائے" تھی۔ یا مثلاً مذاہب فقہیہ کے مقلدوں میں جب تحزب و تشیع کے جذبات تیز ہوئے تو اپنے اپنے مسائل کی اتبع میں آیات قرآنیہ کو کھینچنے تاننے لگے۔ اس کی کچھ فکر نہ تھی کہ لغت عربی کے صاف صاف معانی۔ اسلوب بیان کا قدرتی مقتضاء، عقل و بصیرت کا واضح فیصلہ کیا کہتا ہے۔ تمام تر کوشش یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح قرآن کو اپنے امام کے مذہب کے مطابق کر دکھائے۔ یہ طریق تفسیر "تفسیر بالرائے" ہے یا مثلاً صوفیہ کا ایک گروہ اسرار و بطون کی جستجو میں دور تک نکل گیا اور پھر اپنے موضوعہ عقائد و مباحث پر قرآن کو ڈھالنے لگا۔ قرآن کا کوئی حکم کوئی عقیدہ کوئی بیان تحریف معنوی سے نہ بچا یہ تفسیر "تفسیر بالرائے" تھی۔ یا مثلاً قرآن کے طریق استدلال کو منطقی جامہ پہنایا جہاں کہیں آسمان اور کواکب و نجوم کے الفاظ آ گئے ہیں یونانی علم ہیئت کے مسائل چپکانے لگے یقیناً تفسیر بالرائے ہے۔

"یا مثلاً آج کل ہندوستان و مصر کے بعض مدعیان اجتہاد و نظر نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ زمانۂ حال کے اصول علم و ترقی قرآن سے ثابت کئے جائیں یا جدید تحقیقات علمیہ کا اس سے استنباط کیا جائے۔ گویا قرآن صرف اس لئے نازل ہوا ہے کہ جو بات کو پرنکیس اور نیوٹن نے یا ڈارون اور ویلس وغیرہ نے بغیر کسی الہامی کتاب کی فلسفہ اندیشیوں کے دریافت کر لی اسے چند صدی پہلے معموں کی طرح دنیا کے کان میں پھونک دے اور پھر وہ کبھی صدیوں تک دنیا کی سمجھ میں نہ آئیں یہاں تک کہ موجودہ زمانہ کے مفسر پیدا ہوں اور تیرہ سو برس بیشتر کے معمے حل فرمائیں یقیناً یہ طریق تفسیر بھی ٹھیک ٹھیک تفسیر بالرائے ہے۔"

عقائد و خیالات ملحوظ رکھے ہیں اور انھیں کی روشنی میں تفکر و تعقل کے راستے پر چلے ہیں۔ خود مولانا کا ارشاد ہے:۔

"زمانے کی بد ذوقی نے بھی ہر کج اندیشی کو سہارا دیا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرونِ اخیرہ میں درس و تداول کے لئے وہی تفسیریں مقبول ہوئیں جو قدما کے محاسن سے یک قلم خالی تھیں۔ وقت کا یہ سوء انتخاب ہر علم و فن میں جاری رہا ہے۔ جو زمانہ جُرجانی پر سکاکی کو اور سکاکی پر تفتازانی کو ترجیح دیتا تھا یقیناً اُس کے دربار سے بیضاوی و جلالین ہی کو حسنِ قبول کی سند مل سکتی تھی۔ متداول تفسیریں اٹھا کر دیکھو۔ جس مقام کی تفسیر میں متعدد اقوال موجود ہوں گے وہاں اکثر اُسی قول کو ترجیح دیں گے۔ جو سب سے زیادہ کمزور اور بے محل ہوگا۔ جو اقوال نقل کریں گے ان میں بہتر قول موجود ہوگا لیکن اُسے نظر انداز کر دیں گے۔"

ظاہر ہے ایسے خیالات رکھنے والا اپنے تفکر و تعقل کو "تفسیر بالرائے" کی آلودگیوں میں ملوث کرنے پر کبھی راضی نہیں ہو سکتا۔ بہتر ہوگا کہ خود مولانا کے خیالات "تفسیر بالرائے" کے متعلق غور سے سُن لئے جائیں۔ انھوں نے جلد اوّل ترجمان القرآن میں اصول ترجمہ و تفسیر لکھتے ہوئے صفحہ ۱۵ و ۱۶ پر ارشاد فرمایا ہے:۔

"اشکال و موانع کا بڑا دروازہ "تفسیر بالرائے" سے کھل گیا جس کے اندیشے سے صحابہؓ و سلف کی روحیں لرزتی رہتی تھیں۔ "تفسیر بالرائے" کا مطلب سمجھنے میں لوگوں کو لغزشیں ہوتی ہیں۔ "تفسیر بالرائے" کی ممانعت سے مقصود یہ نہ تھا کہ قرآن کے مطالب میں عقل و بصیرت سے کام نہ لیا جائے کیونکہ اگر یہ مطلب ہو تو پھر قرآن کا درس و مطالعہ ہی بے سود ہو جائے حالانکہ خود قرآن کا یہ حال ہے کہ اوّل سے لیکر آخر تک تعقل و تفکر کی دعوت ہے اور ہر جگہ مطالبہ کرتا ہے کہ "افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھا۔"

"دراصل "تفسیر بالرائے" میں رائے لغوی معنی میں نہیں ہے بلکہ رائے مصطلحہ شائع ہے اور اس سے مقصود ایسی تفسیر ہے جو اس کے لئے نہ کی جائے کہ خود قرآن کیا کہتا ہے،

بہت دور تک پھیلا دیا ہے۔ تفسیر کبیر مطبوعہ مصر کے تقریباً ساٹھ ستر صفحات اس سورے کی تفصیل و تشریح کے لئے وقف کئے گئے ہیں۔ مولانا آزاد نے بھی اس کی تفسیر میں کافی اطناب سے کام لیا ہے اور تقریباً دو سو صفحات اس سلسلے میں لکھے ہیں۔ انھوں نے صرفی و نحوی مسئلوں اور نکتوں کی طرف توجہ نہیں کی ہے۔ بلکہ اس کی مفہوماتی دنیا ہی کی سیر سے واسطہ رکھا ہے اور ہدایت و ارشاد و موعظت سے وابستہ مسائل ہی پر غور کیا ہے۔

حمد اور اللہ سے علمی بحث کرنے کے بعد "رُبُوبیت" کی صفت کی تشریح کی ہے۔ اُس کی جامعیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اُس کے درجات اور انواع کی وضاحت کی ہے۔ (اس ضمن میں خوب خوب داد سخن سنجی دی ہے) "رب العالمین" کی معنوی وسعتوں کو ذہن نشین کرنے کے بعد "الرحمٰن الرحیم" کی توضیح کی ہے اور رحمت کا مفہوم واضح کیا ہے اور رحمت و رأفت و مغفرت و عفو وغیرہ کی کثرتِ تکرار سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ "قرآن اول سے لیکر آخر تک اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ رحمت الٰہی کا پیام ہے"

خدا کی صفت رحمٰن اور رحیم کا ذکر کرنے کے بعد اس کا ذکر آ ہی جاتا کہ مخلوق کو خالق کی صفات سے "تشبّہ" پیدا کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ خدا رحمٰن اور رحیم ہے تو بندے میں بھی رحم اور فضل کی صفات کا موجود ہونا اس کی انسانیت کی تکمیل کے لئے ضروری ہے۔ اب یہاں پر اسلامی تعلیم پر مسیحی تعلیم کی افضلیت کا بحث چھڑ جانا ناگزیر تھا۔ مولانا نے اس مسئلے کی توضیح خاصی نکتہ رسی کے ساتھ کی ہے۔ اب اسے مولانا ہی کی زبان سے سُنئے:۔

"ہم نے قرآن کی آیات عفو و بخشش نقل کرتے ہوئے ابھی کہا ہے کہ اس نے یہ نہیں کہا کہ دشمنوں کو پیار کرو کیونکہ ایسا کہنا حقیقت نہ ہوتی مجاز ہوتا۔ ضروری ہے کہ اس کی مختصر تشریح کی جائے۔

"حضرت مسیح علیہ السلام نے یہودیوں کی ظاہر پرستیوں اور اخلاقی محرومیوں کی جگہ رحم و محبت اور عفو و بخشش کی اخلاقی قربانیوں پر زور دیا تھا اور ان کی دعوت کی اصلی روح یہی ہے۔

"تفسیر بالرائے" کے بارے میں جس مذہبی مفکر کا اتنا "متشددانہ نقطۂ نظر" ہو وہ اس خصوص میں شرعی حدود سے تجاوز کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض مقامات پر مولانا کی رائے سے اتفاق نہ کیا جا سکے اور مولانا کی بیان کردہ "تفسیر بالرائے" میں کچھ شوشے گھٹائے اور بڑھائے جا سکیں لیکن مرکزی خیال کی نوعیت میں کوئی تغیر غالباً پیدا نہ ہو سکے گا۔ مولانا آزاد کی تفسیری کاوشوں پر اگر اس نقطۂ نظر سے غور کیا جائے گا تو بہت سے علم و دانش کے نکتے حاصل ہوں گے۔

یوں تو قرآن حکیم کی ہر آیت نصائح و حکم اور مواعظ وغیرہ کا گنجینہ ہے لیکن سورہ الحمد مخصوص خصوصیتوں کا حامل ہے۔ اس میں دین حق کے تمام مقاصد کا خلاصہ موجود ہے۔ سورہ الحمد کی اس خصوصیت کی وجہ سے اس کے بہت سے نام ہیں۔ اُم القرآن اساس القرآن وغیرہ اسی خصوصیت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ عربی میں اُم کا اطلاق ان تمام چیزوں پر ہوتا ہے جن میں کسی نہ کسی قسم کی جامعیت پائی جاتی ہو یا بہت سی چیزوں میں اسے نمایاں حیثیت حاصل ہو یا پھر کوئی ایسی اوپر کی چیز ہو جس کے نیچے اس کے بہت سے توابع ہوں چنانچہ سر کے درمیانی حصے کو "اُم الراس" کہتے ہیں کیونکہ وہ دماغ کا مرکز ہے۔ فوج کے جھنڈے کو "اُم" کہتے ہیں کیونکہ تمام فوج اس کے نیچے جمع ہوتی ہے۔ مکّہ کو "اُم القریٰ" کہتے تھے کیونکہ خانۂ کعبہ اور حج کی وجہ سے عرب کی تمام آبادیوں کے جمع ہونے کی جگہ تھی اس لئے اس سورت کو ام القرآن کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ایک ایسی سورت ہے جس میں مطالب قرآنی کی جامعیت اور مرکزیت ہے یا جو قرآن کی عام سورتوں میں اپنی نمایاں اور مقدم جگہ رکھتی ہے۔ اساس القرآن کے معنی ہیں قرآن کی بنیاد۔ اس سے یہ صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس سورت میں دین حق کا اصل موجود ہے صرف اجمال اور تفصیل کا فرق ہے۔ "سورۂ الحمد" مجمل ہے اور باقی قرآن اس کے مطالب کی تفصیل۔ اس سورے کی تفسیر میں تمام مفسرین نے پورا زورِ طبع اور زورِ قلم صرف کیا ہے۔ امام رازی نے تفسیر کبیر میں اس کے مطالب کو بہت سے صرفی و نحوی اور فکری و علمی گوشوں کو

تنزل انتہائی حد تک پہنچ چکا تھا اور دل کی نیکی اور اخلاق کی پاکیزگی کی جگہ محض ظاہری احکام و رسوم کی پرستش دینداری و خدا پرستی میں سمجھی جاتی تھی۔ یہودیوں کے علاوہ جس قدر متمدن قومیں قرب و جوار میں موجود تھیں، مثلاً رومی، مصری، آشوری وہ بھی انسانی رحم و محبت کی روح سے یکسر ناآشنا تھیں۔ لوگوں نے یہ بات تو معلوم کر لی تھی کہ مجرموں کو سزائیں دینی چاہئیں لیکن اس حقیقت سے بے بہرہ تھے کہ رحم و محبت اور عفو و بخشش کی چارہ سازیوں سے مجرموں اور گناہوں کی پیدائش روک دینی چاہئے۔ انسانی قتل و ہلاکت کا تماشا دیکھنا، طرح طرح کے ہولناک طریقوں سے مجرموں کو ہلاک کرنا، زندہ انسانوں کو درندوں کے سامنے ڈال دینا، آباد شہروں کو بلا وجہ جلا کر خاکستر کر دینا، اپنی قوم کے علاوہ تمام انسانوں کو غلام سمجھنا اور غلام بنا کر رکھنا، رحم و محبت اور حلم و شفقت کی جگہ قلبی قساوت و بے رحمی پر فخر کرنا رومی تمدن کا اخلاق اور مصری اور آشوری دیوتاؤں کا پسندیدہ طریقہ تھا۔

"ضرورت تھی کہ نوع انسانی کی ہدایت کے لئے ایک ایسی ہستی مبعوث ہو جو سرتاسر رحمت و محبت کا پیام ہو، اور جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں سے قطع نظر کر کے صرف اس کی قلبی و معنوی حالت کی اصلاح و تزکیہ پر اپنی تمام پیغمبرانہ ہمت مبذول کر دے۔ چنانچہ حضرت مسیح کی شخصیت میں وہ ہستی نمودار ہو گئی۔ اس نے جسم کی جگہ روح پر، زبان کی جگہ دل پر اور ظاہر کی جگہ باطن پر نوع انسانی کو توجہ دلائی اور انسانیت اعلیٰ کا فراموش شدہ سبق تازہ کر دیا۔

"معمولی سے معمولی کلام بھی بشرطیکہ بلیغ ہو اپنی بلاغت کے مجازات رکھتا ہے۔ قدرتی طور پر اس الہامی بلاغت کے بھی مجازات تھے جو اس کی تاثیر کا زیور اور اس کی دل نشینی کی خوبروئی ہیں۔ لیکن افسوس کہ وہ دنیا جو اقانیم ثلاثہ اور کفارہ جیسے دوراز کار عقائد پیدا کر لینے والی تھی ان کے مواعظ کا مقصد و محل نہ سمجھ سکی اور مجازات کو حقیقت سمجھ کر غلط فہمیوں کا شکار ہو گئی۔

"انھوں نے جہاں کہیں یہ کہا ہے کہ "دشمنوں کو پیار کرو" تو یقیناً اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ ہر انسان کو چاہئے کہ اپنے دشمنوں کا عاشق زار ہو جائے بلکہ سیدھا سادہ مطلب یہ تھا کہ تم میں

چنانچہ ہم انجیل کے مواعظ میں جا بجا اس طرح کے خطابات پاتے ہیں "تم نے سُنا ہوگا کہ اگلوں سے کہا گیا دانت کے بدلے دانت اور آنکھ کے بدلے آنکھ لیکن میں کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا" یا "اپنے ہمسایوں ہی کو نہیں بلکہ دشمنوں کو بھی پیار کرو" یا مثلاً "اگر کوئی تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو چاہئے کہ دوسرا گال بھی آگے کر دو" سوال یہ ہے کہ ان خطابات کی نوعیت کیا تھی۔ یہ اخلاقی فضائل و ایثار کا ایک موثر پیرایۂ بیان تھا یا تشریع، یعنی قوانین وضع کرنا تھا۔ افسوس ہے کہ انجیل کے معتقدوں اور نکتہ چینوں دونوں نے یہاں ٹھوکر کھائی دونوں اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ یہ تشریع تھی اور اس لئے دونوں کو یہ تسلیم کر لینا پڑا کہ یہ نا قابلِ عمل احکام ہیں۔

" معتقدوں نے خیال کیا کہ اگرچہ ان احکام پر عمل نہیں کیا جا سکتا تاہم مسیحیت کے احکام یہی ہیں اور عملی نقطۂ خیال سے اس قدر کافی ہیں کہ اوائل عہد میں چند ولیوں اور شہیدوں نے ان پر عمل کر لیا تھا۔ نکتہ چینوں نے کہا کہ یہ سرتاسر نا قابل عمل تعلیم ہے اور کہنے میں کتنی ہی خوشنما ہو لیکن عملی نقطۂ خیال سے اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ یہ فطرت انسانی کے صریحی خلاف ہے۔ فی الحقیقت نوع انسانی کی یہ بڑی ہی دردانگیز نا انصافی ہے جو تاریخ انسانی کے اس عظیم الشان معلم کے ساتھ جائز رکھی گئی جس طرح بے درد نکتہ چینوں نے اسے سمجھنے کی کوشش نہ کی اسی طرح نادان معتقدوں نے بھی فہم و بصیرت سے انکار کر دیا۔ لیکن کیا کوئی انسان جو قرآن کی سچائی کا معترف ہو ایسا خیال کر سکتا ہے کہ حضرت مسیح کی تعلیم فطرت انسانی کے خلاف تھی اور اس لئے نا قابل عمل تھی۔

" حقیقت تو یہ ہے کہ قرآن کی تصدیق کے ساتھ ایسا منکرانہ خیال جمع نہیں ہو سکتا۔ اصل یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی ان تمام تعلیمات کی وہ نوعیت نہ تھی جو غلطی سے سمجھ لی گئی۔ اور دنیا میں ہمیشہ انسان کی سب سے بڑی گمراہی اس کے انکار سے نہیں بلکہ کج اندیشانہ اعتراف ہی سے پیدا ہوئی۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا ظہور ایک ایسے عہد میں ہوا تھا جبکہ یہودیوں کا اخلاقی

بُرائیاں روکی جاسکیں لیکن دنیا نے اسے علاج کی جگہ ایک دل پسند مشغلہ بنالیا اور رفتہ رفتہ انسان کی تعذیب و ہلاکت کا ایک خوفناک آلہ بن گئی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی قتل و غارتگری کی کوئی ہولناکی ایسی نہیں ہے جو شریعت اور قانون کے نام سے نہ کی گئی ہو۔ اور جو فی الحقیقت اسی بدلہ لینے اور سزا دینے کا ظالمانہ استعمال نہ ہو۔ اگر تاریخ سے پوچھا جائے کہ انسانی ہلاکت کی سب سے بڑی قوتیں میدان ہائے جنگ سے باہر کون کون سی رہی ہیں؟ تو یقیناً اس کی انگلیاں ان عدالت گاہوں کی طرف اُٹھ جائیں گی جو مذہب اور قانون کے ناموں سے قائم کی گئیں۔ اور جنہوں نے ہمیشہ اپنے ہم جنسوں کی تعذیب و ہلاکت کا عمل اس کی ساری وحشت انگیزیوں اور ہولناکیوں کے ساتھ جاری رکھا۔ پس اگر حضرت مسیح نے تعزیر و عقوبت کی جگہ سراسر رحم و درگزر پر زور دیا تو یہ اس لئے نہیں کہ وہ نفس تعزیر و سزا کے خلاف کوئی تشریع کرنی چاہتے تھے بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ اس ہولناک غلطی سے انسان کو نجات دلائیں جس میں تعزیر و عقوبت کے غلو نے مبتلا کر رکھا ہے۔ وہ دنیا کو بتانا چاہتے تھے کہ اعمال انسانی میں اصل رحم و محبت ہے تعزیر و انتقام نہیں ہے۔ اور اگر تعزیر و سیاست جائز رکھی گئی ہے تو صرف اس لئے کہ بطور ایک ناگزیر علاج کے عمل میں لائی جائے۔ اس لئے نہیں کہ تمہارے دل رحم و محبت کی جگہ سراسر نفرت و انتقام کا آشیانہ بن جائیں۔ قل جاءکم الحق من ربکم" گیارھویں پارے "یعتذرون" سورہ یونس میں ایک آیت ہے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۝

ترجمہ:۔ اے پیغمبر ان لوگوں سے کہہ دو کہ اے لوگو تمہارے پروردگار کی طرف سے سچائی تمہارے پاس آگئی ہے پس جو ہدایت کی راہ اختیار کرے گا تو اپنے ہی بھلے کے لئے کرے گا اور جو بھٹکے گا تو اس کی گمراہی اس کے آگے آئے گی۔ میں تم پر نگہبان نہیں ہوں کہ زبردستی کسی راہ میں کھینچ لے جاؤں اور پھر اس سے نکلنے نہ دوں۔

غیظ و غضب اور نفرت و انتقام کی جگہ رحم و محبت کا پر جوش جذبہ ہونا چاہئے اور ایسا ہونا چاہئے کہ دوست تو دوست دشمن تک کے ساتھ عفو و درگزر سے پیش آؤ۔ اس مطلب کے لئے کہ رحم کرو، بخش دو، انتقام کے پیچھے نہ پڑو، یہ ایک نہایت ہی بلیغ اور مؤثر پیرایہ بیان ہے کہ "دشمنوں تک کو پیار کرو" ایک ایسے گردو پیش میں جہاں اپنوں اور عزیزوں کے ساتھ بھی رحم و محبت کا برتاؤ نہ کیا جاتا ہو یہ کہنا کہ اپنے دشمنوں سے بھی نفرت نہ کرو، رحم و محبت کی ضرورت کا ایک اعلیٰ اور کامل ترین تخیّل پیدا کرتا تھا۔

شنیدم کہ مردانِ راہِ خدا ۔۔۔ دل دشمناں ہم نہ کردند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام ۔۔۔ کہ با دوستانت خلاف ست و جنگ

یا مثلاً اگر انھوں نے کہا:۔ "اگر تمہارے ایک گال پر کوئی طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی آگے کر دو" تو یقیناً اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ سچ مچ تم اپنا گال آگے کر دیا کرو بلکہ صریح مطلب یہ تھا کہ انتقام کی جگہ عفو و درگزر کی راہ اختیار کرو۔ بلاغت کلام کے یہ وہ مجازات ہیں جو ہر زبان میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں اور یہ ہمیشہ بڑی ہی جہالت کی بات سمجھی جاتی ہے کہ ان کے مقصود و مفہوم کی جگہ ان کے منطوق پر زور دیا جائے۔ اگر ہم اس طرح کے مجازات کو اُن کے ظواہر پر محمول کرنے لگیں گے تو نہ صرف تمام الہامی تعلیمات ہی درہم برہم ہو جائیں گی بلکہ انسان کا وہ تمام کلام جو ادب و بلاغت کے ساتھ دنیا کی تمام زبانوں میں کہا گیا ہے یک قلم مختل ہو جائے گا۔

"باقی رہی یہ بات کہ حضرت مسیح نے سزا کی جگہ محض رحم و درگزر ہی پر زور دیا تو ان کے مواعظ کی اصلی نوعیت سمجھ لینے کے بعد بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ بلاشبہ شرائع نے تعزیر و عقوبت کا حکم دیا تھا، لیکن اس لئے نہیں کہ تعزیر و عقوبت فی نفسہ کوئی مستحسن عمل ہے بلکہ اس لئے کہ معیشتِ انسانی کی بعض ناگزیر حالتوں کے لئے یہ ایک ناگزیر علاج ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ایک کم درجہ کی برائی تھی جو اس لئے گوارا کر لی گئی کہ بڑے درجہ کی

حقیقت کا اعتراف نہیں کیا۔ اور یہی بات ساری نزاعوں کی بنیاد بن گئی۔ قرآن نے پچھلی دعوتوں کی جس قدر سرگزشتیں بیان کی ہیں انھیں جا بجا پڑھو ہر جگہ دیکھو گے کہ بنائے نزاع یہی تھی۔ خدا کے رسولوں کا ہمیشہ اعلان یہی ہوا کہ ہم نصیحت کرنے والے ہیں، ماننا نہ ماننا تمھارا کام ہے۔ اگر نہیں مانتے تو تم اپنی راہ چلو اور ہمیں اپنی راہ چلنے دو اور دیکھو نتیجہ کیا نکلتا ہے لیکن ان کے منکر کہتے تھے کہ نہیں "نہ تو ہم تمھاری بات مانیں گے نہ تمھیں تمھاری راہ چلنے دیں گے" سورۃ اعراف کی آیت (۸۸) میں حضرت شعیب کی سرگزشت گذر چکی ہے جب ان کی قوم کے سرکشوں نے کہا "اگر تم اور تمھارے ساتھی ملت میں پھر لوٹ نہ آئے تو ہم ضرور تمھیں اپنی بستی سے جلاوطن کر دیں گے" تو انھوں نے جواب میں کہا:- "اولو کنا کارھین" اگر تمھارے مذہب پر ہمارا دل مطمئن نہ ہو تو کیا جبراً اسے مان لیں۔؟

"اسلام اور اس کے منکروں میں جو نزاع شروع ہوئی وہ بھی تمام تر یہی تھی قرآن کہتا تھا — میری راہ تبلیغ و تذکیر کی ہے" مخالف کہتے تھے "یہ ہماری راہ جبر و تشدد کی ہے" قرآن کہتا تھا — اگر میری بات سمجھ میں آئے تو مان لو، نہ سمجھ میں آئے تو ماننے والوں کو انکی راہ چلنے دو" وہ کہتے تھے — "ہماری بات تمھاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے تمھیں ماننی ہی چاہئیے۔ نہیں مانو گے تو جبراً منوائیں گے"

"حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے اس آیت میں اور اس کی ہم معنی آیات میں جو بات کہہ دی ہے اگر دنیا اسے سمجھ لیتی تو نوع انسانی کی وہ تمام خونریزیاں جو فکر و عمل کے اختلاف سے پیدا ہوئیں یک قلم ختم ہو جاتیں اور آجکل بھی جس قدر جھگڑے ہو رہے ہیں وہ سب ختم ہو جائیں غور کرو سارے جھگڑوں کی اصل بنا کیا ہے؟ یہی ہے کہ لوگ "تذکیر" اور "توکیل" میں فرق نہیں کرتے اور قرآن کہتا ہے دونوں میں فرق کرو۔ تذکیر کی راہ یہ ہوتی ہے کہ جو بات ٹھیک سمجھتے ہو اس کی دوسروں کو بھی ترغیب دو مگر صرف ترغیب دو اس سے آگے نہ بڑھو۔ یعنی یہ بات نہ بھول جاؤ کہ پسند کرنے نہ کرنے کا حق دوسروں کو ہے۔ تم اس کے لئے ذمہ دار

اس مقام پر تفسیری حاشیہ دیتے ہوئے قرآن مجید کی ایک اہم تعلیم کی دلنشین پیرایے میں توضیح کی گئی ہے۔ آیت کا مفہوم صاف ہے لیکن ہماری ذہنیتوں کا جو انداز ہو گیا تھا اس کا تقاضا یہی تھا کہ ایسے اہم مقام سے بھی ہم سرسری طور سے گذر جائیں لیکن مولانا کی نگاہ حقیقت شناس ایسے مقام پر جم جاتی ہے اور وہ اسے مختلف اسالیب سے سمجھاتے ہیں۔ قرآن درحقیقت موعظت وارشاد کی ایک فصیح و بلیغ کتاب ہے اور جس اخلاقی روش کی طرف مولانا اس مقام پر اشارے کر رہے ہیں وہ موعظت کی جان ہے۔ اس سے پوری انسانی زندگی بنتی اور بگڑتی ہے۔

مولانا اس ضمن میں رقم طراز ہیں:۔

"ساتھ ہی واضح کر دیا کہ داعئ حق کی حیثیت کیا ہے؟ وما انا علیکم بوکیل میں داعی ومذکر ہوں کچھ تم پر وکیل نہیں بنا دیا گیا ہوں یعنی میرا کام یہ ہے کہ نصیحت کی بات سمجھا دوں۔ یہ نہیں ہے کہ نگہبان بن کر تم پر مسلط ہو جاؤں اور سمجھوں کہ مجھے تمہاری ہدایت کی ٹھیکہ داری مل گئی ہے۔ دوسری جگہ پیغمبر اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے یہی مطلب یوں ادا کیا ہے۔ وما انت علیھم بجبار۔ تو ان لوگوں پر ایک حاکم جابر کی طرح مسلط نہیں ہے کہ جبراً و قہراً بات منوا لے نیز فرمایا "لست علیہم بمسیطر" تجھے ان لوگوں پر داروغہ بنا کر نہیں بٹھا دیا ہے کہ مانیں یا نہ مانیں لیکن تو انھیں راہ حق پر چلانے کا ذمہ دار ہو۔

"نیز جا بجا مختلف پیرایوں میں یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ پیغمبر کا مقام اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ سچائی کی پکار بلند کرنے والا ہے۔ پیام حق پہنچا دینے والا ہے نصیحت کی بات سمجھا دینے والا ہے۔ ایمان و عمل کے نتائج کی خوشخبری دیتا اور انکار و بدعملی کے نتائج سے خبردار کر دیتا ہے۔ اس سے زیادہ اس کے سر کوئی ذمہ داری نہیں۔

"غور کرو اس سے زیادہ صاف بے لاگ اور امن و سلامتی کی کوئی راہ ہو سکتی ہے۔ اگر دنیا نے دعوت حق کی یہ روح سمجھ لی ہوتی تو کیا ممکن تھا کہ کوئی انسان دوسرے انسان سے محض اختلاف اعتقاد و عمل کی بنا پر لڑتا؟ لیکن مصیبت یہ ہے کہ انسان کے ظلم و سرکشی نے کبھی اس

کے دونوں پہلوؤں کی حفاظت کی ہے اور پھر ان کی حد بندیوں کا خط کھینچ دیا ہے۔ اس نے ایک طرف تذکیر و دعوت پر زور دیا تاکہ حق کی طلب و قیام کی روح افسردہ نہ ہو دوسری طرف انسان کی شخصی آزادی بھی محفوظ کر دی کہ جبر و تشدد بے جا مداخلت نہ کر سکے حد بندی کا یہی خط ہے جو یہاں صحت و اعتدال کی حالت قائم رکھتا ہے۔ اسے اپنی جگہ سے ادھر اُدھر کر دو۔ دونوں میں سے کوئی بات ضرور غلط ہو جائے گی اگر دعوت و تذکیر کا قدم آگے بڑھے گا، اعتقاد و فکر کی شخصی آزادی باقی نہیں رہے گی۔ اگر شخصی آزادی کے مطالبہ میں بڑھ جاؤ گے، حق و عدالت کے طلب و قیام کا نظم مختل ہو جائے گا۔

"قرآن کی بہت سی باتوں کی طرح اس بات کے سمجھنے میں بھی دنیا نے بہت دیر لگائی اور تاریخ کو بارہ صدیوں تک اس بات کا انتظار کرنا پڑا کہ ایک انسان دوسرے انسان کو محض اختلاف عقائد کی بنا پر ذبح نہ کرے اور اتنی بات سمجھ لے کہ "تذکیر" اور "توکیل" میں فرق ہے۔

"اب ڈیڑھ سو برس سے یہ بات دنیا کے عقلی مسلمات میں سے سمجھی جاتی ہے لیکن اسے معلوم نہیں کہ اس کے اعلان کی تاریخ امریکہ اور فرانس کے اعلانِ حقوقِ انسانی سے شروع نہیں ہوتی ہے بلکہ اس سے بارہ سو برس پہلے شروع ہو چکی تھی۔ افسوس کہ مسلمانوں نے بھی قرآن کی یہ تعلیم پس پشت ڈال دی۔ اگر انھوں نے یہ بات نہ بھلائی ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ مختلف مذہبی فرقہ بندیاں پیدا ہوتیں اور ہر فرقہ سے دوسرا فرقہ محض اختلاف عقائد کی بنا پر دست و گریباں ہو جاتا۔"

مسئلہ "تذکیر" اور "توکیل" کے بارے میں مولانا کے خیالات انھیں کی زبان میں بسط و تفصیل سے نقل کر دیے گئے ہیں۔ ان سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام کا نقطۂ نظر حقیقتہً ان بنیادی مسائل میں کس قدر امن پسندانہ اور صلح جویانہ ہے۔ عام مفسر ان پہلوؤں پر زور اس لئے نہیں دیتے کہ بعد والے مسلمان بادشاہوں نے جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا اور تسخیر ممالک کے لئے جس روش پر

نہیں ہو "تو کیل" یہ ہوئی کہ ڈنڈا لے کر کھڑے ہو جاؤ اور جو کوئی تم سے متفق نہ ہو اس کے پیچھے پڑ جاؤ۔ گویا خدا نے تمھیں لوگوں کی ہدایت و گمراہی کا ٹھیکہ دار بنا دیا ہے۔

جب قرآن صاف صاف کہتا ہے کہ خدا کے رسولوں کا منصب بھی تذکیر و تبلیغ کے اندر محدود تھا حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے مامور تھے تو پھر ظاہر ہے کسی دوسرے انسان کے لئے کب گوارا کر سکتا ہے کہ "وکیل" "مسیطر" اور "جبار" بن جائے! دراصل اعمال انسانی کے تمام گوشوں میں اصلی سوال حدود ہی کا ہے اور ہر جگہ انسان نے اسی میں ٹھوکر کھائی ہے یعنی ہر بات کی جو حد ہے اس کے اندر نہیں رہنا چاہتا۔ دو حق ہیں اور دونوں کو اپنی اپنی حدوں کے اندر رہنا چاہئے ایک حق تذکیر و تبلیغ کا ہے ایک پسند و قبولیت کا ہے۔ ہر انسان کو اس کا حق ہے کہ جس بات کو درست سمجھتا ہے اسے دوسروں کو بھی سمجھائے لیکن اس کا حق نہیں ہے کہ دوسروں کے حق سے انکار کر دے یعنی یہ بات بھلا دے کہ جس طرح اسے ایک بات کے ماننے نہ ماننے کا حق ہے ویسا ہی دوسرے کو بھی ماننے نہ ماننے کا حق ہے ایک فرد دوسرے کے لئے ذمہ دار نہیں۔

"ہم نے یہاں جس بات کو "حق" سے تعبیر کیا ہے قرآن اسے ہر انسان کا "فرض" قرار دیتا ہے یعنی وہ کہتا ہے جس بات کو تم سچ سمجھتے ہو تمہارا فرض ہے کہ اسے دوسروں تک بھی پہنچاؤ۔ اگر اس میں کوتاہی کرو گے تو خدا کے آگے جواب دہ ہو گے لیکن ساتھ ہی یاد رکھو کہ فرض تذکیر و تبلیغ کا ہے توکیل و جباری کا نہیں ہے اور جواب دہی اس میں ہے کہ تم نے تبلیغ کی یا نہیں کی، اس میں نہیں ہے کہ دوسروں نے مانا یا نہیں مانا۔ سورۂ اعراف کی آیت ۱۶۴ پڑھ چکے ہو کہ جو لوگ اصحاب سبت کو نصیحت کرتے تھے انھوں نے کہا تھا "معذرۃً الی ربکم ولعلھم یتقون" ہم جانتے ہیں کہ ان لوگوں کی سرکشی حد سے گذر چکی ہے۔ لیکن یہ جاننے پر بھی نصیحت کئے جاتے ہیں تاکہ خدا کے سامنے کہہ سکیں، ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا اور اس خیال سے بھی کہ کون جانتا ہے، شاید باز آجائیں۔ غور کرو قرآن نے کس درجہ صحت و عدالت کے ساتھ معاملہ

کے ، مونہ بحیثیت ایک مفسر کے جب سے غور کرنا شروع کیا ان کی کسی تحریر سے اس خیال کی تائید نہیں ملتی ۔ مولانا کا تفسیر قرآن میں جو انداز نظر آرہا ہے اسے جب پیش نظر رکھا جاتا ہے تو کہیں سے ان کے نظریات کے چوکھٹے میں اعظمی صاحب کے اس دعوے کی گنجائش نہیں نکلتی۔

اپنی تفسیر میں مولانا نے صاف صاف یہ فرمایا ہے ." بلاشبہ مردوں نے اپنی ظالمانہ خود غرضیوں سے عورتوں کے بارے میں ہمیشہ ایسے ہی فیصلے کئے ہیں لیکن قرآن کا یہ فیصلہ نہیں ہے اس نے ہر جگہ مرد اور عورت دونوں کا مساویانہ حیثیت سے ذکر کیا ہے اور فضائل و خصائل کے لحاظ سے وہ دونوں میں کسی طرح کی تفریق نہیں کرتا" مولانا نے اس اہم مسئلہ پر صرف اجمالی حیثیت ہی سے اظہار رائے نہیں کیا ہے بلکہ جلد اوّل ترجمان القرآن کے صفحہ ۳۰۹ پر آیت ۲۲۸ پہ نوٹ دیتے ہوئے اس کے تمام اطراف وجوانب پر نظر کی ہے اور پھر اپنی رائے ظاہر کی ہے ۔ یہاں اس حصہ کو تفصیل سے نقل کیا جارہا ہے ۔

"ساتویں صدی مسیحی میں جب اسلام کا ظہور ہوا تو دنیا اس حقیقت سے یکسر نا آشنا تھی کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کے بھی کچھ حقوق ہو سکتے ہیں ۔ منو کے قانون نے عورت کی ہستی صرف اس شکل میں دیکھی تھی کہ وہ مرد کے لئے پیدائش اولاد کا ذریعہ ہے اور اس کی نجات اس پر موقوف ہے کہ مرد کی خدمت گذاری میں اپنی زندگی فنا کر دے ۔ یہودی قانون عورت کو مرد کی جائداد تصور کرتا تھا اور خاندانی زندگی میں اس کی کوئی مستقل حیثیت نہ تھی ۔ مسیحی کلیسا کا فیصلہ یہ تھا کہ انسان ہونے کے لحاظ سے مرد اور عورت یکساں نہیں ہیں ۔ انسان صرف مرد ہے اور عورت میں انسانی روح کی جگہ ایک دوسری روح بولتی ہے ۔ رومی قانون نے بھی جو یورپ کے تمام قوانین عامہ کا ابتدائی سرچشمہ ہے ، عورت کی جگہ مرد سے بدرجہا نیچے دیکھی ۔ خاندانی زندگی میں صرف باپ بھائی شوہر اور بیٹے

چلنے لگے تھے اس سے اسلام کا اصلی مقصد نگاہوں سے بڑی حد تک اوجھل ہو گیا تھا۔ اسلام کے مقصد اور مسلمان بادشاہوں کے اصلی مقصد میں خلط ملط نے مسلمانوں کے ذہن صاف نہیں رہنے دیے تھے اور صحیح مقامات پر زور دینے کی اہمیت اُن سے سلب کر لی تھی۔ مولانا نے انھیں مقامات پر پوری قوت بیان کے ساتھ زور دیا اور اسلامی نقطۂ نظر کی قد آدم تصویر قرآن کریم کی روشنی میں دنیا کے سامنے پیش کر دی۔ مولانا کی یہی وہ مفسرانہ خصوصیت ہے جس نے اُن کی تفسیر میں غیر معمولی انفرادیت پیدا کر دی ہے۔

عورت اور مرد کی جنسی مساوات

۲۶ مئی ۱۹۵۸ء کے قومی آواز لکھنؤ میں ابوعلی اعظمی صاحب کا ایک مقالہ "مولانا ابوالکلام آزاد اور شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ" کے عنوان سے شایع ہوا ہے۔ اعظمی صاحب نے اس مضمون میں ایک جگہ یہ تحریر فرمایا ہے "الندوہ کے دوران ادارت میں ان کے قلم کی دو تین تحریروں نے بڑی شہرت حاصل کی اور ندوہ کے حلقہ کے تمام ارباب علم و ادب کو انھوں نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ایک مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم اور یورپ" ان کا الندوہ میں پہلا مضمون تھا۔ دوسری ندوۃ العلما کے اجلاس بنارس کی روداد اور تیسری مصر کے مشہور ادیب قاسم امین اور فرید وجدی کی کتاب "المراۃ المسلمہ" کا ترجمہ۔ ترجمہ تو محض نام ہی کو تھا لیکن درحقیقت انھوں نے اس کے موضوع کو پورے طور پر اپنا لیا تھا اور بالکل اپنے رنگ میں لکھا تھا جس میں مولانا نے دکھایا تھا کہ کسی اعتبار سے بھی عورت مرد کے برابر نہیں ہو سکتی۔ دونوں کی مساوات اور برابری کا دعویٰ بالکل غلط اور خلاف فطرت ہے" "المراۃ المسلمہ" کا متذکرہ ترجمہ میری نظر سے نہیں گذرا ہے لیکن اعظمی صاحب کی منقولہ بالا عبارت سے کچھ ایسا مترشح ہوتا ہے کہ خود مولانا آزاد کا یہ خیال تھا کہ کسی اعتبار سے بھی عورت مرد کے برابر نہیں ہو سکتی اور دونوں کی مساوات اور برابری کا دعویٰ بالکل غلط اور خلاف فطرت ہے۔ ممکن ہے اُس زمانہ میں مولانا کا یہ خیال ہو لیکن انھوں نے قرآن مجید

اور ماضیت پر غور کرو۔ زندگی و معاشرت کی کون سی بات ہے جو ان چار لفظوں میں نہیں آگئی اور کون سا رخنہ ہے جو بند نہیں کر دیا گیا۔

" البتہ آگے چل کر یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ باوجود حقوق کی برابری کے ایک خاص درجہ مرد کے لئے ماننا پڑتا ہے۔

" وللرجال علیهن درجه (۲۲۹ ۱۲) البتہ عورتوں کے مقابلہ میں مردوں کو ایک خاص درجہ ضرور حاصل ہوا ہے۔ اس خاص درجہ سے مقصود کون سا درجہ ہے" اس کا جواب سورۂ نساء میں ہمیں مل جاتا ہے۔

" الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضهم علی بعض و بما انفقوا من اموالهم" مرد عورتوں کے لئے کارفرما ہوئے اس لئے کہ اللہ نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی اور اس لئے کہ مرد اپنا مال جو ان کی محنت سے جمع ہوتا ہے عورتوں پر خرچ کرتے ہیں یعنی خاندانی زندگی کا نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر کوئی فرد اس کا قوام یعنی بندوبست کرنے والا نہ ہو تو یہ قوام ہستی کس کی ہوئی؟ شوہر کی یا بیوی کی؟ قرآن کہتا ہے خاندانی زندگی کا نظام اس طرح چل رہا ہے کہ قوام ہستی کی جگہ شوہر کی ہوئی۔ بس اتنا ہی امتیاز ہے جو مرد کو عورت کے مقابلہ میں حاصل ہے بشرطیکہ اس انتظامی ذمہ داری کو جو سرتاسر ایک بوجھ ہے وجہ امتیاز خیال کر لیا جائے۔

" یہ ظاہر ہے کہ اس امتیاز سے مرد کو کوئی پیدائشی امتیاز حاصل نہیں ہو جاتا۔ محض خاندانی نظام کا ایک خاص ڈھنگ ہے جس نے یہ جگہ اسے دلا دی ہے۔ فرض کرو متمدن انسانوں کا خاندانی نظام اس طرح چلنے لگتا کہ انتظام معیشت کی باگ مرد کی جگہ عورت کے ہاتھ آجاتی تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں یہ امتیاز مرد کو نہیں ملتا۔ عورت کے حصہ میں آتا۔

جہاں تک معیشتی اور مالیاتی استقلال کا تعلق ہے قرآن نے اس سے صاف انکار

کی حیثیتیں نمایاں ہوتی تھیں۔ ماں بہن بیوی اور بیٹی کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ جب کبھی انسان کا لفظ بولا جاتا تھا تو اس کا مخاطب مرد ہی کو سمجھا جاتا تھا۔ عورت مرد کے سایے میں جگہ پا سکتی تھی مگر اس کے ساتھ کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔

"یہودی اور مسیحی تصور نے "پیدائشی گناہ" کے عقیدے کا سارا بوجھ عورت کے سر ڈال دیا تھا۔ آدم کی لغزش کا باعث حوا ہوئی۔ اس لئے گناہ کا پہلا بیج عورت کے ہاتھوں پڑا اور وہی مرد کی گمراہی کے لئے شیطان کا آلۂ کار بنی تھی۔ اب ہمیشہ عورت کی ہستی میں گناہ کی دعوت ابھرتی رہے گی۔

"دماغی اور معاشرتی زندگی کے دائروں کی طرح مذہبی زندگی کے دائرے میں بھی عورت مرد کی ہمسر نہ ہو سکی گویا انسانوں کی طرح خدا کا فیصلہ بھی اس کے خلاف گیا تھا۔ لیکن قرآن نے صرف عورتوں کے حقوق کا اعتقاد ہی پیدا نہیں کیا بلکہ صاف صاف اعلان کر دیا کہ حقوق کے اعتبار سے دونوں کا درجہ ایک ہے جس طرح مرد کے حقوق عورت پر ہوئے ٹھیک اسی طرح عورت کے حقوق بھی مرد پر ہوئے۔

"ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف (۲۲۸:۲) اور حسن سلوک میں بیوی کے حقوق بھی اسی طرح شوہروں پر ہے جس طرح شوہروں کے بیویوں پر ہوئے۔ یعنی جس طرح عورتوں کو دینا ہے۔ اسی طرح لینا بھی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ مرد اپنے حقوق کا تو عورت سے مطالبہ کرے لیکن عورت کا حق بھلا دے۔ اگر عورت مرد کے حقوق کی مقروض ہے تو اسی طرح مرد بھی عورت کے حقوق کا مقروض ہے۔

"قرآن نے یہ چار لفظ کہہ کر لھن مثل الذی علیھن انسان کی معاشرتی زندگی کے سب سے بڑے انقلاب کا اعلان کر دیا تھا۔ ان چار لفظوں نے عورت کو وہ سب کچھ دے دیا جو اس کا حق تھا مگر جو اسے کبھی نہیں ملا تھا۔ ان لفظوں نے اسے محرومی و شقاوت کی خاک سے اٹھایا اور عزت و مساوات کے تخت پر بٹھایا۔ پھر اس اسلوب بیان کی جامعیت

والمومنات .... وغیرہ وغیرہ

"یورپ میں آج تک عورت اپنے ذاتی نام سے اپنی شخصیت نمایاں نہیں کر سکتی جب تک شادی نہیں ہوتی۔ مس ٹامسن ہے جب شادی ہو گئی تو مسز جونس ہو گئی یعنی خود اس کی شخصیت کوئی مستقل انفرادیت نہیں رکھتی ہے۔ لیکن مسلمانوں کی معاشرتی تہذیب میں کبھی ایسا نامنصفانہ تخیل پیدا نہیں ہوا۔"

"عورتوں کی تنقیص کے سلسلے میں عام طور سے یہ قرآنی آیت پیش کی جاتی ہے :—

"اِنّ کیدکن عظیم" تمہارے یعنی عورتوں کے مکر بہت ہی بڑے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو صنف اپنی صنفی خصوصیت کے لحاظ ہی سے حیلہ گر اور مکار ہے اس کی نفسی پستی کے اظہار کے لئے کسی اور سہارے کی حاجت نہیں ہے۔ عام مفسرین نے اس کا یہی مطلب قرار دے لیا ہے اور پھر دور تک بھکتے چلے گئے ہیں لیکن مولانا آزاد کی نکتہ شناس نگاہ اصل حقیقت کی تہہ تک پہنچ جاتی ہے اور وہ اس کے متعلق سورہ یوسف کی تشریح کے ذیل میں ارشاد فرماتے ہیں۔

"عزیز کے اس قول میں کہ "ان کیدکن عظیم" میں جو رائے ظاہر کی گئی ہے ظاہر ہے کہ اپنے وقت اور اپنے شہر کی عورتوں کی نسبت تھے نہ کہ دنیا جہاں کی تمام عورتوں کے لئے اور پھر جو کچھ بھی ہے عزیز کا قول ہے۔ خود قرآن کا حکم نہیں ہو۔ لیکن افسوس ہے کہ لوگوں نے اس مقولے کا اس طرح استعمال شروع کر دیا گویا عورتوں کی جنسی اخلاق کے لئے یہ قرآن کا فیصلہ ہو اور اس کے نزدیک عورتوں کی جنس مردوں کے مقابلے میں زیادہ مکار اور بے عصمتی کی گھاتیں نکالنے میں زیادہ ہشیار ہے۔ بلاشبہ مردوں نے اپنی ظالمانہ خود غرضیوں سے عورتوں کے بارے میں ہمیشہ ایسے ہی فیصلے کئے ہیں لیکن قرآن کا یہ فیصلہ نہیں ہے۔"

عورتوں کی پستی اور فطری نقائص کے بارے میں کوئی شخص کتنی ہی سخت

کر دیا کہ یہ استقلال صرف مردوں ہی کے حصہ میں آیا ہے۔ اس نے قطعی لفظوں میں اعلان کر دیا کہ مرد کی کمائی مرد کے لئے ہوگی۔ عورت کی کمائی عورت کے لئے۔ عورت بیٹی ہو کر باپ سے الگ، بہن ہو کر بھائی سے الگ، بیوی ہو کر شوہر سے الگ مستقلاً اپنی کمائی کا انتظام کر سکتی ہے اور اس کی مالک ہو سکتی ہے۔

" للرجال نصیبٌ مما اکتسبوا وللنساء نصیبٌ مما اکتسبن ۔ مردوں نے جو کچھ کمائی کی اس میں ان کا حصہ ہوا۔ عورتوں نے جو کچھ کمائی کی اس میں ان کا حصہ ہوا۔

" ان تمام تصریحات سے معلوم ہوا کہ جہاں تک جنسی درجہ اور حقوق کا تعلق ہے قرآن کے نزدیک دونوں جنسیں برابر ہیں۔ البتہ معیشت کی فراہمی کا کام نظام معاشرت نے مردوں کے سر ڈال دیا ہے۔ اسی کو وہ ایک خاص درجہ سے تعبیر کرتا ہے۔ اصلاً یہ ایک طرح کا باہمی تقسیم عمل ہے۔ مرد کماتا ہے عورت خرچ کرتی ہے۔

" قرآن کے تمام مخاطبات عام ہیں۔ وہ جب کبھی یا ایہا الناس اور یا ایہا الذین آمنوا کہتا ہے تو یکساں طور پر دونوں جنسوں کو مخاطب کرتا ہے۔ اس نے مذہبی اعمال میں امتیاز کی کوئی لکیر ایسی نہیں کھینچی جسے عورت عبور نہ کر سکتی ہو۔ تمام اعمال و طاعات یکساں طور پر دونوں کے لئے ہوئے اور دینی فضیلتوں کے تمام مدارج بھی یکساں طور پر دونوں کے حصہ میں آئے۔ انسان ان دونوں نصف ٹکڑوں کے ملنے سے انسان ہے۔ ایک نصف دوسرے نصف سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ "تو کمتر ہے" میں بہتر ہوں۔

خطبات اور بیانات میں آج کل یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ جب کبھی معاشرت و جمعیت کے اعتبار سے لوگوں کا ذکر کیا جائے تو مرد اور عورت دونوں کو یاد کر لیا جائے۔ مثلاً یہ کہیں گے ہر مرد اور عورت کا یہ فرض ہے یا قوم ہر مرد اور عورت سے یہ امید رکھتی ہے۔ ہر ایسا بیان جو اس تصریح سے خالی ہو ناقص بیان سمجھا جاتا ہے لیکن قرآن نے آج سے تیرہ سو برس پہلے یہی اسلوب بیان اختیار کیا تھا۔ ان المسلمین والمسلمات والمومنین

میں غیر ضروری تفصیل نہیں ہے۔ اجمال ہے لیکن جو کچھ ہے اس میں سچائی ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ مفسرین نے اس اجمال کو ان جزئیات پر پھیلا دیا ہے جن کی حیثیت بیشتر غیر تحقیقی اور افسانوی ہے اور اپنی اس غلط روش سے قرآن مجید کو مخالفین کے مختلف اعتراضات کا نشانہ بنا رکھا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تفسیر کو مفسرین کی اس عام غلطی سے بچانے کی سعی کی ہے۔ انھوں نے واقعات کی تفصیل میں تاریخ کے مقتضیات کو پورے طور سے ملحوظ رکھا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مولانا آزاد مرحوم کی بیان کردہ تفصیلات سے قرآن کریم کی سچائی کا نقش بیشتر دلوں پر گہرے طور سے ثبت ہو جاتا ہے۔

اصحاب کہف کا واقعہ اس سلسلے میں مثال کے طور سے پیش کیا جا رہا ہے[1]۔ عام مفسرین نے اسے بڑی بڑی رنگ آمیزیوں کے ساتھ لکھا ہے۔ مولانا کا بیان اس خصوص میں حسب ذیل ہے:-

---

[1] اصحاب کہف کا تفصیلی تذکرہ پندرھویں پارے سبحٰن الذی، سورۂ کہف میں ہے۔ مولانا کے نقاط بحث کے ذہن نشین کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا متن سامنے رکھا جائے۔ أم حسبت أن أصحٰب الكهف والرقيم كانوا من ءايٰتنا عجبًا۔ إذ أوى الفتية إلى الكهف فقالوا ربنا ءاتنا من لدنك رحمةً وهيّئ لنا من أمرنا رشدًا۔ فضربنا على ءاذانهم في الكهف سنين عددًا۔ ثم بعثنٰهم لنعلم أي الحزبين أحصى لما لبثوا أمدًا۔ نحن نقص عليك نبأهم بالحق۔ إنهم فتيةٌ ءامنوا بربهم وزدنٰهم هدًى۔ وربطنا على قلوبهم إذ قاموا فقالوا ربنا رب السمٰوٰت والأرض لن ندعوا من دونه إلٰهًا لقد قلنا إذًا شططًا۔ هٰؤلاء قومنا اتخذوا من دونه ءالهةً لولا يأتون عليهم بسلطٰنٍ بيّنٍ۔ فمن أظلم ممن افترى على الله كذبًا۔ وإذ اعتزلتموهم وما يعبدون إلا الله فأوۥا إلى الكهف ينشر لكم ربكم مرفقًا۔ وترى الشمس

رائے رکھتا ہو لیکن اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہوگا کہ عزیز کے قول کو قرآنی فیصلہ آخر کس استدلال کی بنا پر قرار دیا جا سکتا ہے۔

حقیقۃً مولانا آزاد مرحوم عورت اور مرد میں جنسی تفریق کے قائل نہیں ہیں اور وہ اس نتیجہ تک قرآنی آیات پر تفکر و تدبّر کے بعد پہنچے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ انھیں عورت و مرد میں مطلق مساوات کا قائل مانا جائے۔ وہ اسے تسلیم کرتے ہیں اور کیوں نہ تسلیم کریں جبکہ خود قرآن حکیم اسے صاف صاف کہہ رہا ہے کہ عورتوں پر مردوں کو "قوّامیت" کا حق حاصل ہے یعنی ان کی دیکھ بھال اور نگرانی کا اہم فریضہ خصوصی طور سے مردوں پر عاید کیا گیا ہے لیکن مولانا اس کے ساتھ اس پر بھی زور دیتے رہے ہیں کہ اس امتیاز سے مرد کو کوئی پیدائشی امتیاز حاصل نہیں ہو جاتا۔ یہ محض خاندانی نظام کا ایک خاص ڈھنگ ہے جس نے یہ جگہ اسے دلا دی ہے۔ فرض کرو متمدّن انسانوں کا خاندانی نظام اس طرح چلنے لگتا کہ انتظام معیشت کی باگ مرد کی جگہ عورت کے ہاتھ میں آ جاتی تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں یہ امتیاز مرد کو نہیں ملتا عورت کے حصے میں آتا۔ ممکن ہے مولانا کی اس تشریح سے جو قوامیت کے متعلق پیش کی گئی ہے مفکرین کا کوئی طبقہ اتفاق نہ کر سکے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ مولانا کی اس تاویل سے انحراف کرنے کے لئے غور و فکر کے بہت سے لمحے صرف کرنا ہوں گے۔

اصحاب کہف کا واقعہ

قرآن مجید میں اُمم ماضیہ اور اولین و سابقین کے بارے میں بہت سے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ ان واقعات کے تذکرے سے قرآن مجید کا مدعا اپنے مخاطبین کے سامنے نصائح و عِبَر کی کتاب کھول کر پیش کرنا ہے۔

تاریخ کے بارے میں کوئی مرتب بیان دینا نہیں ہے۔ اسی لیے اُس کے بیانات

جسے تورات میں "راقیم" کہا گیا ہے اور یہ فی الحقیقت ایک شہر کا نام تھا جو آگے چل کر پیٹرا کے نام سے مشہور ہوا اور عرب اسے بطرا کہنے لگے۔ عالمگیر جنگ کے بعد آثار قدیم کی تحقیقات کے جو نئے گوشے کھلے ہیں ان میں ایک پیٹرا بھی ہے اور ان کے انکشافات نے بحث ونظر کے لیے ایک نیا میدان مہیا کر دیا ہے۔

"جزیرہ نمائے سینا اور خلیج عقبہ سے سیدھے شمال کی طرف بڑھیں تو دو پہاڑی سلسلے متوازی شروع ہو جاتے ہیں اور سطح زمین بلندی کی طرف اٹھنے لگتی ہے۔ یہ علاقہ نبطی قبائل کا تھا اور اسی کی ایک پہاڑی سطح پر "راقیم" نامی شہر آباد تھا۔ دوسری صدی عیسوی میں جب رومیوں نے شام اور فلسطین کا الحاق کر لیا تو یہاں کے دوسرے شہروں کی طرح "راقیم" نے بھی ایک رومی آبادی کی حیثیت اختیار کر لی اور یہی زمانہ ہے جب پیٹر کے نام سے اس کے عظیم الشان مندروں اور تھیٹروں کی شہرت دور دور تک پہنچی سنہ ۲۴۰ء میں

سیجداً سیقولون ثلثۃ رابعھم کلبھم ویقولون خمسۃ سادسھم کلبھم رجماً بالغیب ویقولون سبعۃ وثامنھم کلبھم قل ربی اعلم بعدتھم ما یعلمھم الا قلیل فلا تمار فیھم الا مرآء ظاھراً ولا تستفت فیھم منھم احداً ۝ ولا تقولن لشای انی فاعل ذالک غداً الا ان یشآء اللہ واذکر ربک اذا نسیت وقل عسی ان یھدین ربی لاقرب من ھذا رشداً ولبثوا فی کھفھم ثلث مائۃ سنین وازدادوا تسعاً قل اللہ اعلم بما لبثوا لہ غیب السموت والارض ۝ ترجمہ:- اے پیغمبر کیا تو خیال کرتا ہے کہ غار اور رقیم والے ہماری نشانیوں میں سے کوئی عجیب نشانی تھے جب ایسا ہوا تھا کہ چند جوان غار میں جا بیٹھے تھے اور انھوں نے دعا کی تھی۔ پروردگار تیرے حضور سے ہم پر رحمت ہو اور تو ہمارے اس کام کے لیے کامیابی کا سامان مہیا کر دے۔ پس غار میں کئی برسوں تک ہم نے اُن کے کان دنیا کی طرف سے بند کر رکھے پھر انھیں اٹھا کھڑا کیا تاکہ واضح ہو جائے دونوں جماعتوں میں سے کون ہے جو گذری ہوئی مدت کا زیادہ بہتر طریقہ پر احاطہ کر سکتا ہے۔ اے پیغمبر ہم ان لوگوں

"مسیحی مذہب کے ابتدائی قرنوں میں متعدد واقعات ایسے گزرے ہیں کہ عیسائیوں نے مخالفوں کے ظلم و وحشت سے عاجز آکر پہاڑوں کے غار میں پناہ لی اور آبادیوں سے کنارہ کش ہو گئے۔ یہاں تک کہ وہیں وفات پا گئے اور ایک عرصے کے بعد نعشیں برآمد ہوئیں۔ چنانچہ ایک واقعہ خود روم کے اطراف میں گذرا تھا۔ ایک انطاکیہ کی طرف منسوب ہے۔ ایک افسس میں بیان کیا جاتا ہے۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سورت میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ کہاں پیش آیا تھا۔ قرآن نے "کہف" کے ساتھ "الرقیم" کا لفظ بھی بولا ہے اور بعض ائمہ تابعین نے اس کا یہی مطلب سمجھا تھا کہ یہ ایک شہر کا نام ہے لیکن چونکہ اس نام کا کوئی شہر عام طور پر مشہور نہ تھا اس لئے اکثر مفسر اس طرف چلے گئے کہ یہاں رقیم کے معنی کتابت کے ہیں یعنی ان کے غار پر کوئی کتبہ لگا دیا گیا تھا اس لئے کتبہ والے مشہور ہو گئے۔ لیکن اگر انھوں نے تورات کی طرف رجوع کیا ہوتا تو معلوم ہو جاتا کہ "رقیم" وہی لفظ ہے

اذا طلعت تزاور عن كهفهم ذات اليمين واذا غربت تقرضهم ذات الشمال وهم في فجوة منه ذلك من آيات الله من يهد الله فهو المهتد ومن يضلل فلن تجد له وليا مرشدا۔ وتحسبهم ايقاظا وهم رقود ونقلبهم ذات اليمين وذات الشمال وكلبهم باسط ذراعيه بالوصيد لو اطلعت عليهم لوليت منهم فرارا ولملئت منهم رعبا۔ وكذلك بعثناهم ليتساءلوا بينهم قال قائل منهم كم لبثتم قالوا لبثنا يوما او بعض يوم قالوا ربكم اعلم بما لبثتم فابعثوا احدكم بورقكم هذه الى المدينة فلينظر ايها ازكى طعاما فلياتكم برزق منه وليتلطف ولا يشعرن بكم احدا۔ انهم ان يظهروا عليكم يرجموكم او يعيدوكم في ملتهم ولن تفلحوا اذا ابدا وكذلك اعثرنا عليهم ليعلموا ان وعد الله حق وان الساعة لا ريب فيها اذ يتنازعون بينهم امرهم فقالوا ابنوا عليهم بنيانا۔ ربهم اعلم بهم قال الذين غلبوا على امرهم لنتخذن عليهم

ایک شہر موجود تھا تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ رقیم کے معنی میں تکلفات کئے جائیں اور بغیر کسی بنیاد کے اسے کتبہ پر محمول کیا جائے۔

"علاوہ بریں دوسرے قرائن بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔ قرآن نے جس طرح اس واقعہ کا ذکر کیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کی عرب میں شہرت تھی۔ لوگ اس بارے میں بحثیں کیا کرتے تھے اور اسے ایک نہایت ہی عجیب و غریب بات تصور کرتے تھے۔

"اب یہ ظاہر ہے کہ مشرکین عرب کے وسائل معلومات محدود تھے۔ بہت کم امکان ہے کہ دور کی باتیں اُن کے علم میں آئی ہوں۔ پس ضروری ہے کہ یہ قرب و جوار ہی کی کوئی بات ہو اور ان لوگوں کی زبانی سنی جا سکے جن سے ہمیشہ عربوں کا ملنا جلنا رہتا ہو۔ ایسے لوگ کون ہو سکتے تھے۔ اگر اسے پیٹرا کا واقعہ قرار دیا جائے تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اول تو خود یہ مقام عرب سے قریب تھا یعنی عرب کی سرحد سے ساٹھ ستر میل کے فاصلے پر۔

جس کسی پر وہ راہ کھول دے تو وہی راہ پر ہے اور جس پر گم کر دے تو تم کسی کو اس کا کارساز نہ پاؤ گے۔ اور تم انہیں دیکھو تو خیال کرو یہ جاگ رہے ہیں حالانکہ وہ سو رہے ہیں۔ ہم انہیں داہنے بائیں پلٹتے رہتے ہیں اور اُن کا کتا چوکھٹ کی جگہ اپنے دونوں بازو پھیلائے بیٹھا ہے۔ اگر تم انہیں جھانک کر دیکھو تو اُلٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہو اور تم پر (اُن کے منظر سے) دہشت چھا جائے اور اسی طرح یہ بات ہوئی کہ ہم نے انہیں پھر اُٹھا کھڑا کیا تاکہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھ گچھ کریں۔ اُن میں سے ایک کہنے والے نے کہا "ہم یہاں کتنی دیر تک رہے ہوں گے سب نے کہا ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ۔ پھر بولے ہمارا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنی دیر تک یہاں پڑے رہے ہیں۔ اچھا ایک آدمی کو یہ سکہ دے کر شہر میں بھیجو جا کر دیکھے کس کے یہاں اچھا کھانا ملتا ہے۔ اور جہاں کہیں سے ملے تھوڑی بہت غذا لے آئے اور چپکے سے لائے کسی کو ہماری خبر نہ ہونے پائے۔ اگر لوگوں نے خبر پالی تو وہ چھوڑنے والے نہیں۔ یا تو سنگسار کریں گے یا مجبور کریں گے کہ پھر اُن کے دین میں واپس چلے جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو پھر کبھی تم فلاح نہ پا سکو گے۔ اور اسی طرح یہ بات بھی ہوئی کہ ہم نے لوگوں کو اُن کے حال سے واقف کر دیا اور اس لیے واقف کر دیا کہ لوگ جان لیں اللہ کا وعدہ سچا ہے

جب مسلمانوں نے یہ علاقہ فتح کیا تو "راقیم" کا نام بہت کم زبانوں پر رہا تھا۔ یہ رومیوں کا بیٹرا اور عربوں کا بطرا تھا۔

"جنگ کے بعد سے اس علاقہ کی از سر نو اثری پیمائش کی جا رہی ہے اور نئی نئی باتیں روشنی میں آ رہی ہیں! از انجملہ اس علاقے کے عجیب و غریب غار ہیں جو دور دور تک چلے گئے ہیں اور نہایت وسیع ہیں۔ نیز اپنی نوعیت میں ایسے واقع ہوئے ہیں کہ دن کی روشنی کسی طرح بھی ان کے اندر نہیں پہنچ سکتی۔ ایک غار ایسا بھی ملا ہے جس کے دہانہ کے پاس قدیم عمارتوں کے آثار پائے جاتے ہیں اور بے شمار ستونوں کی کرسیاں شناخت کی گئی ہیں۔ خیال کیا گیا ہے کہ یہ کوئی معبد ہوگا جو یہاں تعمیر کیا گیا تھا۔

"اس انکشاف کے بعد قدرتی طور پر یہ بات سامنے آ جاتی ہے کہ اصحاب کہف کا واقعہ اسی شہر میں پیش آیا تھا اور قرآن نے صاف صاف "الرقیم" بتا دیا ہے اور جب اس نام کا

کی خبر ٹھیک ٹھیک تیرے آگے بیان کر دیتے ہیں۔ وہ چند نوجوان تھے کہ اپنے پروردگار پر ایمان لائے تھے ہم نے انھیں ہدایت میں زیادہ مضبوط کر دیا اور اُن کے دلوں کو صبر و استقامت میں بندش کر دی۔ وہ جب راہِ حق میں کھڑے ہوئے تو انھوں نے صاف صاف کہہ دیا۔ ہمارا پروردگار تو وہی ہے جو آسمان و زمین کا پروردگار ہے۔ ہم اُس کے سوا کسی اور معبود کو پکارنے والے نہیں۔ اگر ہم ایسا کریں تو یہ بڑی ہی بے جا بات ہوگی۔ یہ ہماری قوم کے لوگ ہیں جو اللہ کے سوا دوسرے معبودوں کو پکڑے بیٹھے ہیں۔ وہ اگر معبود ہیں تو کیوں اس کے لیے کوئی روشن دلیل پیش نہیں کرتے پھر اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ کہہ کر بہتان باندھے پھر وہ آپس میں کہنے لگے کہ جب ہم نے ان لوگوں سے اور اُن سے جنھیں یہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں کنارہ کشی کر لی تو چاہیئے کہ غار میں چل کر پناہ لیں۔ ہمارا پروردگار اپنی رحمت کا سایہ ہم پر پھیلا دے گا اور ہمارے اس معاملہ کے لئے سارے سروسامان مہیا کر دے گا اور وہ جس غار میں جا کر بیٹھے وہ اس طرح واقع ہوئی ہے کہ جب سورج نکلے تو تم دیکھو کہ اُن کے دہنے جانب سے ہٹا ہوا رہتا ہے اور جب ڈوبے تو بائیں طرف کترا کر نکل جاتا ہے اور وہ اس کے اندر ایک کشادہ جگہ میں پڑے ہیں۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

نوجوان تھے جنھوں نے سچائی کی راہ میں دنیا اور دنیا کی راحتوں سے منہ موڑا اور ایک غار میں پناہ گزیں ہو گئے۔ اُن کے پیچھے ظلم وستم کی قوتیں تھیں۔ سامنے غار کی تاریکی و وحشت تاہم وہ ذرا بھی ہراساں نہ ہوئے۔ اُنھوں نے کہا خدایا تیری ہی رحمت کا آسرا اور تیری ہی چارہ سازی پر بھروسہ ہے۔ چنانچہ کئی سال تک وہ وہیں رہے اور اس طرح رہے کہ دنیا کی صدائوں کی طرف سے اُن کے کان بالکل بند تھے۔ پھر ہم نے انھیں اُٹھا کر کھڑا کیا تاکہ واضح ہو جائے ان دونوں جماعتوں میں سے کون گروہ تھا جس نے اس عرصہ میں نتائج عمل کا بہتر اندازہ کیا ہے" اس عبرت وتذکیر کی بات کا تفصیل سے تذکرہ کرنے کے بعد مولانا نے ان آیات قرآنی سے مستفاد ہونے والے ان دو امروں کا ذکر کیا ہے۔ ایک تو یہ کہ زندہ رہنے کے لیے وہ نہایت محفوظ اور موزوں مقام ہے کیونکہ ہوا اور روشنی کا راستہ موجود ہے گر دھوپ کی تپش کا وہاں گزر نہیں پھر وہ جگہ اندر سے کشادہ ہے۔ دوسرا امر یہ کہ باہر سے دیکھنے والوں کے لئے اندر کا منظر بہت ڈراونا ہو گیا ہے کیونکہ روشنی کے منافذ موجود ہیں۔ اس لیے بالکل اندھیرا نہیں رہتا۔ سورج کسی وقت سامنے آتا نہیں اس لیے بالکل اُجالا بھی نہیں ہوتا۔ روشنی اور اندھیری کی ملی جلی حالت رہتی ہے اور جس غار کی اندرونی فضا ایسی ہو اُسے باہر سے جھانک کر دیکھا جائے تو اندر کی ہر چیز ضرور بھیانک منظر پیش کرے گی۔ یہ لوگ کچھ عرصہ تک غار میں رہے۔ اس کے بعد نکلے تو اُنھیں کچھ اندازہ نہ تھا کتنے عرصہ تک اس میں رہے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے باشندوں کا وہی حال ہوگا جس حال میں اُنھیں چھوڑا تھا لیکن اس عرصہ میں یہاں انقلاب ہو چکا تھا۔ اب غلبہ اُن لوگوں کا تھا جو اصحاب کہف ہی کی طرح خدا پرستی کی راہ اختیار کر چکے تھے"۔

اصحاب کہف نے یہ مدت کس حال میں بسر کی تھی؟۔ قرآن مجید نے اس کی کوئی صاف صاف تصریح نہیں کی ہے۔ اس سوال کا جواب قرآن مجید میں صرف آیۂ مبارکہ سے ملتا ہے "فضربنا علی آذانہم فی الکہف سنین عددا" عام مفسرین نے ضرب

ثانیاً بنطیوں کی وہاں آبادی تھی اور بنطیوں کے تجارتی قافلے برابر حجاز میں آتے رہتے تھے۔ یقیناً بنطیوں میں اس واقعہ کی شہرت ہوگی اور انھیں سے عربوں نے سُنا ہوگا۔

"خود قریش مکہ کے تجارتی قافلے بھی ہر سال شام جایا کرتے تھے اور سفر کا ذریعہ وہی شاہراہ تھی جو رومیوں نے ساحل خلیج سے لے کر ساحل مارمورا تک تعمیر کر دی تھی۔ پیٹرا اسی شاہراہ پر واقع تھا۔ بلکہ اس نواح کی سب سے پہلی تجارتی منڈی تھی اس لیے اس سے زیادہ قدرتی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ واقعہ اُن کے علم میں آگیا ہو"۔

اس تمام تفصیل کے بعد مولانا آزاد نے چند تشریح طلب باتوں کا ذکر کیا ہے۔ اُن میں سب سے پہلے اسے بتایا ہے کہ اس واقعہ میں عبرت و تذکیر کی بات یہ ہے کہ وہ چند

اور قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں۔ اسی وقت کی بات ہے کہ لوگ آپس میں بحث کرنے لگے۔ ان لوگوں کے معاملہ میں کیا کیا جائے۔ لوگوں نے کہا اس غار پر ایک عمارت بنا دو۔ ان پر جو کچھ گذری ان کا پروردگار ہی اُسے بہتر جانتا ہے۔ تب اُن لوگوں نے کہ معاملات پر غالب آگئے تھے کہا۔ ٹھیک ہے ہم ضرور ان کے مرقد پر ایک عبادت گاہ بنائیں گے"۔ کچھ لوگ کہیں گے کہ غار والے تین آدمی تھے۔ چوتھا اُن کا کتا تھا۔ کچھ لوگ ایسا بھی کہتے ہیں۔ نہیں پانچ تھے۔ چھٹا اُن کا کتا تھا۔ یہ سب اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں سات تھے۔ آٹھواں اُن کا کتا۔ کہہ دے۔ اُن کی اصل گنتی تو میرا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کیونکہ اُن کا علم بہت کم لوگوں کے علم میں آیا ہے۔ تو لوگوں سے اس بارے میں بحث و نزاع نہ کر مگر صرف اس حد تک کہ صاف صاف بات میں ہو اور نہ اُن لوگوں میں سے کسی سے اس بارے میں کچھ دریافت کر اور کوئی بات ہو مگر کبھی ایسا نہ کہو میں کل اسے ضرور کر کے رہوں گا الا یہ کہ سمجھ لو ہوگا وہی جو اللہ چاہے گا۔ اور جب کبھی بھول جاؤ تو اپنے پروردگار کی یاد تازہ کر لو۔ تم کہو امید ہے میرا پروردگار اس سے بھی زیادہ کامیابی کی راہ مجھ پر کھول دے گا اور (کہتے ہیں) وہ غار میں تین سو برس تک رہے اور لوگوں نے نو برس اور بڑھا دیے ہیں (اے پیغمبر) تو کہہ دے اللہ ہی بہتر جانتا ہے وہ کتنی مدت تک رہے۔ وہ آسمان و زمین کی ساری پوشیدہ باتیں جاننے والا ہے۔

امام رازی صاحب فرماتے ہیں "اذا ظھر فعلٌ خارقٌ للعادۃ علی ید الانسان فذالک اما ان یکون مقروناً بالدعوے اولا الخ ......"

اُن کی اس بحث کا ماحصل یہ ہے کہ اگر کوئی خارق عادت فعل کسی انسان کے ہاتھ پر ظاہر ہو تو یا تو وہ فعل دعوے کے ساتھ ملحق ہوگا یا دعوے سے ملحق نہ ہوگا۔ اگر وہ خارق عادت فعل دعوے کے ساتھ ملحق ہوگا تو وہ دعوئے الہیت کا دعوے ہوگا یا نبوت کا دعویٰ ہوگا یا ولایت کا دعویٰ ہوگا یا سحر اور شیاطین کی طاعت کا دعوئے ہوگا۔ اس طرح یہ چار قسمیں ہوئیں۔ پہلی قسم الہیت کا ادعا۔ اور ہمارے اصحاب نے اُسے جائز رکھا ہے جیسا بیان کیا جاتا ہے کہ فرعون الہیت کا مدعی تھا اور خوارق عادات اُس کے ہاتھوں پر ظاہر ہوتے تھے اور ایسا ہی دجال کے متعلق نقل کیا گیا ہے۔ ہمارے اصحاب کا خیال ہے کہ اس کے جواز کی وجہ یہ ہے کہ اس کی شکل اور وضع خود اُس کے جھوٹ پر دلالت کرتی ہے۔ اس لیے اگر اس کے ہاتھوں پر خوارق عادات کا ظہور ہو تو اس سے عوام کے فریب میں مبتلا ہونے کا خدشہ نہیں ہو سکتا۔ اب دوسری قسم نبوت کا ادعا تو اس کی دو صورتیں ہیں۔ یا تو اُس کا دعوے کرنے والا سچا ہوگا یا جھوٹا۔ اگر سچا ہوگا تو پھر ضروری ہے کہ اُس کے ہاتھوں پر خوارق عادت امور کا ظہور ہو۔ جو لوگ انبیاء کی نبوت کے قائل ہیں اُن سب کا اس پر اتفاق ہے اور اگر وہ مدعی کاذب ہو تو پھر اُس کے ہاتھوں سے عادت کے توڑنے والے امور کا ظہور نہیں ہونا چاہئے اور اگر کہیں ظہور ہو تو پھر اُس کے معارضہ کا حصول بھی ضروری ہے۔ تیسری قسم ادعائے ولایت تو جو لوگ کرامات اولیاء کے قائل ہیں انھوں نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے کہ آیا ایسا ہونا چاہئے کہ پہلے وہ کرامات کا ادعا کرے۔ پھر اُس کے دعوے کے موافق خوارق عادت امور کا ظہور ہو یا اس کی ضرورت نہیں۔"

اس بحث کی جزئیات کا استقصا کرنے کے بعد امام رازی صاحب فرماتے ہیں :-

علی الاذان" کا یہ مفہوم لیا ہے کہ اُن پر نیند طاری کردی گئی۔ مولانا کو یہ تفسیر پسند نہیں ہے۔ اُن کے خیال میں اس آیۂ مبارکہ کا مطلب صرف اتنا ہے کہ دنیا کی کوئی صدا اُن تک نہیں پہنچتی تھی۔ مولانا کو عام مفسرین کی تفسیر سے اختلاف اس بنا پر ہے کہ عربی محاورات میں نیند کی حالت کے اظہار کے لئے "ضرب علی الاذان" کی تعبیر ملتی نہیں، لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ سلف سے لے کر متاخرین کے دور تک اس "ضرب علی الاذان" کا مطلب نیند کے طاری ہونے سے کیوں لیا گیا۔ کیا وہ سب عربی محاورات سے اس قدر نابلد تھے؟ بہر حال مولانا نے عام مفسرین کی طرف سے "ضرب علی الاذان" کا یہ مطلب لینے کی یہ وجہ بتائی ہے۔ اُن کے نزدیک یہ ایک طرح کا استعارہ ہے۔ گہری نیند کی حالت کو ضرب علی الاذان سے تشبیہ دی گئی ہے گویا استعارہ تبعیہ کے قبیل کا یہ ایک مجازی استعمال ہے۔ ممکن ہو مولانا کے متعلق کوئی صاحب یہ فرمادیں کہ غیر معمولی مدت تک کسی شخص پر نیند کا طاری رہنا انھیں مستبعد ہوا اس لئے انھوں نے ضرب علی الاذان کی تاویل کر ڈالی تو حقیقۃً ایسا نہیں ہو۔ مولانا اسے مستبعد نہیں قرار دیتے۔ انھوں نے یہ صاف صاف فرمادیا ہو "یہ بات کہ ایک آدمی پر غیر معمولی مدّت تک نیند کی حالت طاری رہے اور پھر بھی زندہ رہے طبّی تجارب کے مسلّمات میں سے ہی اور اسکی مثالیں ہمیشہ تجربے میں آتی رہتی ہیں پس اگر اصحاب کہف پر قدرت الٰہی سے کوئی ایسی حالت طاری ہوگئی جس نے غیر معمولی مدّت تک انھیں سُلائے رکھا تو یہ کوئی مستبعد بات نہیں۔

عام مفسرین اس واقعہ کو اس حالت سے متعلق قرار دیتے ہیں جب اصحاب کہف نئے نئے اُس غار میں جاکر مقیم ہوئے تھے۔ اس اقامت کی مدت کو وہ تین سو نو سال قرار دیتے ہیں۔ اتنی مدت تک اُن کا سوتے رہنا مفسرین کو مستبعد معلوم ہوا اور انھوں نے اس استبعاد کے دور کرنے کے لیے تاویلات کے سلسلے کو دراز کر ڈالا۔ چنانچہ امام رازی نے اپنی تفسیر میں اس واقعہ کے متعلق جہاں اور باتیں لکھی ہیں وہاں انھوں نے کرامات اولیاء پر متکلمانہ رنگ میں ایک اچھی خاصی بحث چھیڑ دی۔

مسیحی دعوت کی ابتدائی قرنوں میں زہد و انزوا کی ایک خاص زندگی شروع ہو گئی تھی جس نے آگے چل کر رہبانیت (مناسٹک ازم) کی مختلف شکلیں اختیار کر لیں۔ اس زندگی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ لوگ ترک علائق کے بعد کسی پہاڑ کے غار میں یا کسی غیر آباد گوشہ میں معتکف ہو جاتے تھے اور پھر اُن پر استغراق عبادت کی ایسی حالت طاری ہو جاتی تھی کہ وضع و نشست کی جو حالت اختیار کر لیتے اُس میں پڑے رہتے یہاں تک کہ زندگی ختم ہو جاتی۔ مثلاً اگر قیام کی حالت میں مشغول ہوئے تھے تو برابر کھڑے ہی رہتے اور اسی حالت میں جان دے دیتے۔ اگر گھٹنے کے بل رکوع کی حالت اختیار کی تھی تو یہی حالت آخر تک قائم رہتی۔ اگر سجدے میں سر رکھ دیا تھا تو پھر سجدے ہی میں پڑے رہتے اور مرنے کے بعد بھی اسی وضع میں نظر آتے۔ زیادہ تر گھٹنے کے بل رکوع کی وضع اختیار کی جاتی تھی کیونکہ عیسائیوں میں تعبد و تضرع کے لیے یہی وضع رائج ہو گئی تھی۔ غذا کی طرف سے یہ لوگ بالکل بے پروا ہوتے تھے۔ اگر آبادی قریب ہوتی تو لوگ روٹی اور پانی پہنچا دیا کرتے۔ نہیں ہوتی تو یہ اس کی جستجو نہیں کرتے۔ عبادت کا استغراق جستجو کی مہلت ہی نہیں دیتا تھا۔ اس اعتبار سے اُن کی حالت ویسی ہی تھی جیسی ہندوستان کے یوگیوں کی رہ چکی ہے اور اب بھی گاہ گاہ نظر آ جاتی ہے۔ جس طرح زندگی میں انھیں کوئی نہیں چھیڑتا تھا، اُسی طرح مرنے کے بعد بھی کوئی اس کی جرأت نہ کرتا۔ مدتوں تک اُن کی نعشیں اسی حالت میں باقی رہتیں، جس حالت میں انھوں نے زندگی کے آخری لمحے بسر کیے تھے۔ اگر موسم موافق ہوتا اور درندوں سے حفاظت ہوتی تو صدیوں تک ڈھانچے باقی رہتے اور فاصلہ سے دیکھنے والا انھیں زندہ انسان تصور کرتا۔ چنانچہ ویٹیکان کے تہ خانوں میں بے شمار ڈھانچے آج تک محفوظ ہیں جو اسی طرح کے مقامات سے برآمد ہوئے تھے اور اپنی اصلی وضع و ہیئت پر باقی تھے۔ مسیحی رہبانیت کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس کی ابتدا اضطراری حالات سے ہوئی تھی۔ آگے چل کر اس نے ایک اختیاری عمل

"جب یہ سب باتیں ذہن نشین کر لی گئیں تو اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ کرامات اولیاء کے جائز ہونے پر قرآن احادیث وغیرہ سب دلالت کرتے ہیں۔ جہاں تک قرآن مجید کا سوال ہے تو اس کے متعلق پہلی حجت تو خود حضرت مریم کا واقعہ ہے۔ سورۂ آل عمران میں ہم نے اس کی توضیح کر دی ہے۔ دوسری حجت اصحاب کہف کا واقعہ ہے کہ وہ تین سو نو برس تک تمام آفات سے محفوظ نوم کی حالت میں بالکل صحیح و سالم غار کی حالت میں رہے اور باری تعالیٰ انھیں دھوپ کی مضرت سے محفوظ رکھتا رہا۔" اس کے بعد امام رازی صاحب نے کرامات اولیاء کے سلسلے میں مزید بال کی کھال نکالنے کی کوشش کی ہے۔

مولانا آزاد مرحوم فکر و نظر کی ان تمام کاوشوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اس سلسلے میں اُن کا خیال حسب ذیل ہے۔

"دراصل یہ سارا معاملہ ہی دوسرا ہے اور جب تک مفسرین کے پیدا کیے ہوئے تخیل سے بالکل الگ ہو کر تحقیق نہ کی جائے اصلیت کا سراغ نہیں مل سکتا۔

"سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جو حالت اس آیت میں بیان کی گئی ہے وہ کس وقت کی ہے؟ اُس وقت کی ہے جب وہ نئے نئے غار میں جا کر مقیم ہوئے تھے یا اُس وقت کی جب انکشاف حال کے بعد دوبارہ معتکف ہو گئے۔ مفسرین نے خیال کیا اس کا تعلق پہلے وقت سے ہے اور یہی بنیادی غلطی ہے جس نے سارا الجھاؤ پیدا کر دیا ہے۔ دراصل اس کا تعلق بعد کے حالات سے ہے یعنی جب وہ ہمیشہ کے لئے غار میں گوشہ نشین ہو گئے اور پھر کچھ عرصہ کے بعد وفات پا گئے تو غار کے اندرونی منظر کی یہ نوعیت ہو گئی تھی تحسبھم ایقاظا وھم رقود میں "ایقاظ" سے مقصود اُن کا زندہ ہونا ہے اور "رقود" سے مردہ ہونا نہ کہ بیداری اور خواب چنانچہ عربی میں زندگی و موت کے لیے یہ تعبیر عام و معلوم ہے۔

"پھر یہ بات سامنے لانی چاہئے کہ یہ واقعہ مسیحی دعوت کی ابتدائی صدیوں کا ہے اور جنھیں پیش آیا تھا وہ عیسائی تھے پھر اتنی بات پر غور کرنے سے سارا معاملہ حل ہو جاتا ہے۔

نہیں۔ "لو اطلعت علیہم لولیت منہم فرارا و لملئت منہم رعبا"
کی علت بھی سامنے آگئی اور تمام بے معنی توجیہیں غیر ضروری ہو گئیں۔ اگر تم کسی قبر کے اندر
جھانک کر دیکھو اور تمہیں مردہ نعش کی جگہ ایک آدمی نماز پڑھتا دکھائی دے تو تمہارا کیا حال
ہو گا۔ یقیناً مارے دہشت کے چیخ اٹھو گے۔ اسی طرح "ونقلبہم ذات الیمین و ذات
الشمال" کی تفسیر میں بھی کسی تکلف کی احتیاج باقی نہ رہی۔ غار شمال و جنوب رویہ واقع تھا اور
ان دونوں حیثیتوں میں ہوا اور روشنی کے منافذ تھے جیسا کہ آیت "وتری الشمس اذا
طلعت" سے تبادر ہوتا ہے۔ پس بالمقابل منافذ ہونے کی وجہ سے ہوا برابر چلتی رہتی تھی
اور اُن کے ڈھانچے دہنے سے بائیں اور بائیں سے دہنی جانب اس طرح متحرک رہتے جیسے
ایک زندہ آدمی ایک طرف سے پلٹ کر دوسری طرف دیکھے۔

اس تفسیر کے بعد اس سوال کا جواب بھی خود بخود مل گیا کہ قرآن نے خصوصیت کے
ساتھ یہ بات کیوں بیان کی کہ سورج کی کرنیں غار کے اندر نہیں پہنچتیں جیسا کہ آیت ۱۷
میں ہے اور کیوں اسے قدرت الٰہی کی ایک نشانی فرمایا کہ ذالک من آیات اللہ۔
معلوم ہو گیا کہ یہ دراصل اس بات کی تمہید تھی جو بعد کو آیت ۱۸ میں بیان کی گئی ہے کہ "تحسبہم
ایقاظاً وھم رقود" یعنی چونکہ یہ بات بیان کرنی تھی کہ مرنے کے بعد اُن کی نعشیں عرصہ
تک باقی رہیں حتیٰ کہ دیکھنے والوں کو زندہ انسانوں کا گمان ہوتا تھا اس لیے پہلے اس کی
علت واضح کر دی کہ جس غار میں معتکف ہوئے تھے وہ اس طرح کا غار تھا کہ انسانی جسم زیادہ
سے زیادہ عرصہ تک اُس میں قائم رہ سکتا تھا کیونکہ سورج کی روشنی اس میں پہنچتی رہتی لیکن
سورج کی تپش کا اُس میں گزر نہ تھا۔ جو چیز نعش کو جلد گلا سڑا دیتی ہے وہ سورج کی تپش ہے
اور جو چیز تازگی پیدا کرتی ہے وہ ہوا اور روشنی ہے۔ ہوا چلتی رہتی تھی روشنی پہنچتی رہتی
تھی مگر تپش سے پوری حفاظت تھی"۔

مولانا کی اس توجیہ سے مسئلہ کی بہت سی گرہیں کھل جاتی ہیں اور پیچیدگیاں دور

کی نوعیت پیدا کرلی۔ یعنی ابتدا میں لوگوں نے مخالفوں کے ظلم و تشدد سے مجبور ہو کر غاروں اور جنگلوں میں گوشہ نشینی اختیار کی۔ پھر ایسے حالات پیش آئے کہ یہ اضطراری طریقہ زہد و تعبد کا ایک اختیاری اور مقبول طریقہ بن گیا۔ مزید تشریح اس مقام کی سورۂ حدید کی تشریحات میں ملے گی۔ بہرحال معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب کہف کا معاملہ بھی تمام تر اسی نوعیت کا تھا۔ ابتدا میں قوم کے ظلم نے انھیں مجبور کیا تھا کہ غار میں پناہ لیں۔ لیکن جب کچھ عرصہ تک وہاں مقیم رہے، تو زہد و عبادت کا استغراق کچھ اس طرح ان پر چھا گیا کہ پھر دنیا کی طرف لوٹنے پر آمادہ نہ ہو سکے۔ اور گو ملک کی حالت بدل گئی تھی لیکن وہ بدستور غار میں ہی معتکف رہے۔ یہاں تک کہ اُن کا انتقال ہو گیا۔ انتقال اس حال میں ہوا کہ جس شخص نے ذکر و عبادت کی جو وضع اختیار کرلی تھی وہی وضع آخری لمحوں تک باقی رہی۔ اُن کے وفادار کُتّے نے بھی آخر تک اُن کا ساتھ دیا۔ وہ پاسبانی کے لئے دہانے کے قریب بیٹھا رہتا تھا۔ جب اُس کے مالک مر گئے تو اُس نے بھی وہیں بیٹھے بیٹھے دم توڑ دیا۔ اب اس واقعہ کے بعد غار کے اندرونی منظر نے ایک عجیب دہشت انگیز نوعیت پیدا کرلی۔ اگر کوئی باہر سے جھانک کر دیکھے تو اُسے راہبوں کا ایک پورا مجمع ذکر و تعبد میں مشغول دکھائی دے گا۔ کوئی گھٹنے کے بل رکوع کی حالت میں ہے۔ کوئی سجدے میں پڑا ہے۔ کوئی ہاتھ جوڑے اوپر کی طرف دیکھ رہا ہے۔ دہانے کے قریب ایک کتا ہے۔ وہ بھی بازو پھیلائے باہر کی طرف مُنہ کئے ہوئے ہے۔ یہ منظر دیکھ کر ممکن نہیں کہ آدمی دہشت سے کانپ نہ اُٹھے کیونکہ اُس نے یہ سمجھ کر جھانکا تھا کہ مردوں کی قبر ہے۔ مگر منظر جو دکھائی دیا وہ زندہ انسانوں کا ہے۔

وہ یہ تفسیر سامنے رکھ کر معاملہ کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالو۔ ہر بات اس طرح واضح ہو جاتی ہے گویا تمام قفلوں کو کھلنے کے لئے صرف اسی ایک کنجی کا انتظار تھا۔ تحسبھم ایقاظا وھم رقود کا مطلب بھی ٹھیک ٹھیک اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ کسی دور از کار توجیہ کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کیونکہ اس طرح کا منظر یہی خیال پیدا کرے گا کہ لوگ زندہ ہیں۔ حالانکہ زندہ

شروع ہوا ہے۔ اسی سلسلہ کی یہ آخری کڑی ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود سے بھی ایسی ہی تفسیر مروی ہے۔ امام قرطبی نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ اولئك قوم فنوا وعدموا منذ مدة طويلة " یعنی اصحاب کہف کی موت پر ایک مدت گزر چکی ہے۔ اُن کے اجسام فنا ہو گئے جس طرح ہر جسم فنا ہو جاتا ہے۔ ایک روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شام کے غزوات میں بعض صحابہ کا گزر اصحاب کہف کے غار پر ہوا تھا اور انھیں ان کی ہڈیاں ملی تھیں۔ اگر یہ روایت صحیح ہو تو اس سے اس کی بھی تصدیق ہو گئی کہ یہ واقعہ پیٹرا میں پیش آیا تھا"

اسی سورۂ کہف میں "ذوالقرنین" کا تذکرہ بھی ہے۔ ذوالقرنین کی شخصیت کی تعین میں اختلاف ہے۔ قرن کے معنی عربی میں بھی اور عبرانی میں بھی سینگ کے ہیں۔ ایسی صورت میں "ذوالقرنین" کا مطلب ہوا دو سینگوں والا لیکن تاریخ میں کسی ایسے بادشاہ کا سراغ نہیں ملتا جس کا لقب ذوالقرنین" ہو لہذا "قرن" کے معنی میں گوناگوں تکلفات کئے گئے۔ چونکہ فتوحات کی وسعت اور مشرق و مغرب کی حکمرانی کے لحاظ سے سکندر مقدونی بہت مشہور ہے اس لیے متاخرین نے اُسی کو معین کر لیا۔ چنانچہ امام رازی نے سکندر ہی کو ذوالقرنین قرار دے دیا۔ سکندر مقدونی کے مراد لینے پر جو اعتراضات ہوتے ہیں اُنھیں بھی امام رازی نے نقل کر دیا ہے اور اُن کے سست و کمزور اور بے محل جوابات دیے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کا ذوالقرنین کسی طرح بھی سکندر مقدونی نہیں ہو سکتا۔ مولانا آزاد کی تصریح کے مطابق نہ تو وہ خدا پرست تھا نہ عادل نہ مفتوح قوموں کے لئے فیاض تھا اور نہ کوئی اُس نے "سد" بنائی۔

بہرحال مفسرین ذوالقرنین کی شخصیت کے تعین میں کسی واضح منزل تک نہ پہنچ سکے۔ مولانا نے ذوالقرنین کی شخصیت کی تعین میں قابل رشک داد تحقیق دی ہے۔ اُن کی نگاہ تحقیق میں قرآن کے ذوالقرنین کا مصداق سائرس (کیخسرو) ایران کا مشہور بادشاہ ہے ——

ہو جاتی ہیں لیکن ابھی ایک گرہ باقی ہے۔ قرآنی آیات پر نظر کرنے سے بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ " ولبثوا فی کھفھم ثلاث مائۃ سنین وازدادوا تسعاً" خود واقعہ کا قرآن کی طرف سے بیان ہے اور اگر اسے مان لیا جاتا ہے تو پھر ان تمام واقعات کو غار میں پہلے پہل جانے ہی سے متعلق کرنا ہوگا۔ اب اگر " ولبثوا فی کھفھم ثلاث مائۃ سنین وازدادوا تسعاً" کو یقولون سے متعلق کیا جاتا ہے تو " یقولون" اور لبثوا کے درمیان میں کئی ایسے ٹکڑے آجاتے ہیں جن کی وجہ سے " ولبثوا" کو یقولون" سے وابستہ کرنے میں ذرا تکلف محسوس ہوتا ہے لیکن ابن عباس وغیرہ نے اسی وابستگی کو تسلیم کر لیا ہے اور یقیناً وہ قرآن کے اسالیب بیان کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ بہرحال مولانا نے اس بارے میں جو لکھا ہے اسے بھی سن لیجئے۔ آپ متن قرآن پر نظر کرنے کے بعد جو مسلک بھی اختیار کریں لیکن اس کا تسلیم کرنا ناگزیر ہے کہ مولانا کا مستند بہت مستحکم ہے اور خصوصیت سے اس لئے کہ اُن کی تفسیر مختلف پہلوؤں سے عقل وفہم کے لیے زیادہ قابلِ قبول ہے۔ وھو ھذا۔

" ولبثوا فی کھفھم ثلاث مائۃ سنین وازدادوا تسعا (۲۵) کیا یہ خود قرآن کی تصریح ہے کہ وہ لوگ اتنی مدت تک غار میں پڑے رہے؟ لیکن اگر ایسا ہے تو پھر اس کے بعد کیوں فرمایا کہ قل اللہ اعلم بما لبثوا؟ مفسرین کو اس اشکال کے دور کرنے میں طرح طرح کے تکلفات کرنے پڑے، حالانکہ صاف مطلب وہی ہے جو حضرت عبداللہ ابن عباس سے مروی ہے۔ یعنی جس طرح پہلے اُن کی تعداد کے بارے میں لوگوں کے مختلف اقوال نقل کیے تھے، اسی طرح یہاں مدت بقا کے بارے میں لوگوں کا قول نقل کیا ہے۔ یعنی لوگ کہتے ہیں غار میں تین سو برس تک رہے۔ بعضوں نے اس پر نو برس اور بڑھا دیے۔ تم کہدو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ فی الحقیقت کتنی مدت گزر چکی ہے۔ پس یہ قرآن کی تصریح نہیں ہے۔ لوگوں کا قول ہے۔ اور " سیقولون" سے نقل اقوال کا جو سلسلہ

میں بلکہ تمام معاصر قوموں میں یہ اعتقاد عام طور پر پیدا ہوگیا تھا کہ وہ ایک غیر معمولی نوعیت کا انسان ہے۔

"دوسینگوں کا تخیل ابتداء میں کیونکر پیدا ہوا؟ کیا اس کی بنیاد دانیال نبی کا خواب تھا یا بطور خود سائرس نے یا باشندگان پارس نے یہ تخیل پیدا کیا؟ اس کا فیصلہ مشکل ہے۔ لیکن اگر توریت کی روایات تسلیم کر لی جائیں تو سائرس سے لے کر آرٹا کسرز (ارتخشست) اول تک تمام شہنشاہ پارس انبیاء بنی اسرائیل سے عقیدت رکھتے تھے۔ اور اس سے ہوسکتا ہے کہ اسی خواب سے ذوالقرنین کا لقب پیدا ہوگیا ہو۔ بہر حال اب اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی کہ سائرس کو ذوالقرنین سمجھا جاتا تھا اور یقیناً عرب کے یہودی بھی اُسے اُسی لقب سے پکارا کرتے تھے۔

اس حقیقت کی وضاحت کے بعد جب سائرس کے اُن حالات پر نظر ڈالی جاتی ہے جو یونانی مورخوں کی زبانی ہم تک پہنچے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے بیان کی ہُو بہو تصویر ہے اور دونوں بیان اس درجہ باہم مطابقت رکھتے ہیں کہ ممکن نہیں کسی دوسری شخصیت کا وہم وگمان بھی کیا جاسکے۔"

اسی ذیل میں مولانا نے یاجوج وماجوج کی تاریخی اہمیت اور ان قوموں کی خصوصیات وغیرہ پر بھی محققانہ عنوان سے روشنی ڈالی ہے۔

مولانا نہ صرف ایک بلند پایہ مفکر تھے بلکہ اعلیٰ سطح کے غیر جانب دار محقق بھی تھے اسی لئے اُن کے قلم سے جو رائے نکلتی تھی یا وہ جو تحقیق فرماتے تھے وہ ہر حیثیت سے بیشتر مکمل ہوتی تھی اور آخری چیز ہوتی تھی اور فکر و تحقیق کے تمام راستے کبھی تقلیدی طور سے طے نہیں کرتے تھے۔ اُن کی ہر جنبش قلم سے اُن کی بلند مجتہدانہ حیثیت واضح ہوتی ہے۔ انھوں نے بہت سے قرآنی بیانات اور تعلیمات کو منکر ادیان سے قریب تر کردیا ہو اور یہ اُن کی وہ مذہبی خدمت ہے جس سے کوئی با فہم شخص انکار نہیں کرسکتا۔ ان مطالب کے

اُس کا لقب بھی ذوالقرنین (دو سینگوں والا) تھا اور اس میں قرآن کی تمام بیان کردہ خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں۔ مولانا نے اس کے بارے میں بہت ہی تفصیلی بحث کی ہے اور اس کے ہر ہر گوشے کا گہرے تاریخی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا ہے۔ اور اس کا کوئی پہلو تشنۂ بحث نہیں چھوڑا ہے۔ اس بحث کا ایک مختصر اقتباس یہاں درج کیا جا رہا ہے:-

"چونکہ (دانیال) کے ایک خواب میں میڈیا اور فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں سے تشبیہ دی گئی تھی اس لیے خیال ہوتا تھا کہ عجب نہیں فارس کے شہنشاہ کے لئے یہودیوں میں ذوالقرنین کا تخیل پیدا ہو گیا ہو۔ یعنی دو سینگوں والی شہنشاہی اور وہ اسے اس لقب سے پکارتے ہوں تاہم یہ محض ایک قیاس تھا اس کی تائید میں کوئی تاریخی شہادت موجود نہ تھی۔ لیکن ۱۸۳۸ء کے ایک انکشاف نے جس کے نتائج بہت عرصہ بعد منظر عام پر آئے اس قیاس کو ایک تاریخی حقیقت ثابت کر دیا اور معلوم ہو گیا کہ فی الحقیقت شہنشاہ سائرس کا لقب ذوالقرنین تھا اور یہ محض یہودیوں کا کوئی مذہبی تخیل نہ تھا بلکہ خود سائرس کا یا باشندگان فارس کا تجویزہ اور پسندیدہ نام تھا۔

اس انکشاف نے شک و تخمین کے تمام پردے اُٹھا دیے۔ یہ خود سائرس کا ایک سنگی تمثال ہے جو اصطخر کے کھنڈروں میں دستیاب ہوا۔ اس سائرس کا جسم اس طرح دکھایا گیا ہے کہ اس کے دونوں طرف عقاب کی طرح پر نکلے ہوئے ہیں اور سر پر مینڈھے کی طرح دو سینگ ہیں اور پر خط میخی میں جو کتبہ کندہ تھا اُس کا بڑا حصّہ ٹوٹ کر ضائع ہو چکا ہے مگر جس قدر باقی ہے وہ اس کے لیے کافی ہے کہ تمثال کی شخصیت واضح ہو جائے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ ما در ا فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں سے تشبیہ دینے کا تخیل ایک مقبول اور عام تخیل تھا اور یقیناً سائرس کو "ذوالقرنین" کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ تمثال میں پروں کا ہونا اُس کے ملکوتی فضائل و صفات کی طرف اشارہ ہے کیونکہ نہ صرف پارسیوں

مولانا آزاد کا ذوقِ جمال

علی سردار جعفری

در کفے جامِ شریعت، در کفے سندانِ عشق

ہر ہوسناکے نہ داند جام و سندان باختن

دہلی کی جامع مسجد کے سامنے کھلے میدان میں امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد آسودۂ خاک ہیں۔ وہیں کہیں سرمد کا مزار بھی ہے جہاں سے ہوائیں اکثر یہ شعر گنگناتی ہوئی گزرتی ہیں ؎

شورے شد و از خوابِ عدم چشم کشودیم

دیدیم کہ باقیست شبِ فتنہ غنودیم

سرمد نے شبِ فتنہ میں اپنی آنکھیں بند کر لیں لیکن مولانا آزاد نے اس شب کو سحر تک کھینچ لانے کے لئے جسم و جان کی بازی لگادی اور اس جدوجہد میں انھوں نے اپنے قلم سے کبھی تلوار کا کام لیا اور کبھی شاخِ گل کا۔ کبھی تلوار میں پھول کھلائے ہیں اور کبھی شاخِ گل پر دھار رکھی ہے۔ میرا موضوع اس تلوار اور شاخِ گل کی آویزش ہے۔

غبارِ خاطر کے دیباچے میں محمد اجمل خاں صاحب مولانا آزاد کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"حضرت مولانا کی زندگی مختلف اور متضاد حیثیتوں میں بٹی ہوئی ہے۔ وہ ایک ہی زندگی اور ایک ہی وقت میں مصنف بھی ہیں، مقرر بھی ہیں، مفکر بھی ہیں، فلسفی بھی ہیں، ادیب بھی ہیں، مدیر بھی ہیں اور ساتھ ہی سیاسی جدوجہد کے میدان کے سپہ سالار بھی ہیں۔ دینی علوم کے تبحر کے ساتھ عقلیات اور فلسفے کا ذوق بہت کم جمع ہوتا ہے اور علم اور ادب کے ذوق نے ایک ہی دماغ میں بہت کم آشیانہ بنایا ہے پھر علمی اور فکری زندگی کا میدان، عملی سیاست

ذہن نشین کرنے میں ان کی تحریر کا اطناب، ان کے بیان کی خطابت خاص مدد و معاون ہوتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس تفسیر میں ایسے مقامات ہی نہیں ہیں جن سے اختلاف کی گنجائش نکل سکے۔ مولانا عدیم الفرصت انسان تھے۔ اُن کے مشاغل متنوع تھے۔ زیادہ تر حافظے پر اعتماد کر کے لکھنے کے عادی تھے۔ اس لئے ایسے مقامات بہرحال مل سکتے ہیں جن سے اختلاف کیا جانا جسارت نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

مولانا کی متعدد حیثیتوں کا باہمی ربط یہ ہے کہ ایک بہت بڑے عالم اور ادیب کو سیاست نے اپنے حلقۂ آغوش میں لے لیا، پھر وہ عالم اور ادیب ایک سیاسی رہنما کی شکل میں ظاہر ہوا اور اسکے سیاسی نصب العین یعنی آزادی اور انسان کی سربلندی کے مقصد کے سامنے باقی تمام چیزوں نے ثانوی حیثیت اختیار کر لی۔ اب اسکی زبان اور قلم کی ہر جنبش اُسی ایک مقصد کے تابع ہو کر رہ گئی۔

مولانا ابوالکلام آزاد جس دور سے تعلق رکھتے ہیں اسکی یہ سب سے اہم خصوصیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سر سید، شبلی، حالی، اقبال کسی کے یہاں سیاست اور ادب الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں ہیں۔ اس عہد میں ان معنوں میں خالص شاعر اور ادیب کا تصور نا ممکن ہے کہ اس نے گوشہ نشین ہو کر علم، شعر اور ادب کی خدمت انجام دی ہو۔ سب نے ادب کو ایک مقصد، ایک نصب العین کے لئے استعمال کیا جو ہندستان کی سیاسی، معاشی اور تہذیبی آزادی کے تصور سے وابستہ تھا۔

مارکس اور لینن اور پنڈت جواہر لال نہرو کی طرح مولانا آزاد کی علمی اور ادبی شخصیت بھی ان کی سیاسی شخصیت کے نیچے دب گئی ہے۔ لیکن جیسے ابر بہار کے پہلے چھینٹے سے خاک انگڑائی لینے لگتی ہے اور خشک دوب کے افسردہ پہلو سے ہری ہری پتیاں مسکرا کر جھانکنے لگتی ہیں، مولانا آزاد کی ادبی شخصیت ذرا سا بہانہ ملتے ہی اپنے ہزاروں رنگوں کے ساتھ اُبھرنے لگتی ہے۔ اُن کے قلم سے شگوفے پھوٹنے لگتے ہیں اور رنگ ٹپکنے لگتا ہے اور وہ اس طوفانی رنگ میں اپنی سیاسی شخصیت کو ڈبو دیتے ہیں۔

اقبال نے اپنے لکچروں کے مجموعے "اسلامی فکر کی تعمیر نو" کے دیباچے میں یہ لکھا ہے کہ یہ کائنات کیا ہے، انسان کا اس سے کیا رشتہ ہے اور اُسے دنیا میں زندگی کیسے بسر کرنی چاہئے مذہب، فلسفے اور اعلیٰ شاعری کے درمیان مشترک ہیں۔ چنانچہ اقبال کی شاعری کی طرح مولانا آزاد کی زندگی اور ادبی کاوشیں بھی اس محور کے گرد گھومتی رہی ہیں اس لئے مولانا کی ادبی کاوشوں کے کسی پہلو کو ان سوالات سے الگ کر کے پیش نہیں کیا جا سکتا۔

کی زندگی سے اتنا دُور واقع ہوا ہے کہ ایک ہی قدم دونوں میدانوں میں ذرا کم اُٹھ سکے ہیں۔ مگر مولانا آزاد کی زندگی ان تمام مختلف اور متضاد حیثیتوں کی جامع ہے۔ گویا اُن کی ایک زندگی میں بہت سی زندگیاں جمع ہوگئی ہیں۔

وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہیں۔

"اس صورت حال کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ اُن کے علائق کا دائرہ کسی ایک گوشے ہی میں محدود نہیں ہے۔ علوم دینیہ کے حُجروں کے زاویہ نشین، ادب و شعر کی محفلوں کے بزم طراز، علم اور فلسفے کی کاوشوں کے دقیقہ سنج اور میدان سیاست کے مدبر اور معرکہ آرائیوں کے شہسوار، سب کے لئے اُن کی شخصیت یکساں طور پر کشش رکھتی ہے اور سب اس مجمع فضل و کمال کے افادات سے بقدر طلب و حوصلہ مستفید ہوتے رہتے ہیں ... ... البتہ اُن کے ارادت مندوں کا حلقہ جس قدر وسیع اور بین القومی ہے اتنا ہی دوستوں کا دائرہ تنگ ہے۔"

اس طویل اقتباس کا آخری فقرہ نہایت اہم ہے۔ یہ مولانا کی زندگی کا ایک ایسا حجاب ہے جسے کوئی نہیں اُٹھا سکا ہے

مولانا طبعاً خلوت پسند واقع ہوئے تھے جس پر بعض اوقات مردم بیزاری کا دھوکا ہوتا ہے۔ یہ تضاد بڑا عجیب ہے کہ سیاست اور انقلاب کی طوفانی لہروں سے کھیلنے والا اور دن رات انسانی ہجوم سے گزرنے والا، جسے کروڑوں آدمیوں نے اپنا رہنما تسلیم کیا، وہ انسانوں سے دُور، گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر تخیل کی انجمن آرائی میں مصروف رہتا ہے۔ اس کی انھیں انگلیوں میں جہاں قلم مچلتا رہتا ہے، ہر وقت قوم اور ملک کی نبضوں کی جنبش محسوس ہوتی رہتی ہے۔ ایسا آدمی عام طور سے ہجوم میں تنہا رہتا ہے اور تنہائی میں ایک محشر خیال کے ہنگاموں میں مصروف۔ یہ دراصل انتہائی خلاق ذہن کی کیفیت ہے جو اپنی تنہائی کو آباد رکھنے کے لئے تصویروں پر تصویریں بناتا رہتا ہے۔ مولانا آزاد نے یہ تصویریں الفاظ سے بنائی ہیں، اُن کا قلم ہمیشہ تنہائی کے عالم میں خاموشی کو اپنے نغموں سے آباد کرتا رہا ہے۔

"خاندانی زندگی اور زندگی کے اولین مشہودات و مسموعات کا طبیعت پر جو اثر پڑتا ہے وہ اتنا قوی ہوتا ہے کہ حقیقتاً طبیعت کے حکم میں داخل ہوجاتا ہے۔ علمائے اخلاق اس کو اِرث معنوی کہتے ہیں۔ والد مرحوم کی عادت تھی کہ دو ڈھائی بجے شب کو اُٹھ جاتے اور تہجد کے بعد اشراق تک برابر جائے نماز پر بیٹھے رہتے۔ ہم لوگ چونکہ سویرے سو جاتے کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ پچھلے پہر آنکھ کھُل جاتی۔ اس زمانہ میں بارہا ایسا ہوا کہ میں بچپنے کے شوقِ محاکات میں بستر سے اُٹھ بیٹھا اور وضو کر کے والد مرحوم کے پیچھے کھڑا ہوگیا۔ مجھے اس میں ایک بڑی تفریح اور دلچسپی محسوس ہوتی تھی، تہجد کی رکعات کے بعد وہ کبھی مراقبے میں رہتے اور کبھی اقصار کی نشست میں بیٹھ جاتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اونچی آواز میں کچھ پڑھنے لگتے یا بعض عربی و فارسی الفاظ زبان پر جاری ہوجاتے۔ مجھے اس وقت رات کے سناٹے میں یہ آواز بڑی بھلی لگتی اور جی چاہتا کہ سُنتا رہوں۔

"ابتدا میں والد مرحوم نے روکا اور کہا سو جاؤ۔ لیکن میں برابر اُٹھتا رہا اور چند روز کے بعد یہ بات بھی گویا معمولات میں داخل ہوگئی۔ ایک مرتبہ میں نے اُن سے سوالات بھی کئے کہ فلاں چیز جو آپ نے ابھی پڑھی کیا ہے اور کس غرض سے ہے۔ اس پر وہ میری فہم کے مطابق بہت سی باتیں کرنے لگتے اور میں بیٹھ کر سُنتا........ مجھے دیکھ کر بھائی اور بہن بھی اُٹھنے لگیں اور پھر تو ایسا ہوگیا کہ دو بجے اُٹھنا گویا گھر کا ایک معمول ہوگیا۔ کئی مرتبہ میری منجھلی بہن نے دن کا سبق "گلستاں" جو کسی وجہ سے رہ گیا تھا اسی وقت یاد کرلیا۔ مجھے یاد ہے کہ اسی وقت کی ایک نشست میں "بوستاں" کی یہ حکایت بہن کے سبق میں آئی تھی ؎

میرے ذمّے جو موضوع ہے اسے بدقسمتی سے خالص علم اور خالص ذوق کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ اس طرح جمالیات کو ایک الہامی کیفیت بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور دروں بینی کی تلقین کی جاتی ہے۔

جمالیات کا لفظ جمال سے بنا ہے اور اس کے معنی ہیں حُسن کا علم یا حُسن کے متعلق معلومات اور آرٹ اور ادب کی دنیا میں تخلیقِ حُسن کے اصول۔ حُسن چونکہ احساس کی چیز ہے اس لئے جب اسے علم کی سطح پر لے کر آیا جائے گا تو ذوق اور اکتساب کے باہمی ربط اور تعلق کا سوال اہمیت اختیار کرے گا۔ یہاں بحث کا ایک یہ گوشہ بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ خود ذوق کس حد تک جبلّی ہے اور کس حد تک اکتسابی۔ لیکن اس باریک بحث سے قطع نظر ہمارے لئے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ مولانا آزاد کی زندگی میں جمالیاتی ذوق کے چشمے کہاں کہاں سے پھوٹے ہیں اور اکتساب کی دولت کہاں سے ہاتھ لگی ہے۔

لیکن مولانا کے فلسفۂ جمال کی جستجو اس طرح نہیں کی جا سکتی، جیسے کروچے، کاڈویل، اور ہیگل کی جمالیات کے بارے میں بات کی جا سکتی ہے۔ مولانا ان معنوں میں مفکّر اور فلسفی نہیں تھے جن معنوں میں افلاطون اور ارسطو، کانٹ اور ہیگل، مارکس اور آئینسٹائن کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ مولانا کسی نئے مدرسۂ فکر اور فلسفے کے بانی نہیں تھے اور اس لئے اُن کے فلسفۂ جمال سے زیادہ اُن کے ذوقِ جمال کی جستجو بہتر ہے۔

اس کے لئے مولانا کی زندگی کے بہت سے پہلو بے نقاب ہونے چاہئیں مگر مشکل یہ ہے کہ اُن کے ابتدائی حالات اور جوانی کی ذاتی زندگی پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور اُن کو آج تک کوئی نہیں اُٹھا سکا ہے۔ خود مولانا نے اپنی تحریروں میں ان حجابات کو اور زیادہ دبیز بنا دیا ہے۔ مولانا آزاد کے خود نوشت تذکرے میں اور مولانا ملیح آبادی کی کتاب "آزاد کی کہانی" میں مولانا آزاد کے ابتدائی حالات کے بارہ میں بہت کم معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ مولانا ملیح آبادی اپنی کتاب میں مولانا آزاد کی زبانی لکھتے ہیں کہ:-

ہمن کا حلقہ ہوتا تھا اور شمعدان کے گرد پروانوں کا ہجوم۔ اس میں پروانوں کے پروں کی جنبش کے ساتھ قدیم اساتذہ کے عربی، فارسی اشعار کا ترنم اور قرآن کی خوش الحانی ہوتی تھی۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ مولانا کا ذوقِ جمال آیاتِ قرآنی کا لحن، اساتذۂ قدیم کے اشعار کا ترنم، شمع کی نورافشانی اور پروانوں کے رقص اور سپیدۂ سحری اور لالہ زارِ شفق کی آتش افشانی سے بنا ہے۔ اس طرح مولانا نے صرف حُسن سے لذّت لینا ہی نہیں بلکہ حُسن کی آگ میں جل جانا سیکھا ہے ؎

توبگریزی از پیش یک شعلہ خام
من استادہ ام تا بسوزم تمام

وہ پروانے کے دل کی تپش لے کر اُٹھے اور شمع کے دل کا گداز بن گئے۔ یہ آگ مولانا کو شفق کے رنگ میں بھی دکھائی دی اور پھولوں کے نقش و نگار میں بھی۔ اسے انھوں نے عارضِ محبوب میں بھی پایا اور لیلائے وطن کے پیکر میں بھی، اور وہ ہمیشہ اس آگ کی طرف دیوانہ وار لپکے اور میر کی زبان میں ؎

پھر نہ کچھ دیکھا بجز یک شعلۂ پُرپیچ و تاب
شمع تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

مولانا نے اوپر کے اقتباس میں سعدی کی "شمع و پروانہ" کی حیات کے گہرے اثر کا بیان خود کیا ہے۔ اس کے بعد کے دور میں مولانا آزاد کے اکتساب میں غالباً بہت بڑا درجہ عربی، فارسی اور اُردو کے اساتذہ کے اشعار کو حاصل ہے جو اپنے حافظہ کی بے پناہ قوت سے مولانا نے اپنے ذہن میں محفوظ کر لئے تھے۔

پُرانے زمانے میں یہ کہا جاتا تھا کہ شاعر کے لئے یہ ضروری ہے کہ اُسے اساتذہ کے دس ہزار چُنے ہوئے اشعار یاد ہوں۔ میرا خیال ہے کہ مولانا آزاد کو اس سے زیادہ اشعار یاد تھے۔ اکثر ان اشعار کا حُسن مولانا نے اپنی تحریروں میں نچوڑ لیا ہے۔ بعض مقامات پر غیر شعوری طور سے اور کہیں کہیں شعوری طور سے انھوں نے کسی شعر کے چھوٹے سے حسین نقطے کو لے کر ایک بسیط سمندر کی طرح پھیلا دیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ

شبے یاد دارم کہ چشم نہ خفت
شنیدم کہ پروانہ با شمع گفت

"شب کی پچھلی پہر کا وقت اور فی الواقع شمعدان کی موجودگی اور پروانوں کا ہجوم، ہر طرف چھایا ہوا سناٹا، والد مرحوم کا خاص لہجے میں اشعار کا دُہرانا اور ایک حالتِ تواجد میں بار بار پڑھنا، ان سب باتوں کا میرے دل پر بڑا ہی اثر پڑا تھا اور ایک ایسی کیفیت آئی تھی کہ آج تک میں اسے محسوس کرتا ہوں۔ مجھے اس وقت ٹھیک ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس سامنے کے شمعدان اور اُڑتے ہوئے پروانوں میں یہ مکالمہ ہو رہا ہے۔ میں اس طرح شمع کی طرف دیکھتا رہا گویا اُسکی آواز سُننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ والد مرحوم پر بھی اس وقت بڑی کیفیت طاری ہو گئی تھی سبق جاری نہ رہ سکا اور وہ دیر تک محویت کے عالم میں یہ شعر دُہراتے رہے ؎

تو بگریزی از پیش یک شعلۂ خام
من استادہ ام تا بسوزم تمام"

اس بیان میں جو معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں وہ ناکافی سہی لیکن اُن سے کچھ چیزوں کا پتہ ضرور چلتا ہے۔

مولانا کی پہلی اور وجدانی کیفیات جو کچھ بھی رہی ہوں لیکن ان کے ذوقِ جمال کی تربیت میں ابتدائی مشہودات اور مسموعات کا بہت دخل ہے۔ وہیں سے اُن کی طبیعت نے اپنا شوقِ محاکات بھی حاصل کیا۔ عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے اور ماہرانِ نفسیات اس پر شاہد ہیں کہ بچے کی ذہنیت اور طبیعت اور اس کے مزاج کی کیفیت چھ برس کی عمر تک بنجاتی ہے۔ اس کے بعد مشہودات اور مسموعات اسکی طبیعت پر جِلا کرتے رہتے ہیں اور یہ اکتساب کی اہم ترین منزل ہے۔ اس منزل میں مولانا روزانہ صبح اپنے بزرگ باپ کی شفیق، مہربانہ، عالمانہ اور پاکیزہ شخصیت دیکھتے تھے۔ اُن کے گرد مولانا اور اُن کے بھائی

خاک کوئیش خود پسند افتاد در جذب سجود
سجدہ از بہر حرم نگذاشت در سیمائے من"

اُن ہزاروں لاکھوں شعروں نے جو مولانا نے پڑھے اور یاد رکھے ان کے دل و دماغ کو ہزاروں رنگوں سے بھر دیا۔ یہ رنگ حافظے کی تصویروں کی شکل میں تاش کے پتّوں کی طرح پھینٹے رہے اور ہر بار اپنی ترتیب بدلتے رہے اور نئی نئی تخلیقی تصویروں کی صورت اختیار کرتے رہے۔

مولانا نے اپنے ذوق جمال کا سب سے اہم نکتہ عربی کے اس فقرے سے حاصل کیا کہ "اپنی مجلسوں کا ذائقہ بدلتے رہو"۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ :۔

"یہاں زندگی کا مزا بھی انھیں کو مل سکتا ہے جو اسکی شیرینیوں کے ساتھ اس کی تلخیوں کے گھونٹ بھی لیتے رہتے ہیں اور اس طرح زندگی کا ذائقہ بدلتے رہتے ہیں۔ ورنہ وہ زندگی ہی کیا جو ایک ہی طرح کی صبحوں اور ایک ہی طرح شاموں سے بسر ہوتی رہے"۔

اس سے مولانا نے اپنے لئے یہ اصول بنایا کہ :۔

"ہمارے تمام احساسات سرتاسر اضافی ہیں۔ اضافتیں بدلتے جاؤ۔ راحت و الم کی نوعیتیں بھی بدلتی جائیں گی۔ یہاں ایک ہی ترازو لے کر ہر طبیعت اور ہر حالت کا احساس نہیں تولا جا سکتا۔ ایک دہقان کی راحت والم تولنے کے لئے جس ترازو سے ہم کام لیتے ہیں اس سے فنون لطیفہ کے ایک ماہر کا معیار راحت والم نہیں تول سکیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم پھولوں کی سیج پر لوٹتے ہیں اور راحت نہیں پاتے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کانٹوں پر دوڑتے ہیں اور اسکی ہر چُبھن میں راحت اور سرور کا ایک نیا پیغام پانے لگتے ہیں"۔

آپ نے دیکھا کہ ایک خلّاق ذہن کس طرح ایک نکتے سے ہزار نکتے پیدا کرتا ہے۔ یہ دراصل مستعار خیالات اور احساسات نہیں ہیں بلکہ اکتساب کیا ہوا ذوق ہے۔ وہ ہر ذرّے کے

غبارِ خاطر میں لکھتے ہیں :۔

"زندگی میں جتنے جرم کئے اُن کی سزائیں پائیں۔ سوچتا ہوں تو اُن سے کہیں زیادہ تعداد اُن جرموں کی تھی جو نہ کر سکے اور جن کے کرنے کی حسرت دل میں رہ گئی۔ یہاں کردہ جرموں کی سزائیں تو مل جاتی ہیں لیکن ناکردہ جُرموں کی حسرتوں کا صلہ کس سے مانگیں ؎

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے"

مولانا نے پیراگراف کو غالب کے شعر پر ختم کر کے خود بتا دیا ہے کہ یہ ساری عبارت غالب کے شعر سے مستعار ہے۔

ایک اور جگہ انھوں نے ایک فارسی شعر کی تشریح اس طرح کی ہے :۔

"خود ہماری زندگی کی حقیقت بھی حرکت و اضطراب کے ایک تسلسل کے سوا اور کیا ہے۔ جس حالت کو ہم سکون سے تعبیر کرتے ہیں اگر چاہیں تو اس کو موت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ موج جب تک مضطرب ہے زندہ ہے۔ آسودہ ہوئی اور معدوم ہوئی۔ فارسی کے ایک شاعر نے دو مصرعوں کے اندر سارا فلسفۂ حیات ختم کر دیا ہے ؎

موجیم کہ آسودگیٔ ما عدم ماست
ما زندہ از انیم کہ آرام نہ گیریم"

ایک مثال اور ــــــ لکھتے ہیں :۔

"راہِ مقصد کی خاک بڑی غیور واقع ہوئی ہے۔ وہ رہرو کی جبین نیاز کے سارے سجدے اس طرح کھینچ لیتی ہے کہ پھر کسی دوسری چوکھٹ کے لئے کچھ باقی ہی نہیں رہتا۔ دیکھئے میں نے یہ تعبیر غالب سے مستعار لی ہے ؎

سادگی اور شوخی نہیں ہے، غالب کے اشعار کی آرائشِ خیال ہے۔ قیامت تا مت مضامین لباسِ نظم کے بجائے لباسِ نثر میں بالیدہ ہوئے ہیں۔

مولانا کا دوسرا طرزِ تحریر جس میں بلا کی روانی ہے اور فصاحت و بلاغت کے دریا خطابت کی موجوں میں تبدیل ہو کر بہتے لگتے ہیں، اس کا سُراغ آیاتِ قرآن کے اس لحن اور ترنم میں ملتا ہے جو بچپن سے ان کے خون میں رچ بس گیا تھا۔ یہ کیفیت انجیل کے بھی بعض حصوں میں ہے جسکی بہترین مثال اگر ایک طرف نغمۂ سلیمان میں ملتی ہے تو دوسری طرف اُن آیات میں جن میں بابل کی تباہی کا ذکر ہے۔

مجھے معلوم نہیں کہ مولانا انجیل سے براہ راست متاثر ہوئے ہیں یا نہیں لیکن اُن کی بعض تحریروں میں وہی روانی، خطابت اور زورِ بیان ہے جو امریکہ کے عظیم المرتبت شاعر والٹ وھٹ مین کی آزاد نظموں کا طرۂ امتیاز ہے اور وھٹ مین براہ راست انجیل کے اسٹائل سے متاثر ہوا ہے اور اُسے اُس نے اپنی نظموں کے سانچے میں ڈھال لیا ہے۔

اس طرزِ تحریر کی مثالیں بیشتر مولانا کے سیاسی مضامین میں اور بعض ادبی مضامین میں ملتی ہیں۔ میں نے ان مضامین کو جب بھی پڑھا ہے تو مجھے ان پر آزاد و رزمیہ نظموں کا گمان گزرا ہے۔ ان کے الفاظ رجز خوانی کر رہے ہیں اور نثر کے منطقی استدلال کی جگہ شاعری کی جذباتی منطق نے لے لی ہے۔ دیکھئے مولانا نے پہلی جنگ عظیم پر کس سطوت اور جلال سے حملہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں ــــ

> "زمین کی پُشت پر ہمیشہ درندوں نے بھٹ بنائے اور اژدروں نے پھنکاریں ماریں لیکن نہ تو ایسی درندگی آج تک کسی میں تھی جیسی موجودہ متمدن اقوام کو حاصل ہے اور نہ اب تک ایسا سانپ اور اژدہا پیدا ہوا جیسے کہ ان لڑنے والوں میں ہے۔ فریق کے پاس ڈسنے، نگلنے اور چیرنے پھاڑنے کے لئے عجیب عجیب ہتھیار جمع ہیں۔ پھر اس اژدہے کو دیکھو جو جنوب سے منھ کھولے بڑھ رہا ہے۔ اس ہاتھی کو دیکھو جس کی مستک غرورِ طاقت سے

دل سے اس کے اندر چھپا ہوا آفتاب نکال لیتے ہیں اور پھر اسکی کرنوں کو بکھیر دیتے ہیں اور اپنے احساس جمال کو تخلیق جمال میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

اکتساب کا یہ دور بچپن سے جوانی تک اور جوانی سے پیری تک جاری رہا۔ اسکی تفصیلات معلوم کرنے کے لئے بہت زیادہ وقت درکار ہے جو اس مقالے کے لکھنے کے لئے میرے پاس نہیں ہے۔ اس لئے میں نے جہاں مولانا کے بچپن کے مشہودات اور مسموعات کا ذکر کیا ہے وہاں اکتساب کے اس دور کا اشارہ کر دیا ہے، کیونکہ اسکی ابتداء وہیں سے ہوتی ہے۔ اس سے مولانا کے طرز تحریر کے کچھ مخصوص اسالیب کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

مثلاً وہ شاعرانہ انداز تحریر جس کا ہر پیراگراف کسی شعر پر ختم ہوتا ہے اُن اشعار کا رہین منت ہے جو مولانا کو بچپن سے یاد تھے اور ان میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ اس ذوق میں نئی شاعری کے مزاج کو بالکل دخل نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ اقبال کے دور تک آنے کے بعد مولانا نے نئے اشعار پڑھنا اور یاد کرنا بند کر دیا تھا۔ اس لئے مولانا کی اس طرز تحریر میں خالص کلاسیکی مزاج ملتا ہے۔ اسکی بہترین مثال مولانا کا مختصر ترین خط ہے ؎

"اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشین دل
می بینمت عیاں، و دعا می فرستمت

" دل حکایتوں سے لبریز ہے مگر زبان درماندۂ فرصت کو یارائے سخن نہیں، مہلت کا منتظر ہوں ——— ابوالکلام"

جدید نثر کے تقاضوں کے مطابق ایک معمولی سی بات کے لئے یہ عبارت آرائی شاید پسندیدہ نہ ہو لیکن میرا خیال ہے کہ مولانا کے ان مکاتیب اور ان میں نگینوں کی طرح جڑے ہوئے ٹکڑوں کو پڑھکر کوئی بدذوق سے کور ذوق انسان کے دل میں بھی خوش مذاقی کی ایک ہلکی سی لہر پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ خطوط نہیں ہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے ادب پارے ہیں جو ذاتی ذوق کی تسکین کے لئے لکھے گئے ہیں اور ایک دوست کی طرف روئے سخن اختیار کر کے ان میں ایک کیفیت پیدا کر دی گئی ہے۔ اُن میں غالب کے خطوط کی

تیار نہیں کہ جو جذبات ان عدالتوں میں کام کرتے ہیں اُن سے بھی ہمارے زمانے کو نجات مل گئی ہے۔ وہ عمارتیں ضرور گرادی گئیں جن کے اندر خوف ناک اسرار بند تھے لیکن ان دلوں کو کون بدل سکتا ہے جو انسانی خود غرضی اور ناانصافی کے خوفناک رازوں کا دفینہ ہیں۔

"عدالت کی ناانصافیوں کی فہرست بڑی ہی طولانی ہے۔ تاریخ آج تک اسکے ماتم سے فارغ نہ ہو سکی۔ ہم اس میں حضرت مسیح جیسے پاک انسان کو دیکھتے ہیں جو اپنے عہد کی اجنبی عدالت کے سامنے چوروں کے ساتھ کھڑے کئے گئے تھے۔ ہم کو اس میں سقراط نظر آتا ہے جس کو صرف اس لئے زہر کا پیالہ پینا پڑا کہ وہ اپنے ملک کا سب سے سچا انسان تھا۔ ہم کو اس میں فرانس کے فدا کار حقیقت گلیلیو کا نام بھی ملتا ہے جو اپنی معلومات اور مشاہدات کو اس لئے جھٹلا نہ سکا کہ وقت کی عدالت کے سامنے ان کا اظہار جرم تھا۔ یہ مجرموں کا کٹہرا کیسی عجیب مگر عظیم الشان جگہ ہے جہاں سب سے اچھے اور سب سے بُرے دونوں طرح کے آدمی کھڑے کئے جاتے ہیں۔"

ممکن ہو بعض حضرات جن کے جمالیات کا تصور محدود ہے ان اقتباسات کو سیاسی دستاویزیں یا صحافتی تحریریں کہہ کر ٹالنا چاہیں لیکن میں ان کو ادبی شہ پاروں میں شمار کرتا ہوں جن پر کیفی اعظمی کا شعر صادق آتا ہے

ایسی رفتار کہ دریا بھی روانی مانگے
ایسی للکار کہ تلوار بھی پانی مانگے

حُسن کو اگر نرم و نازک تک محدود کر دیا جائے اور اثر آفرینی کے لئے اشکوں اور آہوں کو ضروری قرار دے دیا جائے تو پھر مصر کے اہرام، ایلورا کا بُت، ایلیفنٹا کی بڑی مورتی، فان گاگ کی تصویریں، پکاسو کی گورنیکا، فردوسی کا شاہ نامہ، مولانا روم کی مثنوی، اور غالب، اقبال اور انیس کی شاعری کا بیشتر حصہ آرٹ اور ادب کے زمرے سے خارج کرنا پڑیگا اور دنیا بہت سے شاہکاروں سے

جھوم رہی ہے اور جس کے دانت ہلاکت کے دو نیزوں کی طرح نکلے ہوئے
ہیں۔ اس بھیڑیے کو دیکھو جو مشرقی یورپ کے بھٹ سے بھیجتا ہوا اٹھا ہے
اور اس خون ناک چیتے کو دیکھو جو لا مارکے اور روسو کی سرزمین میں خون
اور گوشت کے لئے پلا ہے۔ یہ کیسے مہیب ہیں، یہ کیسے خون ناک آلات سے
مسلح ہیں۔ ان سب کا باہم ایک دوسرے پر گرنا اور چیرنا پھاڑنا کرۂ ارض کا
کیسا ہولناک بھونچال ہوگا۔ ایسا بھونچال جو کبھی نہیں آیا، ایسا طوفان جو کبھی
نہیں اُٹھا، ایسی آتش افشانی جو کبھی کبھی نہ ہوئی اور خداوند کا ایسا غصہ جو
اب تک زمین پر کبھی نہ ہوا۔"

یہ رجز خوانی کا انداز ایوان عدالت میں آکر ایک پیغمبرانہ عظمت اختیار کر لیتا ہے کلکتہ کورٹ
میں بیان دیتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں:۔

"تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی حکمراں طاقتوں نے آزادی اور حق
کے مقابلے میں ہتھیار اُٹھائے ہیں تو عدالت گاہوں نے سب سے زیادہ آسان
اور بے خطا ہتھیاروں کا کام دیا ہے۔ عدالت کا اختیار ایک طاقت ہے
اور وہ انصاف اور بے انصافی دونوں کے لئے استعمال کی جا سکتی ہے۔
تاریخ عالم کی سب سے بڑی بے انصافیاں میدان جنگ کے بعد عدالت کے
ایوانوں ہی میں ہوتی ہیں۔

"دنیا کے مقدس بانیان مذہب سے لے کر سائنس کے محققین تک کوئی
بیباک اور حق پسند جماعت نہیں جو مجرموں کی طرح عدالت کے سامنے کھڑی نہ
کی گئی ہو۔ بلاشبہ زمانے کے انقلاب سے عہد قدیم کی بہت سی بُرائیاں مٹ
گئیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اب دنیا میں دوسری صدی عیسوی کی خوفناک رومی
عدالتیں اور ازمنۂ وسطیٰ کی پُراسرار انکیوزیشن موجود نہیں رکھتیں لیکن یہ ماننے کیلئے

تذکرے کے آخری ابواب میں مولانا آزاد نے اپنی ذاتی زندگی کے اس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے جی بھر کے عشق کیا ہے اور جی بھر کے داد عشرت دی ہے اور اگر صبح کے وقت خمارِ تشنہ کامی زیادہ ملتا ہے تو اسکی وجہ یہ ہے کہ رات کو نشہ بھی اپنی موجیں آسمانوں تک اُچھال رہا تھا۔

اگر مولانا ایسے رندِ خوش اوقات نہ ہوتے تو زاہد خشک بن کر رہ جاتے اور اردو ادب ہزاروں رعنائیوں سے محروم ہو جاتا۔

محروم ہو جائے گی۔

یہ حقیقت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ جلال بھی جمال ہی کا ایک مظہر ہے اور آرٹ کو جادوگری کی سطح سے اٹھا کر پیغمبروں کی سطح تک لے جانے کے لئے جمال و جلال کی آمیزش کرنی پڑتی ہے۔ اس نکتے کو اقبال نے دو مصرعوں میں سمیٹ لیا ہے ؎

دلبری بے قاہری جادوگری ست
دلبری با قاہری پیغمبری ست

سنسکرت میں "رس" کا لفظ محض لطیف چیزوں کیلئے استعمال نہیں ہوتا بلکہ محبت و ہمدردی رس ہیں اسی طرح نفرت، رشک، حسد، غصّہ اور شجاعت بھی رس ہیں اور جہاں نفرت، غصے اور شجاعت کے رس شامل ہوں گے وہاں خطابت کا پیدا ہونا ناگزیر ہے، خواہ وہ ابوالکلام آزاد کی نثر میں ہو خواہ اقبال کی شاعری میں، خواہ آج کے ترقی پسند ادیبوں کی تحریروں میں، خطابت رزمیہ شاعری کی طرح رزمیہ نثر کا ایک اہم حصہ ہے اور آزادی کے جذبے سے سرشار ہونے کی وجہ سے انیسویں اور بیسویں صدی کے ہندستان کا مزاج رزمیہ ہے۔

مولانا کا ایک اور اسلوبِ نگارش وہ ہے جس میں وہ تشبیہوں اور استعاروں کے پھول کھلاتے ہیں اور یہ حسنِ معنی کے چہرے سے نقاب اُلٹنے کے بجائے اس پر پردہ ڈالنے کے لئے اور عشق و طلب کی آگ کو تیز کرنے اور ذوقِ نگاہ کو بیتاب کرنے کے لئے استعمال کئے گئے ہیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ جب ہم مولانا کے بچپن کے مسموعات و مشہودات سے نکل کر ان کی جوانی کے دور میں آتے ہیں اور اُن کے واقعات و حادثات کو تلاش کرنا چاہتے ہیں جنھوں نے مولانا کی روح میں ذوق و شوق کا آبِ حیات اُنڈیلا ہے اور ان کے دل کو سوز و گداز عطا کیا ہے تو ہمیں اس اندازِ نگارش سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ بقول جگر کے ؎

بہارِ لالہ و گل، شوخیٔ برق و شرر بن کر
وہ آئے سامنے لیکن حجاباتِ نظر بن کر

لیکن وہ تاریخ کے تیز دھارے کے بیچ میں آگئے اور پھر ظالم موجوں کی طوفان خیزی میں انھیں ایثار و قربانی کے وہ جلوے نظر آئے کہ وہ سرتاپا سیاست بن گئے۔ یہ انقلاب کیسے ہوا؟ اسکی ایک داستان ہے اور ہمارے نوجوانوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اس داستان کو اچھی طرح جانیں اور سمجھیں کیونکہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا اصلی محرکات اور نامشہور عصری مقتضیات سے نگاہیں ہٹتی جائیں گی اور صرف پیش پا افتادہ تاریخی واقعات سامنے رہ جائیں گے۔

مولانا سن ستاون کے تقریباً تیس برس بعد، اپنے وطن اصلی ہندستان سے دور، مکہ معظمہ میں باب السلام کے قریب محلہ قدوہ میں (۱۸۸۸ء) پیدا ہوئے۔ وطن سے یہ دوری بھی سیاسی حالات کا نتیجہ تھی۔ غدر سے پہلے جب ہندستان کی حالت دگرگوں ہوئی اور سلطنت و اقتدار کی بنیادیں بالکل ہی متزلزل ہوگئیں تو علماء کا ایک گروہ بہت دل برداشتہ خاطر ہوگیا اور ہندستان سے ہجرت کرکے قافلہ بہ قافلہ حجاز جانے لگا۔ انھیں میں مولانا آزاد کے والد کے نانا مولانا منور الدین بھی تھے۔ نانا ہی کے ساتھ مولانا کے والد مولانا خیرالدین بھی گئے۔ ان دونوں حضرات کے علم و فضل کی بنا پر وہاں کے کبار مشائخ سے ان کے تعلقات ہوگئے اور شیخ حرم، شیخ محمد ظاہر وتری کی بھانجی سے مولانا خیرالدین کی شادی بھی ہوگئی۔ اسی "قران السعدین" سے مولانا آزاد کی صلاحیت علمی کا خمیر پیدا ہوا۔

یہ خاندان صرف گوشہ نشین علماء کا خاندان نہیں تھا بلکہ یہ لوگ بہت سیاسی اثر و رسوخ کے بھی مالک تھے اور مغل بادشاہوں کی عظمت سے بھی خائف نہیں ہوتے تھے۔ آپ کے خاندان ہی کے ایک فرد ملا جمال الدین تھے جنھوں نے شہنشاہ اکبر کے امام وقت ہونے کے محضر پر دستخط کرنے سے انکار کردیا تھا اور بعد میں ہجرت کرکے مکہ چلے گئے تھے۔ ان کے صاحبزادے شیخ محمد نے فتوے دیدیا کہ "بادشاہ کو سجدۂ تعظیمی کرنا درحقیقت ناجائز اور حرام ہے"۔ اسی طرح مولانا آزاد کے پرنانا، قاضی سراج الدین پنجاب کے قاضی القضاۃ اور نائب سلطنت نورالدین کے مشیر تھے اور سکھ فوجوں کے خلاف کئی معرکوں میں شریک ہوئے اور بالآخر ملتان کے معرکے میں مارے گئے۔ مولانا منورالدین بھی سکھوں اور مرہٹوں کی فوجوں میں قید رہے۔ پھر بمشکل دلی پہونچے۔ چھ برس بعد اپنے والد قاضی سراج الدین کے قتل کئے جانے کی خبر پائی تو قصور جاکر

آزاد — معمارِ اتحاد و آزادی

سید علی جواد زیدی

مولانا ابو الکلام آزاد کی شخصیت میں کئی خصوصیتیں بہ یک وقت اس طرح جمع ہو گئی تھیں کہ بعض اوقات ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ناممکن سا ہو جاتا ہے۔ یہی حال مولانا کی سیاست کا بھی تھا۔ اگر وہ صرف سیاست داں ہوتے تو تعیّن و تبصرہ میں کوئی دشواری پیش نہ آتی لیکن وہ عالم و محدث و فقیہ و مفسر بھی تھے اور فلسفی و ادیب و شاعر بھی۔ وہ صحافی تھے مگر ادب کی سرحدوں سے باہر کبھی قدم نہیں رکھا، ادیب تھے مگر اپنے ادب کو وقفِ صحافت کئے رہے اور پھر ادب و صحافت دونوں ہی کو اپنی سیاست کا تابع اور آلۂ کار بنا لیا۔ اس طرح جب اُن کی سیاسی زندگی کا جائزہ لیا جاتا ہے تو مولانا کی علمی، ادبی اور صحافی زندگی کا جائزہ لینا بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس کے بغیر حضرت مولانا کی صحیح اہمیت اور عصر آفریں عظمت کا صحیح اندازہ لگانا ناممکن ہے کیونکہ اُن کی صحافت کا مقصد بھی اُن کے سیاسی نظریات کی ترویج و تبلیغ تھا اور اُنکے ادبی جواہر پاروں کا مطمحِ نظر بھی یہی تھا۔ یہ تفسیر قرآن مجید اور خطبات دینی سے بھی حضرت مولانا نے یہی کام لیا۔ وہ کوئی نہ کوئی گوشہ اپنے تمام اعمال و افعال میں خدمتِ سیاست کا ضرور نکال لیتے تھے۔ سیاست اُن کی زندگی بن گئی تھی اور اُن کے سارے وجود پر حاوی ہو گئی تھی۔ پھر بھی یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ وہ نرے سیاس تھے حقیقت یہ ہے کہ اُن کی پرورش و پرداخت، اُن کی تعلیم و تربیت ایک بالکل ہی مختلف طریقے پر ہوئی تھی۔ اگر اُن کے پہلو میں وہ دل نہ ہوتا جو تھا اور اگر اُن کے بالائے دوش وہ ذکی الحس، دُور بیں اور مآل آشنا دماغ نہ ہوتا جسکی جلوہ باریوں نے ہماری تاریخ کا رُخ ہی موڑ دیا تو وہ زینت افزونِ بوریائے فقر و شاہراہِ تصوف و فرازِ منبر ہو جاتے یا پھر قرطاس و قلم کی خدمت میں مصروف ہو کر اجتہاد کی نئی نئی دلیلیں نکالتے رہتے۔ وہ عالم و صوفی و مفسر و فقیہ و محدث و ادیب و شاعر و صحافی سب کچھ ہوتے لیکن سیاست داں نہ ہوتے کیونکہ طبعاً وہ کم آمیز، گوشہ نشین اور نازک طبع واقع ہوئے تھے۔

اور ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑے رہتے تھے ...... میں خاندانی مریدوں کی ان عقیدتمندانہ پرستاریوں سے خوش نہیں ہوتا تھا بلکہ طبیعت میں ایک طرح کا انقباض اور توحش رہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی ایسی راہ نکل آئے کہ اس فضاء سے بالکل الگ ہو جاؤں اور کوئی آدمی آکر میرے ہاتھ پاؤں نہ چومے۔"

یہ کیفیت صرف پیری و مریدی کے بیرونی مظاہر تک محدود نہ تھی بلکہ اس خلش کی جڑیں دور دور تک پھیلتی چلی گئی تھیں۔ خود مولانا ہی کا قول ہے کہ:-

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ابھی پندرہ برس سے زیادہ عمر نہیں ہوئی تھی کہ طبیعت کا سکون ہلنا شروع ہو گیا تھا اور شک و شبہ کے کانٹے دل میں چبھنے لگے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جو آوازیں چاروں طرف سنائی دے رہی ہیں اُن کے علاوہ بھی کچھ اور ہونا چاہیے اور علم و حقیقت کی دنیا صرف اتنی ہی نہیں ہے جتنی سامنے آکھڑی ہوئی ہے۔ یہ چبھن عمر کے ساتھ برابر بڑھتی گئی یہاں تک کہ چند برسوں کے اندر عقائد و افکار کی وہ تمام بنیادیں جو خاندان، تعلیم اور گردو پیش نے چنی تھیں بیک وقت متزلزل ہو گئیں اور پھر وہ وقت آیا کہ اتنی ہلتی ہوئی دیوار کو خود ہاتھوں سے ڈھا کر اس کی جگہ نئی دیواریں چننی پڑیں ؎

ہیچ گہ ذوق طلب از جستجو بازم نہ داشت

دانہ می چیدم دراں روزے کہ خرمن داشتم

شک کی یہی چبھن تھی کہ جو تمام آنے والے یقینوں کے لئے دلیلِ راہ بنی۔ بلا شبہ اس نے پچھلے سرمایوں سے تہی دست کر دیا تھا مگر نئے سرمایوں کے حصول کی لگن بھی لگا دی تھی اور بالآخر اسی کی رہنمائی تھی جس نے یقین اور طمانیت کی منزلِ مقصود تک پہونچا دیا۔"

غرض مولانا آزاد ہر طرف گئے۔ ممنوعہ شاہراہوں کی طرف بھی اور عام گزرگاہوں پر بھی۔ ایامِ جوانی میں ایک سال پانچ ماہ کا زمانہ ایسا بھی گزرا جو مولانا کے خیال میں گمراہی کا زمانہ ہے۔ فرماتے ہیں کہ:-

"گمراہی عمل کی آخری حد فسق ہے اور گمراہی اعتقاد کی الحاد۔ سو فسق و الحاد کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جس سے

گھر والوں کو دلی لائے اور یہیں آباد ہو گئے۔ شاہ عالم ثانی کے زمانے میں ان کو رکن المدرسین بنا دیا گیا۔ رکن المدرسی اُس زمانے کی وزارت تعلیم تھی۔ انھوں نے بھی بادشاہ کے سامنے بھرے دربار میں ڈولے کی رسم کی ممانعت کی جب کہ یہ معلوم ہو چکا تھا کہ خود اس دن محل میں ایک ڈولا آیا ہے۔ اسی طرح بہادر شاہ پر جب شیعیت کا رنگ چڑھنے لگا تو انھوں نے شدید مخالفت کی۔ جب مولنٰا کے والد اور نانا ہندستان سے ہجرت کر کے حجاز گئے تو وہاں کے ذی اثر علما سے بھی ان کے گہرے تعلقات ہو گئے۔

قیام مکّہ کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مولنٰا کے والد کو قسطنطنیہ جانے کا اتفاق ہوا جہاں سلطان عبدالمجید نے ان کا اور ان کے تمام متعلقین کا وظیفہ مقرر کر دیا اور وہ وہاں دو برس رہ پڑے۔ اسی زمانے میں شریف مکّہ نے بغاوت کی۔ پھر مولنٰا ہی نے بیچ میں پڑ کر صلح کرا دی۔ مولنٰا نے شام و عراق وغیرہ کا بھی سفر کیا۔ آخر میں شریف مکہ سے بھی شدید اختلافات ہو گئے۔ وہابی تحریک کی بھی انھوں نے شدید مخالفت کی تھی اور شیعہ جماعتوں سے مقابلہ و مناظرہ کیا تھا اور اُن کی مخالفت کے سلسلے میں بھی کچھ سیاسی پیچیدگیاں مول لے لی تھیں۔ غرض اس خاندان کی تاریخ ایک جدوجہد طوفانی کی تاریخ ہے جس کی خصوصیات میں جراءت گفتار، عزم محکم، سرفروشی عشق اور غرور استغنا شامل تھیں۔ سلطنتوں سے وابستگی بھی رہی تو فقر و استغنا کے ساتھ۔ اس کا اقرار خود مولنٰا نے ان لفظوں میں کیا ہے:۔

"میں نے اُن گودوں میں پرورش پائی ہے جن کا فخر و شرف حیات دنیوی پر نہیں بلکہ فقر و سکینی پر رہا ہے اور فقر اپنا خاندانی ورثہ ہے"۔

لیکن طریقوں اور خیالوں کے باوجود مولنٰا کی طبیعت بالکل ہی مختلف تھی۔ ایک تو مولانا کے خاندان والے صرف علمار کے حلقے میں رہ کر سیاست برتے تھے جس کا دائرہ مذہبیات و اسلامیات کے خطوط سے کہیں نہ کہیں جا ملتا تھا اور یہ سب کے سب مذہب کے معاملے میں بیحد سخت گیر اور بالکل قدامت پسند تھے لیکن مولنٰا نے اپنی روش ابتدا ہی سے مختلف رکھی۔ خود لکھتے ہیں کہ:۔

"میری پیدائش ایسے خاندان میں ہوئی جو علم مشیخت کی بزرگی اور مرجعیت رکھتا تھا ..... میں نے ابھی ہوش بھی سنبھالا نہیں تھا کہ لوگ پیرزادہ سمجھ کر میرے ہاتھ پاؤں چومتے تھے

زنجیریں توڑنا پڑیں اور اُمنگوں اور امیدوں کے دفتر اپنے ہاتھوں جلانا پڑے۔ لیکن ایسا نہیں ہو کہ ان تمام راہ رویوں اور بہاں پیمائیوں میں ان کے یہاں کی سمت یا کوئی راہ نہیں تھی یا وہ مذہب کے معاملہ، روحِ مذہب اور مسلمات کی طرف سے بھی غافل تھے۔ ترجمان القرآن میں انھوں نے یہ بات بہت واضح طور سے لکھی ہے کہ "کامل ستائیس برس تک قرآن میرے شب و روز کے فکر و نظر کا موضوع رہا ہے اور اسکی ایک ایک سورۃ، ایک ایک مقام، ایک ایک آیت، ایک ایک لفظ پر میں نے وادیاں قطع کی ہیں اور مرحلوں پر مرحلے طے کئے ہیں"۔ اسی طرح مولانا آزاد نے کانگریس کے خطبۂ صدارت میں ارشاد فرمایا کہ :-

"میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثہ میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اسکی حفاظت کروں۔ بہ حیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں"۔

مختصر یہ ہے کہ مولانا کے مذہبی ماحول، اُن کے خاندانی حالات، اُن کی تعلیم و تربیت سب نے مل جُل کر انھیں مذہبی روایات تو ضرور دیں لیکن قدامت پسندی، کٹرپن، تنگ نظری اور ضد اُن میں پیدا نہ ہوسکی۔ اس کا سبب اُن کی تحقیق اور وسعت مطالعہ تھا، اس کی عادت انھیں بچپن ہی سے تھی۔ انھیں جو کچھ ملتا وہ پڑھتے اور تلاش کر کے پڑھتے۔ پھر اُن کا ذہن خود نئے گوشے نکالتا، نئے شُبہے اُبھارتا اور اُنکا حل ڈھونڈتا۔ اس طرح ان میں قدیم و جدید کا ایک نہایت ہی دل آویز امتزاج ہوگیا۔

خوش قسمتی سے اُن کے والد کے قسطنطنیہ، شام، حجاز و مصر وغیرہ سے پہلے ہی تعلقات تھے۔ دورانِ تعلیم میں خود مولانا نے ممالک اسلامیہ کی سیاحت کی تو انھیں ایک نئی اسلامی تحریک کے قریب آنے کا موقع ملا۔ یہ علامہ جمال الدین افغانی کی تحریک آزادیٔ مشرق و اتحادِ اسلامی تھی۔ اس نے مشرق کو خوابِ گراں سے جھنجھوڑا اور یورپی استعمار کی چال بازیوں اور ریشہ دوانیوں سے آگاہ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عرب و عجم اپنی آزادی تیزی سے کھوتے جارہے تھے۔ یورپ سے اسلامی حکومتوں کے

اپنا نامۂ اعمال خالی رہا ہو اور فسق خود بھی ایک کامل قسم کا الحاد ہے۔ لیکن دنیا کی ساری سچائیوں اور یقینیوں سے بڑھ کر یہ حقیقت ہے کہ

کار سازِ ما بفکر کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

غرض اپنی غفلت پرستیوں کا یہ حال تھا لیکن اُدھر کارفرمائے غیب کا فیصلہ کچھ اور ہی ہو چکا تھا۔ ناگہاں جاذبۂ توفیقِ الٰہی پردۂ عشقِ مجاز میں نمودار ہوا۔۔ ۔۔ ۔۔ بلاشبہ یہ لغزش تھی، لیکن اُس لغزش کو کیا کہو گے جو محبوب کے قدموں پر گرا دے؟ مقصود تو ساری باتوں سے اُسی تک پہنچنا ہے۔ اگر لغزش و مستی ہی راہ نما بن جائے تو کیوں نہ ہزاروں استقامتیں اس پر قربان ہوں۔"

جس وقت مولنا تحقیق و تجسس، تلاش و جستجو، علم و ایمان کی ابتدائی منزلیں طے کر رہے تھے اُس وقت سے لے کر آخر عمر تک مولنا کا یہی وطیرہ رہا کہ کسی چیز کو جانچے اور پرکھے بغیر قبول نہ کرنا۔ اسی کے ساتھ ہی ساتھ ان کا دوسرا طریقہ یہ بھی تھا کہ جب راہ نظر آجائے تو پھر عقوبتوں کا خیال کئے بغیر اور ستائش و صلہ کی تمنا کئے بغیر اُس راہ پر چلنا، بلکہ صرف اسی راہ پر چلتے رہنا۔ تقلید کی راہوں پر قدم نہیں اُٹھتے تھے بلکہ خود سوچتے اور خود سوچ کر راہ نکالتے، چاہے وقت کی ٹولیاں کسی طرف جائیں اور زمانے کے قافلے کوئی سمت کیوں نہ اختیار کریں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ :۔

"بازار میں ہمیشہ وہی جنس رکھی جاتی ہے جس کی مانگ ہو، مگر میرا معاملہ بالکل الٹا رہا۔ جس جنس کی مانگ عام ہوئی وہ میری دوکان میں جگہ نہ پا سکی۔ لوگ بازار میں دوکان لگاتے ہیں تو ایسی جگہ ڈھونڈ کر جہاں خریداروں کی بھیڑ ہو۔ میں نے اپنی دوکان لگائی تو وہاں جہاں گاہکوں کا گزر کم ہو سکے۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ مذہب میں، ادب میں، سیاست میں، فکر و نظر کی عام راہوں میں جس طرف بھی نکلنا پڑا کسی راہ میں بھی وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکا۔"

اور اس مقامِ بلند تک پہونچنے کے لئے انھیں (انھیں کے بقول) دلدلوں اور جھاڑیوں سے گزرنا پڑا،

ذریعے وہ دوسرے انقلابیوں اور خود شری آربند وگھوش سے ملے۔ مؤخرالذکر کے اخبار کرم یوگی نے بھی مولنٰا کے خیالات کو بےحد متاثر کیا اور مولانا انقلابی سیاست کی گود میں چلے گئے۔

اس زمانہ میں انقلابی جماعتوں میں صرف متوسط طبقے کے ہندو ہی شامل تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ انقلابی اپنی جماعتوں میں مسلمانوں کو لیتے گھبراتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ حکومت برطانیہ آجکل مسلمانوں کی جانب لطف وعنایات کا ہاتھ بڑھا رہی ہے اس لئے مسلمان تحریک انقلاب میں سچے دل سے شریک نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے جب مولنٰا بھی شیام سندر چکرورتی کی وساطت سے ان انقلابیوں میں شامل ہوئے تو شروع شروع ان پر بھی اعتماد نہیں کیا جاتا تھا اور اہم ترین رازدارانہ مشوروں سے الگ ہی رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی لیکن مولنٰا نے مصر، ایران اور ترکی وغیرہ کی انقلابی تحریکوں سے وابستہ مسلمانوں کی مثالیں دیکر یہ واضح کرنا چاہا کہ اگر وہاں کا مسلمان برطانوی شہنشاہیت کا مقابلہ کرسکتا ہے تو یہاں کے مسلمان بھی پیچھے نہ رہیں گے بشرطیکہ دوستانہ طریقے پر ان کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اسی عرصے میں مولانا مسلمانوں میں بھی کام کرتے رہے اور انھوں نے نوجوانوں کی ایک مختصر سی ایسی جماعت تیار کرلی جو سیاسی اعتبار سے مولنٰا کی ہمنوا تھی۔ اب مولنٰا نے اپنے انقلابی دوستوں کو یہ مشورہ دیا کہ انقلابی تحریک کا دائرہ وسیع کیا جائے اور اس کو حدود بنگال وبہار سے نکال کر ہندستان بھر میں پھیلایا جائے۔ انقلابی شروع شروع میں ہچکچائے کیونکہ اُن کی کارروائیاں خفیہ ہوا کرتی تھیں اور تحریک کے پھیلنے اور شاخوں کے بڑھنے سے انھیں یہ اندیشہ تھا کہ رازداری باقی نہ رہ سکے گی۔ لیکن مولنٰا انھیں برابر آمادہ کرتے اور اُکساتے رہے، یہاں تک کہ دو برس کے اندر اندر شمالی ہند اور بمبئی کے کئی اہم شہروں میں خفیہ جماعتیں قائم ہوگئیں۔ کچھ ہی دنوں بعد مولنٰا کو عراق، مصر، شام اور ترکی کے سفر پر جانا پڑا۔ عراق میں مولنٰا کچھ ایرانی انقلابیوں سے ملے۔ مصر میں مصطفےٰ کمال پاشا کے حامیوں سے ملاقات ہوئی اور ترکی میں نوجوان ترک تحریک کے کچھ لیڈروں سے شناسائی ہوئی۔ اسلامی ممالک کے ان انقلابیوں کی ملاقات نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ ان سب نے اس بات پر بڑی حیرت کا اظہار کیا کہ ہندی مسلمان وطنی تحریکوں سے علیحدہ ہی نہ تھے بلکہ اکثر مخالف بھی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان تحریکوں میں تو مسلمانان ہند کو ہراول دستوں کا کام دینا چاہیئے تھا۔ یہ برطانیہ کے

قدم اُکھڑ چکے تھے۔ ترکوں کا بیڑہ غرق کیا جا چکا تھا اور ہندستان میں بھی مغلیہ حکومت دم توڑ چکی تھی۔ غرض سارے عالم اسلام پر ایک یاس انگیز اضطراب چھایا ہوا تھا جو موت کے سکوت سے کم نہ تھا۔ اسے افغانی نے محسوس کیا اور پھر انھوں نے صور قیامت پھونکا۔ وہ خود تو آگ میں پھاندے ہی مگر انھوں نے سارے مشرق میں ایک نئی آگ کے شعلے بھڑکا دیے۔ یہ آزادی کی آگ تھی۔ اس تحریک کی خصوصیت یہ تھی کہ تنگ نظر نہیں تھی بلکہ آزادی اور مساوات کے بنیادی اصولوں پر قائم تھی اور بین الاقوامیت کا پہلو لئے ہوئے۔ اس لئے مشرق کے سیاست دانوں نے پہلی بار اپنے ہی ملک کی چھوٹی چھوٹی ریشہ دوانیوں اندرونی رقابتوں سے بلند ہو کر بین الاقوامی سیاسی محرکات و عوامل کا تجزیہ کرنا سیکھا۔ افغانی کا انتقال ۱۸۹۷ء میں یعنی آزاد کی ولادت کے دس سال بعد ہو گیا اس لئے آزاد نے افغانی کے اسی آخری دور کو ہوش سنبھالنے کے بعد دیکھا تھا اور گھر میں اسی کا چرچا سنا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ افغانی کی تحریک نے اسی آخری دور میں زیادہ زور پکڑا تھا۔ رفتہ رفتہ شیخ افغانی کی تحریک ہندستان میں بھی پھیل چکی تھی اور کلکتہ اس کا مرکز بن چکا تھا۔ چنانچہ شیخ کے مقالوں کا پہلا مجموعہ مقالات جمالیہ اسی کلکتہ سے ۱۸۸۴ء میں شائع ہوا تھا۔ جب مولانا تین چار برس کے سن میں حجاز سے اپنی والدہ کے ساتھ ہندستان آ کر کلکتہ میں مقیم ہوئے ہوں گے تو ضرور ہی شروع سے اس نئی تحریک کے چرچے سنے ہوں گے۔ اس ابتدائی تاثر کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ شیخ عبدہٗ کو اہل ہند سے روشناس کرانے کے لئے مولانا نے الہلال کے صفحات سے بہت کام لیا۔ خود الہلال پر شیخ کے عروۃ الوثقیٰ کی چھاپ موجود ہے۔

جمال الدین کے خیالات نے مولانا کے دل و دماغ کو یورپی استعمار کی عالمگیر ریشہ دوانیوں سے واقف کرایا۔ ادھر خود بنگال میں ۱۹۰۵ء کے قریب خلفشار برپا ہوا۔ لارڈ کرزن نے یہ دیکھ کر کہ بنگال میں سیاسی بیداری عروج کو پہونچ رہی ہے وہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں مستقل تفریق پیدا کرنے کیلئے تقسیم بنگالہ کی تجویز نافذ کر دی۔ بنگال کے ہندوؤں پر سے برطانوی اعتماد اٹھ گیا اور اب بنگال کے مسلمانوں کی تالیف قلوب کی جانے لگی۔ اس تقسیم نے سارے بنگال میں آگ لگا دی اور کئی خفیہ انقلابی جماعتیں قائم ہو گئیں۔ انھیں انقلابیوں میں ایک شیام سندر چکرورتی بھی تھے۔ ان سے مولانا کی ملاقات ہوئی پھر انھیں کے

"....پھر تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ دنیا کو دیکھتے ہو پر اس کی نہیں سنتے جو تمھیں موت کی جگہ حیات، زوال کی جگہ عروج اور ذلّت کی جگہ عزت دینا چاہتا ہے۔"

ظاہر ہے کہ یہ نغمہ اور اس نغمہ کا آتشیں آہنگ اُردو صحافت کیا اردو ادب نے بھی اسکے پہلے نہ دیکھا تھا نہ سُنا تھا۔ مسلم سیاست اب بھی افراتفری اور پراگندگی کا شکار تھی۔ برطانوی سامراج تقسیم کرو اور حکومت کرو کے اصول پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین خلیج کو وسیع سے وسیع تر کردینا چاہتا تھا۔ اگرچہ مسلم لیگ وجود میں آچکی تھی لیکن اُسکی ساری سیاست کی بنیاد دراصل برطانیہ دوستی پر تھی۔ مسلمانوں میں ایک طبقہ تو وہ تھا جو سرسید کی تعلیمات سے متاثر ہو کر یا تو سیاسیات سے بالکل ہی کنارہ کش تھا یا کھلّم کھلا تاجِ برطانیہ سے وفاداری کو جزو ایمان سمجھنے لگا تھا اور اربابِ حکومت وقت "اولی الامر" اور "امیر المومنین" کے اسلامی تصورات و خطابات کے مستحق سمجھے جانے لگے تھے۔ مسلمان اپنی غلامی سے گویا مطمئن کئے جا رہے تھے اور مستزاد یہ تھا کہ اُن کو اپنے ہموطنوں سے ایک علٰحدہ اکائی کے طور پر نہ صرف پیش کرنیکی کوشش کیجا رہی تھی بلکہ اُن کی ذہنی نشو و نما، ساخت و پرداخت ہی اس نہج پر ہو رہی تھی کہ وہ قوم کے اندر ایک قوم بننے میں اپنی نجات سمجھنے لگیں۔ ہندوؤں کو غاصب حقوق سمجھیں اور برطانیہ کو اپنے حقوق کا محافظ۔ کچھ مسلمان ایسے بھی تھے جو ترکی اور مصر و عراق پر نظریں جمائے تھے۔ لیکن انھیں بھی سیاسی عوامل و محرکات کی خبر نہیں تھی۔ وہ تو ایک مبہم سے مذہبی لگاؤ کی وجہ سے ان ممالک کے معاملات سے دلچسپی لیتے تھے۔ ان میں کچھ اس پر برہم بھی تھے کہ یورپ کی طاقتیں ان ممالک اسلامی میں ریشہ دوانیوں سے اسلامی ممالک کو مضمحل اور بے جان کر رہی تھیں، لیکن ایک تو انھیں کوئی راہ فرار و داد مقاومت نظر نہ آتی تھی، دوسرے اس برہمی کے سوتے بھی صرف مذہبی اختلافات سے پھوٹتے تھے اور کوئی سیاسی حل یا تحریک اُن کے سامنے نہ تھی۔ جب غفلت کے یہ گھٹا ٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے تھے اُسوقت الہلال کی بجلی کڑکی۔ یہ ایک دردمند دل کی کراہ بھی تھی اور ایک مجاہدانہ للکار بھی۔

الہلال کی آتش نوائیوں نے ملک بھر میں ایک آگ لگادی۔ اگرچہ جس طبقہ میں سیاسی

حلقہ بگوش کیونکر ہو گئے جو مولانا نے یہ سفر ۱۹۰۸ء میں کیا تھا۔ اختتام سفر کے بعد وہ اس پُر جوش ولولہ سے ہندستان آئے کہ مسلمانوں کو ملک کی سیاست میں عملی حصہ لینے کی زبردست تحریک ضروری سمجھا۔

صحافت سے مولانا کی دل بستگی نئی نہیں تھی۔ ادبی رسائل میں تو بہت پہلے ہی سے لکھنے لگے تھے اور اس کے پہلے ہی لسان الصدق، نیرنگ عالم، وکیل اور الندوہ وغیرہ کے ادارتی فرائض بھی انجام دے چکے تھے۔ لیکن یہ سب ابتدائی نقوش تھے اور ۱۹۰۸ء تک یہ دور ختم ہو چکا تھا۔ اب چھ سات برس کی جو مزید مدت گزری اور خیالات میں جو انقلابی رجحانات نمایاں ہوئے تو صحافتی میدان میں بھی اسی جوش و ولولہ، عزم و دلیری، طوفاں دوستی اور اثر آفرینی کے مظاہرے کے لئے مولانا کی بے چین طبیعت بے چین تر ہو گئی۔ اس طرح الہلال کے سنگ بنیاد رکھے جانے کے لئے مناسب فضا تیار ہوئی۔ مولانا کے دل میں جو جوش و خروش اس وقت کروٹیں لے رہا تھا اُسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے لیکن اس کا کچھ اندازہ خود مولانا ہی کے قلم کے چند جواہر پاروں سے کیا جا سکتا ہے:۔

"آہ! تمھاری غفلت سے بڑھ کر آج تک دنیا میں کوئی اچنبھے کی بات نہ ہوئی اور تمھاری نیند کی سنگینی کے آگے پتھروں کے دل چھوٹ گئے۔ آہ! تم ایسے نہ تھے۔ آہ! میں کیا کروں اور کہاں جاؤں اور کس طرح تمھارے دلوں کے اندر اُتر جاؤں اور یہ کس طرح ہو کہ تمھاری روحیں پلٹ جائیں اور تمھاری غفلت مر جائے۔ یہ کیا ہو گیا ہے۔ پاگلوں سے بھی بدتر ہو گئے اور شراب کے متوالے تم سے زیادہ عقلمند ہیں۔ تم کیوں اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہو اور کیوں تمھاری عقلوں پر ایسا طاعون چھا گیا ہے کہ سب کچھ کہتے اور سمجھتے ہو پر نہ تو راست بازی کی راہ تمھارے آگے کھلتی ہے اور نہ گمراہی کے نقش قدم چھوڑتے ہو۔"

شعلۂ برق میں لپٹا ہوا ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجئے:۔

"آہ! کاش مجھے وہ صور قیامت ملتا جس کو لیکر میں پہاڑیوں پر چڑھ جاتا۔ اس کی صدائے رعد آسائے غفلت شکن سے سرگشتگان خواب کو ذلت و رسوائی سے بیدار کرتا اور چیخ چیخ کر پکارتا کہ اُٹھو بہت سو چکے اور بیدار ہو کیونکہ اب تمھارا خدا تم کو بیدار کرنا چاہتا ہے۔

جنگ عظیم چھڑ گئی اور مولانا نے انتہائی بے خوفی سے سامراج کی بدعنوانیوں کی قلعی کھولنا شروع کر دی۔ نہ صرف حکومت کے سنسر کا محکمہ بلکہ تمام انگریز دوست حلقے تلملا اُٹھے۔ اخبار پائنیر جو اس زمانے میں الٰہ آباد سے نکلتا تھا چیخ اُٹھا اور اس نے ایک اداریہ میں حکومت کو الہلال کی تحریروں کے خلاف کارروائی کرنے پر اکسایا۔ دارالعوام میں اس اخبار کے بارے میں سوالات کئے گئے۔ یہ رنگ دیکھ کر مولانا نے بھی مزید ضمانت دینے کا ارادہ ترک کر کے الہلال کو بند ہی کر دیا اور اُس کی جگہ البلاغ جاری کیا اور اب وہی کام البلاغ سے لینے لگے جس کے لئے الہلال کو وقف کر رکھا تھا۔ ذرا لہجہ میں تبدیلی ضرور کر دی۔ حکومت نے بھی پینترا بدلا اور پریس ایکٹ کی بجائے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کو حرکت میں لائی اور اس ایکٹ کی دفعہ ۳ کے ماتحت مولانا کا داخلہ یو۔ پی، دہلی، پنجاب، سی۔ پی اور بمبئی وغیرہ صوبوں میں بند کر دیا گیا۔ اب وہ صرف بنگال اور بہار میں نقل و حرکت کر سکتے تھے۔ لیکن ۲۳۔ مارچ ۱۹۱۶ء کو بنگال سے بھی دیس نکالا مل گیا۔ اب صرف بہار کے دروازے کھلے رہ گئے تھے۔ چنانچہ ۳۰۔ مارچ کو آپ رانچی پہنچے۔ ایک مہینے کے اندر ہی اندر آپ کو وہاں نظر بند کر دیا گیا۔ مولانا کی نظر بندی سے ہندوستان بھر میں ایک تہلکہ مچ گیا اور ساٹھ ہزار سر کردہ افراد کے دستخطوں سے حکومت کے سامنے مولانا کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ ٹھکرا دیا گیا۔ نظر بندی کا یہ سلسلہ یکم جنوری ۱۹۲۰ء تک قائم رہا۔ یعنی جب تک جنگ عظیم ختم نہ ہوئی، مولانا کو رہا نہیں کیا گیا۔

مولانا کی نظر بندی ہندی مسلمانوں کی سیاست میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک بہت بڑے طبقے کے جذبات وفاداری کو اس سانحہ سے دھکا لگا اور مسلمانوں کی خاصی تعداد سامراج سے نبرد آزمائی کے لئے بے چین نظر آنے لگی۔ اس میں زوال ترکی سے بھی بڑی مدد ملی۔ جب ۱۹۱۸ء میں ترکوں کو شکست ہوئی اور اتحادیوں نے ترکی کے حصے بخرے کر ڈالے تو مسلمان چیخ اُٹھے اور احیاء خلافت کی تحریک چلنے لگی۔ اب انھوں نے پہلی بار بڑے درد و کرب سے محسوس کیا کہ سلطنت برطانیہ مسلمانوں کی دوست نہیں بلکہ صرف اپنے سامراجی مفاد کی دوست ہے۔ ملک کے طول و عرض میں مسلمان احیائے خلافت کے لئے منظم ہونے لگے تھے۔ اگرچہ یہ اتحاد خالص مذہبی بنیادوں پر وجود میں آ رہا تھا لیکن چونکہ عملی طور پر یہ

بیداری پیدا کرنے کے لئے مولانا نے الہلال کا اجرا کیا تھا اس سے کسی مالی تعاون کی توقع نہیں تھی اور وہ خود بھی صاحبِ دلق و گلیم ہی تھے، لیکن شانِ استغنا کا یہ عالم تھا کہ جب الہلال کے لئے ایک ہندوستانی والی ریاست نے ایک گراں قدر رقم کا چیک بھیجا اور یہ بھی ارادہ ظاہر کیا کہ وہ یہ رقم ہر ماہ بھیجتے رہیں گے تو مولانا نے یہ پیشکش یہ کہہ کر ٹھکرا دی کہ الہلال کا قلم کسی قیمت پر بھی بِک نہیں سکتا۔ جنگ بلقان کا معاملہ ہو یا مسجد کانپور کا، ہر وہ واقعہ جو اُس دَور کے مسلمانوں کو مذہبی یا ثقافتی بُنیادوں پر بےچین کرتا تھا، مولانا اُسے فوراً سیاسی تحریک میں تبدیل کرتے، برطانوی استبداد کی ریاکاریوں کے رُخ سے نقاب اُلٹتے اور حکومت وقت کے خلاف بغاوت کے جذبات اُبھارتے۔ اس طرح آگ پھیلتی گئی اور ایک طبقہ ایسا پیدا ہوتا گیا جو مولانا کے سیاسی نظریات سے قریب تھا۔ یہ طبقہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا نہیں تھا بلکہ قدیم علوم سے آگاہی رکھنے والوں اور عالموں کا تھا۔ مولانا نے اسی کو غنیمت سمجھا کہ فرقہ پرستوں کے قلعہ میں کہیں سے شگاف تو نمودار ہوا۔ یہ دیکھ کر حکومت کی سراسیمگی بڑھتی گئی اور وہ زبانِ الہلال کو بند کرنے پر تُل گئی۔ الہلال کی اشاعت ۲۶ ہزار تک پہنچ چکی تھی اور ایک ایک کاپی پورے پورے دائروں میں گردش کرتی تھی۔ اس طرح لاکھوں انسان اس کے لئے گوش بر آواز ہو چکے تھے۔

شروع شروع میں اسی ہر دلعزیزی کے باعث حکومت کو قانونی کارروائی کرنے میں کچھ ہچکچاہٹ بھی ہوئی لیکن پانی سر سے اونچا ہوتا جا رہا تھا اور آخر کار حکومت کے نزدیک وار کرنے کا بھی وقت آ پہنچا کیونکہ مسلمانوں میں رفتہ رفتہ آزادی پسند دل اور حکومت کے دو واضح گروہ بنتے جا رہے تھے۔ حکومت پرستوں میں مسلم لیگ اور علی گڑھ یونیورسٹی کے بہت سے کرتا دھرتا شریک تھے۔ یہ لوگ کھُلم کھُلا مخالفت پر اتر آئے لیکن آخر رجعت پسندوں کو ہی شکست کھانا پڑی اور مسلم لیگ ہی کو مجبور ہو کر اپنا نصب العین "ذمہ دار حکومت" قرار دینا پڑا۔ واقعات کی اس رفتار پر حکومت کی سراسیمگی فطری تھی۔ چنانچہ حکومت نے پریس ایکٹ کے ماتحت الہلال سے دو ہزار کی ضمانت طلب کی۔ الہلال کے لہجے کی تلخی کم نہ ہوئی تو ضمانت ضبط اور دس ہزار کی مزید ضمانت طلب کر لی گئی۔ اسی زمانے میں دسمبر ۱۹۱۴ء

مولانا عبدالباری کے فیصلہ کا انتظار کریں گے ۔ مولانا آزاد کے لئے فیصلہ اس لیے مشکل نہ تھا کہ وہ پہلے ہی سے کچھ اسی قسم کے خیالات رکھتے تھے اور الہلال میں ایک بار لکھ بھی چکے تھے ۔ پھر انقلابیوں سے قدیم وابستگی نے بھی انھیں عملی اقدامات کے لئے پہلے سے آمادہ کر رکھا تھا ۔ ۲۹ر فروری ۱۹۲۰ء کو پراونشل خلافت کانفرنس کے اجلاس کلکتہ میں مولانا نے ترک موالات کا پروگرام پاس بھی کرایا ۔ ۳۰ مئی ۱۹۲۰ء میں بنارس میں کانگریس کمیٹی نے ترک موالات کی تجویز پیش کی ۔ عوامی پلیٹ فارم سے پہلے پہل میرٹھ خلافت کانفرنس میں گاندھی جی نے ترک موالات کا پروگرام پیش کیا ۔ پھر ستمبر ۱۹۲۰ء میں کانگریس کے اجلاس کلکتہ میں یہ تجویز پیش ہوئی ۔ محرک گاندھی جی تھے اور موید ابوالکلام آزاد ۔ صدر اجلاس لاجپت رائے تھے ۔ وہ خود اور سی ۔ آر ۔ داس دونوں ہی مخالف تھے ۔ بپن چندر پال بھی حق میں نہیں تھے ۔ لیکن تجویز کھلے اجلاس میں پاس ہوگئی ۔ یہی وہ اجلاس ہے جب مسٹر محمد علی جناح کانگریس سے بالکل علیحدہ ہوگئے ۔ اب راہیں مختلف ہوچکی تھیں ۔ اب قربانی و عمل کی منزلیں سامنے تھیں ! اب تحریک کو ملک بھر میں کھیلانے کا سوال تھا ۔ اس کے لئے مہاتما گاندھی کے علاوہ مولانا آزاد، علی برادران، حسرت موہانی، ڈاکٹر کچلو اور حاجی احمد صدیق کھتری کو مقرر کیا گیا ۔

اب کانگریس سے عملی تعاون کا قریب سے موقع ملا اور مولانا نے اس قربت اور ہم آہنگی کو استوار و مضبوط بنانے کا فیصلہ کر لیا ۔ اب اُن کے گاندھی جی سے تعلقات میں گہرائی ہی آتی گئی اور ایک دوسرے کی عظمت کا معترف ہوتا گیا ۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ :-

"۱۹۲۰ء کی ۱۸ جنوری کو دہلی آیا تو حکیم اجمل خاں صاحب کے مکان پر سب سے پہلے مجھے گاندھی جی سے نیاز حاصل ہوا ۔ اس دن سے آج تک ..... کے یہ دن ہم پر ایسے گزرے کہ گویا ہم ایک ہی چھت کے نیچے رہے ..... اس طویل مدت میں بہت سے موقعے آئے کہ ہم میں اور اُن میں اختلاف ہوا اور کشمکش تک نوبت پہنچی ۔ انھوں نے اور ہم نے دونوں ہی نے اپنی اپنی جگہ اس کو محسوس بھی کیا لیکن اس پوری زندگی میں کوئی وقت ایسا نہیں آیا کہ ہمارے دلوں کا رُخ پھر گیا ہو ۔ ایسے ایسے اختلافوں کے باوجود

برطانیہ دشمن جذبہ میں تبدیل ہوچکا تھا اس لئے اسکی سیاسی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا مختلف حصوں میں خلافت کمیٹیاں قائم ہونے لگی تھیں۔

اس وقت مولنا تو نظربندی میں دن گزار رہے تھے اور وہاں تصنیف و تالیف میں مشغول تھے لیکن اسی زمانے میں مہاتما گاندھی ہندوستان کے سیاسی پلیٹ فارم پر آچکے تھے اور چمپارن کے کسانوں کی تحریک کے سلسلے میں بہار میں آنا جانا ہورہا تھا۔ انھوں نے مولنا سے بھی ملنے کی خواہش ظاہر کی لیکن حکومت بہار نے اجازت نہیں دی۔ اس طرح مولنا اور مہاتما میں ۲۰۔ جنوری ۱۹۲۰ء کے پہلے ملاقات نہ ہوسکی۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد مولنا خلافت کمیٹیوں کے جلسوں میں شرکت کرنے لگے۔ اسی دوران میں وائسرائے کے پاس ایک وفد لیجانے کی تجویز ہوئی۔ میمورنڈم پر مولنا نے دستخط تو کر دیئے تھے لیکن وفد میں اس لئے شریک نہ ہوئے کہ ان کے خیال میں معاملہ اب عرضداشتوں کی حد سے گزرچکا تھا۔ اس سلسلے میں دلی میں جو اجلاس ہوا تھا اس میں مہاتما گاندھی نے بھی شرکت کی تھی اور انھوں نے خلافت کے مسئلے میں مسلمانوں سے تعاون پر مکمل آمادگی ظاہر کی تھی۔ دلی کے جلسے میں گاندھی جی کے علاوہ لوکمانیہ تلک اور دوسرے کانگریسی عمائد نے بھی شرکت کی اور مسلمانوں سے پورا اتفاق کیا۔

اس طرح سیاسی محاذ پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے عظیم الشان اتحاد عمل کا پس منظر تیار ہوا۔ وائسرائے کے یہاں جو وفد گیا تھا وہ ناکام پلٹا کیونکہ وائسرائے نے یہ کہا کہ وہ خود تو کچھ نہیں کرسکتے لیکن اگر مسلمان کوئی وفد لندن لے جانا چاہتے ہیں تو وہ پوری سہولتیں مہیا کریں گے۔ اس ناکامی کی فضا میں پھر ایک جلسہ اگلے اقدام کے تعین کے لئے طلب کیا گیا۔ اس میں مولنا شوکت علی، مولنا محمد علی، حکیم اجمل خاں، اور مولنا عبدالباری فرنگی محلی موجود تھے۔ مہاتما گاندھی نے اس اجلاس میں تحریک ترک موالات کا پروگرام پیش کیا۔ انھوں نے تعلیمی اداروں، عدالتوں اور قانون ساز مجلسوں کے بائیکاٹ اور ملازمتوں سے استعفٰی کا مشورہ دیا اور خطابات کے واپس کرنے کی بھی تلقین کی۔ مولنا خود راوی ہیں کہ اس پروگرام پر سوائے ان کے کسی نے فوراً اتفاق نہیں کیا۔ حکیم اجمل خاں نے سوچنے کے لئے وقت چاہا۔ مولنا عبدالباری نے کہا کہ اس بنیادی سوال پر وہ مراقبہ و مکاشفہ کے بعد کوئی رائے دیں گے اور علی برادران نے کہا کہ وہ

اور شمال سے جنوب تک کا سفر کر کے شرکت کرتے لیکن چندہ وغیرہ کا جمع کرنا یا اصطلاح کے کام علی برادران وغیرہ کیا کرتے تھے، مولنا تحریک کے سمت کے تعین اور برطانوی استعمار کی شکست کے بارے میں زیادہ سوچتے اور تدبیریں کرتے۔ آگرہ، میرٹھ اور کلکتہ کی خلافت کانفرنسوں کی صدارت مولنا ہی نے فرمائی۔ پراونشل خلافت کانفرنس میں "مسئلۂ خلافت اور جزیرۃ العرب" کے نام سے جو پُر مغز خطبہ آپ نے پڑھا وہ ایک اہم سیاسی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ خلافت کے سلسلے میں جو تقریریں مولنا نے کیں متحدہ قومیت اُن کا مرکزی نقطہ تھا۔ چنانچہ خطبۂ آگرہ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ :-

"ہندوستان کے لئے، ہندوستان کی آزادی کے لئے، صداقت و حق پرستی کے بہترین فرائض ادا کرنے کے لئے ہندوستان کے ہندو مسلمان کا اتفاق اور اُن کی یک جہتی ضروری ہے"

آگے چل کر اور بھی وضاحت کردی :-

"ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان، ہندوستان کے بائیس کروڑ ہندو بھائیوں کے ساتھ مل کر ایسے ہو جائیں کہ دونوں مل کر ہندوستان کی ایک قوم اور ایک نیشن بن جائیں"

"آپ میں سے اب مسلمان بھائیوں کو سنانا چاہتا ہوں کہ خدا کی آواز کے بعد جو سب سے بڑی آواز ہو سکتی ہے وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان تھی۔ اس وجود مقدس نے جو صلح نامہ لکھا، بجنسہ یہ اُس کے الفاظ ہیں :-

"ہم ان تمام قبیلوں سے جو مدینہ کے اطراف میں بستے ہیں صلح کرتے ہیں، اتفاق کرتے ہیں اور ہم سب مل کر ایک نیشن بننا چاہتے ہیں، ایک قوم بننا چاہتے ہیں"۔

اُس کے بعد مولنا نے اس امر کی وضاحت بھی کر دی کہ سامراج کے خلاف جو جنگ ہے وہ صرف وطنی ہی نہیں بلکہ ایک مذہبی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ برطانوی سامراج نے نہ صرف ہندوستان بلکہ سارے ممالک اسلامی کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا ہے اس لئے انھوں نے مسلمانوں کو مخصوص طور سے مخاطب کر کے کہا کہ اُن کے لئے برطانیہ سے کسی قسم کی مصالحت کرنا نہ صرف یہ کہ وطن دشمن

اُن کی عظمت کی جو رسّی ہماری گردنوں میں پڑی ہوئی تھی ہم کبھی اُس سے باہر نہ ہو سکے۔

.... میری گردن کی رگیں سخت ہیں۔ میرے سامنے جب کوئی دماغ آتا ہے تو پہلے میرا ذہن اُسکے خلاف ہی جانا چاہتا ہے یہاں تک کہ وہ میرے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لے۔ چنانچہ جب میں پہلی دفعہ مہاتما جی سے ملا اس وقت میں ان کا معتقد نہیں تھا۔ ... لیکن اس کے بعد اُن کی ہر چیز نے اُن کی عظمت کو میرے دل میں راسخ کر دیا اور جو دن گزرا میرا اعتقاد ان کے بارے میں بڑھتا گیا۔"

اور گاندھی جی نے مولانا کے بارے میں فرمایا کہ :-

"مجھے سنہ ۱۹۲۰ء سے قومی کام میں مولانا آزاد کے ساتھ وابستہ رہنے کا فخر حاصل رہا ہے۔ اسلام کے بارے میں اُن سے زیادہ معلومات کسی کو حاصل نہیں ہیں۔ عربی زبان کے وہ بہت بڑے عالم ہیں۔ اُن کی دیش بھگتی اسی طرح پختہ ہے جس طرح اُن کا اسلام میں عقیدہ۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس کے اعلیٰ ترین سردار ہیں اور ہندوستانی سیاسیات کا مطالعہ کرنے والے ہر ایک شخص کو چاہئیے کہ اس حقیقت کو نظر انداز نہ کرے۔"

چنانچہ مولانا نے اپنے شب و روز قومی کاموں کے لئے وقف کر دیئے۔ جاگنا، سونا، اُٹھنا، بیٹھنا سب قومی کاموں کے لئے ہوتا تھا۔ حد یہ ہے کہ انھوں نے اپنے علمی اور ثقافتی معمولات اور نوشت و خواند کے عادات بھی اس ہیجان کی نذر کر دیئے۔ بس دَورے کرنا، تقریریں کرنا، ترک موالات کے لئے لوگوں کو اُبھارنا، منظم کرنا اور سارے ملک کو ایک تحریک میں منسلک کرنا یہی ان کا مطمح نظر رہ گیا تھا۔ اس دَور کی اگر تفصیل لکھی جائے تو خود ایک مستقل باب بن جائے لیکن اُن کی سرگرمیوں کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے چند اشارے ضروری ہیں۔

ملک کو عدم تعاون کے لئے تیار کرنے کے لئے مولانا نے طول و عرض ملک میں دَورے کئے۔ کبھی کبھی علی برادران بھی ان دَوروں میں شریک ہو جاتے تھے۔ اس وقت کانگریس کے علاوہ خلافت کانفرنس اور جمعیۃ العلماء ہند بھی مولانا کی سرگرمیوں کا خاص محور تھی۔ خلافت کانفرنسوں اور کمیٹیوں میں کلکتہ سے بمبئی تک

"خلافت کمیٹیاں اگر پوچھتی ہیں کہ ان کو کیا کرنا چاہیئے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اُن کو آزادیٔ ہند کا پورا مواد صرف اپنے ہی سرمایہ سے فراہم کر دینا چاہیئے تاکہ جب مؤرخ کا قلم اُٹھے تو اعتراف کرنا پڑے کہ ہندوستان اپنی آزادی کے لیے کسی جماعت کا اس قدر مرہون منت نہیں ہے، جس قدر پیروانِ اسلام کا۔"

مولانا آزاد کی روح کی بیتابی انھیں ایک قدم بھی رُکنے نہیں دیتی تھی۔ مارچ ۱۹۲۱ء میں انھوں نے گاندھی جی کے ساتھ پنجاب کا جب تیسری بار دورہ شروع کیا تو لاہور اور امرتسر میں جلسوں اور تقریروں کی ممانعت تھی۔ مہاتما گاندھی نے اُن امتناعی احکام کی اس لئے خلاف ورزی نہیں کی کہ انھوں نے یہ پروگرام کچھ عرصہ کے لئے ملتوی کر دیا تھا لیکن مولانا نے یہ کہہ کر خلاف ورزی کی کہ انھیں ذاتی اور شخصی طور پر خلاف ورزی کرنے کا حق حاصل ہے اور پھر گاندھی جی نے بھی اُن کے اس طرز عمل کو جائز قرار دیا۔ چنانچہ مولانا نے جمعہ کو شاہی مسجد لاہور میں ایک ہنگامہ خیز تقریر کی جس پر سول اینڈ ملٹری گزٹ بلبلا اُٹھا اور اُس نے "صحن مسجد میں باغیانہ تقریر" کے عنوان سے ایک اداریے میں حکومت سے قانونی کارروائی کا مطالبہ کیا۔ ایک ہی ہفتہ بعد مولانا نے ایسی ہی تقریر امرتسر میں بھی کی اور پھر کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے سی۔ آئی۔ ڈی رپورٹروں کو للکارا "یہ سی۔ آئی۔ ڈی کے رپورٹر بیٹھے ہیں۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ حرف بحرف قلمبند کرلیں۔ اگر یہ جرم ہے تو گورنمنٹ کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کا ارتکاب ہمیشہ جاری رہے گا۔"

اور واقعۃً مولانا نے پھر دہلی میں جمعیۃ العلماء اور خلافت کمیٹی کے جلسوں میں ایسی ہی تقریریں کیں۔ حکومت کا پیمانۂ صبر لبریز ہو ہی رہا تھا کہ پرنس آف ویلز کی آمد ہند کے سلسلے میں بائیکاٹ کی تحریک چل پڑی اور اُس نے مولانا کی گرفتاری کا فیصلہ کر لیا۔ فیصلہ کی خبر پر مولانا نے جو بیان دیا وہ قابل نقل ہے۔

"گورنمنٹ نے میری گرفتاری کا فیصلہ کر کے مجھے ایک بڑے بوجھ سے نجات دے دی۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ میرے لئے اب جیل سے باہر رہنا کس قدر تکلیف دہ ہو گیا تھا۔ جو چلے جاتے ہیں انھیں کیا معلوم کہ پیچھے رہ جانے والوں کے

بلکہ اسلام دشمن عمل ہی۔ چنانچہ مولنا کا ۱۹۲۱ء والے جلسۂ آگرہ کا خطبۂ صدارت گواہ ہے:۔

"ہر مسلمان کے قلب پر یہ حقیقت نقش ہے اور ہو جانا چاہیئے کہ جب تک
انگریز گورنمنٹ، برٹش گورنمنٹ اپنے اس ابلیسانہ گھمنڈ سے باز نہ آجائے،
مسلمانوں کے معاملات شرعی کو پروانہ کردے، عراق کی سرزمین اس کی
داخلت سے پاک نہ ہو جائے، جب تک ایشیائے کوچک میں اسکی کوئی طاقت
مخالفت نہ کرے، قسطنطنیہ سے تمام شرائط اور پابندیاں نہ اٹھائی جائیں،
ہندوستان کو آزادی نہ دیجائے اُس وقت تک برٹش گورنمنٹ فریق محارب ہے
اس وقت تک اس کے لئے جائز نہیں کہ صلح وصفائی کا ہاتھ انگریزوں کی
طرف بڑھا سکے۔"

عدم مصالحت اور ترک تعاون کے اس شدید تقاضے میں مولنا بہت شدید تھے۔ انھوں نے لکھا کہ

"وہ (مسلمان) تمھارے ان آباد شہروں کو چھوڑ دے جنگلوں میں چلا
جائے۔ وہاں سانپوں کے ساتھ صلح کرلے، بچھوؤں کے ساتھ صلح کرلے مگر
انگریزی گورنمنٹ کے ساتھ صلح نہیں کرسکتا۔"

اسی طرح جمعیۃ علمائے ہند کے اجلاس لاہور (۱۹۲۱ء) میں اعلان کیا کہ

"مسلمانوں کے لئے آسان ہے کہ بچھوؤں کے ساتھ، سانپوں کے ساتھ
صلح کرلیں، پہاڑوں کے غاروں اور بھٹوں میں چلے جائیں۔ وہاں درندوں
کے ساتھ صلح کرلیں مگر یہ ممکن نہیں کہ انگریزوں کے سامنے صلح کا ہاتھ بڑھائیں"۔

ہم لوگ جو آج اُسی ہیجان انگیز اور طوفانی دور سے دور آچکے ہیں، اب بھی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان تحریروں نے کس کس طرح اُس زمانے میں آگ لگا دی ہوگی! مولنا کے سامنے ان کا مطمح نظر بہت ہی واضح تھا اور وہ اس جنگ کو برطانیہ اور مسلمانان ہند کی جنگ نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ جنگ آزادی ہند کے تصور اور تخیل کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے خلافت کمیٹیوں کیلئے بھی یہی مسلک قرار دیا:۔

رکھنی کو آزادی کھو کر مسلمان زندگی بسر کریں۔ مسلمانوں کو مٹ جانا چاہیئے یا آزاد رہنا چاہیئے۔ تیسری راہ اسلام میں کوئی نہیں۔"

" میں مجسٹریٹ کی نسبت بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں ..... زیادہ سے زیادہ سزا جو اُس کے اختیار میں ہے بلا تامل مجھے دیدے، مجھے شکایت یا رنج کا کوئی احساس نہ ہوگا ..... میں اپنا بیان اُسی کے قتیل صداقت کارڈینو برونو کے لفظوں پر ختم کرتا ہوں جو میری ہی طرح عدالت کے کٹہرے کے سامنے کھڑا کیا گیا تھا۔"

" زیادہ سے زیادہ جو سزا دی جا سکتی ہے بلا تامل دے دو۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ سزا کا حکم لکھتے ہوئے جس قدر جنبش تمہارے دل میں پیدا ہوگی اس کا عشر عشیر اضطراب بھی سزا سُن کر میرے دل کو نہ ہوگا۔"

جج نے سزا کا حکم سنا دیا اور مولانا کو ایک سال سے زیادہ عرصہ تک جیل میں رہنا پڑا۔ یہاں سی۔آر۔ داس وغیرہ اُن کے ساتھی تھے۔ سی۔آر۔ داس کو صرف چھ ماہ کی سزا ہوئی تھی اس لئے وہ پہلے ہی رہا ہو گئے اور کانگریس کے اجلاس گیا کے صدر ہوئے۔ اجلاس گیا میں کانگریس کے اندر شدید اختلاف پیدا ہوا جو "تبدیلی پسند" اور "معمول پسند" (CHANGERS AND NO CHANGERS) نامی گروہوں میں مستقل صورت اختیار کرنے لگا۔ ایک طرف گاندھی جی اور ان کے ساتھی تھے جو ترک موالات کے پروگرام کو جاری رکھنا چاہتے تھے اور دوسری جانب سی۔آر۔ داس، موتی لال نہرو اور حکیم اجمل خاں تھے جو کاؤنسلوں میں داخل ہو کر آئینی محاذ پر جنگ کرنا چاہتے تھے۔ بالآخر مؤخر الذکر گروہ نے "سوراج پارٹی" کے نام سے ایک الگ جماعت تیار کر لی اور کاؤنسلوں کے انتخابات کی تیاریاں کرنے لگے۔ جب مولانا جیل سے رہا ہوئے تو انھوں نے کانگریس کے شیرازہ کو منتشر ہوتا ہوا دیکھا۔ آپ نے فوراً دونوں گروہوں میں مصالحت کی سعی شروع کر دی۔ چنانچہ اس مسئلہ کو طے کرنے کے لئے کانگریس کا خصوصی اجلاس دلّی میں (۱۹۲۳ء)

دلوں پر کیا گزرتی ہے۔ محمد علی، شوکت علی، لالہ جپت رائے، پنڈت موتی لال نہرو سب کا سفر پورا ہو گیا اور میں اب تک منزل کے انتظار میں تھا۔ اب منزل میرے سامنے ہے اور میرا دل خوشی سے معمور ہے کہ ایک آخری گروہ فتحمند میں اپنے پیچھے چھوڑ رہا ہوں۔"

پھر علی پور جیل میں مقدمہ شروع ہوا۔ اُس میں مولانا نے ایک تاریخی بیان دیا جو قول فیصل کے نام سے شائع بھی ہو چکا ہے۔ بیان طویل ہے اور اُس کے نقل کا نہ یہاں موقع ہے نہ گنجائش۔ لیکن اس بیان کے مطالعہ سے مولانا کی سیاسی بصیرت، استحکام عزم اور ہمت وجرأت کا واضح پتہ چلتا ہے۔ اس یادگار بیان کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

"یقیناً میں نے کہا اور میرا اقرار صاف اور واضح ہے کہ موجودہ حکومت محض ایک ناجائز حکومت ہے۔"

"اصلاحات "بتدریج توسیع اختیارات" کا مشہور مغالطہ میرے اس صاف اور قطعی اعتقاد میں کوئی غلط فہمی نہیں پیدا کر سکتا کہ آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے اور کسی انسان کو حق نہیں کہ حقوق کی ادائگی میں حق بندی اور تقسیم کرے۔"

"یقیناً میں نے کہا کہ موجودہ گورنمنٹ ظالم ہے لیکن اگر میں یہ نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟ مجھ سے یہ توقع کی جائے کہ ایک چیز کو اس کے اصلی نام سے نہ پکاروں؟ میں سفید کو سیاہ کہنے سے انکار کرتا ہوں۔ میں کم سے کم اور نرم سے نرم الفاظ جو اس بارے میں بول سکتا ہوں یہی ہیں۔ ایسے ملفوظ صداقت جو اس سے کم ہو میرے علم میں نہیں۔ میں یقیناً کہتا رہا ہوں کہ ہمارے فرض کے سامنے دو ہی راہیں ہیں۔ گورنمنٹ ناانصافی اور حق تلفی سے باز آجائے اگر باز نہیں آسکتی تو مٹا دی جائے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔"

"اسلام کی تعلیم اسکی کتاب میں موجود ہے۔ وہ کسی حال میں بھی جائز نہیں

ہمخیالوں کو بجد پریشان و متفکر دیکھا۔ گاندھی جی نے اتحاد کی خاطر ۲۱ دن کا برت رکھا۔ چنانچہ مولانا آزاد ہی کی کوششوں سے دلی میں ہندو اور مسلمان لیڈروں کا ایک عظیم الشان اجتماع ہوا اور ان لوگوں نے ہندو مسلم اتحاد کے قائم کرانے کے لئے کوششیں کرنے کا عہد کیا اور مہاتما گاندھی نے اپنا برت ختم کیا۔ اس کے بعد ملتان کے فرقہ وارانہ جھگڑوں کی تحقیقات کے لئے جو کمیٹی بنی اس میں موتی لال نہرو کے ساتھ مولانا بھی شریک تھے۔ پھر ناگ پور میں موتی لال نہرو کے ساتھ انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں سمجھوتہ کرایا، بمبئی اور کلکتہ میں بھی بڑے بڑے اجتماعات کی قیادت اور اتحاد کی تلقین کرتے رہے اور ۱۹۲۷ء میں شملہ کی اتحاد کانفرنس میں بھی پیش پیش رہے اور سرگرم حصہ لیا۔ بہت سے ساتھی جیسے محمد علی، شوکت علی وغیرہ آخر میں راستہ کترا گئے مگر مولانا نے آخر دم تک اپنا راستہ نہیں بدلا۔

۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن کے تقرر کا اعلان ہوا۔ نومبر ۱۹۲۷ء میں کلکتہ میں مولانا کی زیر صدارت ایک جلسہ ہوا اور کمیشن کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا گیا۔ ابتدائے ۱۹۲۸ء میں مولانا نے لاہور، امرت سر، راولپنڈی اور دہلی وغیرہ مقامات کا دورہ کیا۔ سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی کامیابی بڑی حد تک مولانا کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ کی طرف اشارہ ضروری ہے۔ ابھی مولانا آزاد جیل ہی میں تھے کہ پنڈت مدن موہن مالویہ، سی۔ آر۔ داس اور مولانا سے جیل میں ملنے آئے۔ وہ حکومت اور کانگرس کے مابین مصالحت کرانا چاہتے تھے۔ سی۔ آر۔ داس اور مولانا نے یہ تجویز منظور کر لی کہ اگر تمام گرفتار شدگان کو چھوڑ دیا جائے اور ایک گول میز کانفرنس کر کے ہندوستان کی سیاسی گتھیوں کو سلجھانے کی پُرخلوص کوشش کی جائے تو بائیکاٹ کا پروگرام ختم کیا جا سکتا ہے لیکن اس تجویز کو گاندھی جی نے ٹھکرا دیا اور کہا کہ رہائی غیر مشروط ہونا چاہیئے۔ اسے حکومت نے نہ مانا اور مصالحت کی بات چیت ختم ہو گئی۔ بائیکاٹ زوروں پر ہوا اور مولانا نے اس میں زبردست حصہ لیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا جماعتی ضبط پسندی کے قائل تھے اور قومی معاملات میں ضد کو قریب نہیں آنے دیتے تھے۔

طلب کیا گیا ۔ اس اجلاس کی صدارت مولانا آزاد نے کی ۔ اُس وقت اُن کی عمر پینتیس سال کی تھی۔ اس طرح مولانا آزاد کانگریس کے سب سے کمسن صدر ہوئے ۔ جہاں سی۔ آر۔ داس، موتی لال نہرو، ولبھ بھائی پٹیل، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری ایسے جلیل القدر قائدین موجود ہوں وہاں نظر انتخاب کا نوجوان ابوالکلام آزاد پر پڑنا اس بات کا ثبوت ہے کہ کانگریسی حلقے آپ کی اصابت رائے اور ہر دلعزیزی کے قائل تھے ۔

اس وقت صرف کانگریس کا اندرونی انتشار نہیں تھا بلکہ قربانی گاؤ، شدھی، تبلیغ اور اس طرح کے مسائل کو لے کر حکومت برطانیہ کی شہ پر فرقہ پرست بھی پوری قوت سے میدان میں اُتر آئے تھے ۔ مولانا آزاد نے فرقہ واریت پر بھی اجلاس دلّی کے خطبۂ صدارت میں بھرپور وار کیا ۔

"آج ہمیں ہندوستان میں نہ کسی ہندو سنگھٹن کی ضرورت ہے نہ مسلم سنگھٹن کی ۔ ہمیں صرف ایک سنگھٹن کی ضرورت ہے، اور وہ ہے انڈین نیشنل کانگریس"

غلطی ہوگی اگر اسے صرف اپنی پارٹی کی حمایت سے تعبیر کیا جائے کیونکہ ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ انھوں نے ۱۹۱۱ء سے بلند کرنا شروع کر دیا تھا جب وہ کانگریس میں شامل نہیں تھے بلکہ اپنے ہم مذہب فرقہ پرستوں سے مصروف جنگ تھے ۔ ۱۹۲۳ء کے اجلاس کانگریس میں انھوں نے اپنے ایمان و اعتقاد کا اعلان ولولہ انگیز الفاظ میں کیا :-

"آج ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں میں سے اُتر آئے اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج ۲۴ گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے تو میں سوراج سے دست بردار ہو جاؤں گا مگر اس سے دست بردار نہ ہونگا ۔ کیونکہ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے "

جیل سے واپسی پر مولانا نے شیرازۂ اتحاد کو درہم برہم پایا اور مخصوص گاندھی جی اور اُن کے

آپ کو کلکتہ میں گرفتار کر لیا گیا۔ آپ کی گرفتاری پر ہندستان گیر ہڑتال ہوئی۔ مولنا کو اس بار چھ ماہ کی سزا ملی۔

سال کے خاتمے تک حکومت نے کارروائیوں کا رخ بدلا اور ایک گول میز کانفرنس کے انعقاد کی تیاریاں کرنے لگی۔ اس لئے گاندھی جی اور ممبران ورکنگ کمیٹی کی رہائی ضروری تھی۔ چنانچہ جنوری ۱۹۳۱ء میں یہ لوگ رہا کر دئے گئے۔ یہ رہائی گاندھی۔ اروِن گفت و شنید اور بالآخر گاندھی۔ اروِن معاہدہ کا پیش خیمہ ثابت ہوئی جس کی رو سے سول نافرمانی مشروط طور پر ملتوی کر دی گئی اور اسی سال کراچی کانگریس میں گاندھی جی کو گول میز کانفرنس کے لئے کانگریس کا نمائندہ منتخب کیا گیا۔ گاندھی جی اگست میں لندن کے لئے روانہ ہوئے۔ اس کے پہلے ہی رجعت پسندوں کو ابھارا جا رہا تھا اور جداگانہ انتخاب کے نعرے بڑے زور و شور سے بلند کئے جا رہے تھے۔ یہ بالکل ظاہر تھا کہ یہ بیرونی اقتدار کے اشارے پر کیا جا رہا ہے اور ایسے وقت کا انتخاب کیا گیا ہے جب کہ گول میز کانفرنس کا انعقاد ہونے ہی والا تھا۔ اس لئے مولنا نے مسلمانوں کے صحیح موقف کو دنیا پر واضح کرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ انھوں نے ۷ جولائی کو بمبئی میں مسلم نیشنلسٹ کانفرنس کا ایک اجلاس منعقد کرایا اور اس پلیٹ فارم سے بحیثیت مشترکہ انتخاب کی حمایت کرائی اور رجعت پسندوں کی قلعی کھول کے رکھ دی۔ پھر ۱۰ جولائی کو یو۔پی مسلم نیشنلسٹ کانفرنس کے پلیٹ فارم سے مولنا نے یہی آواز زوردار طریقے پر بلند کرائی۔ اکتوبر کے مہینے میں پنجاب میں قوم پرور مسلمانوں کی کانفرنس منعقد ہوئی اور آپ اس کے صدر منتخب ہوئے لیکن خرابیٔ صحت کی وجہ سے نہ جا سکے۔

اسی سال ۲۹ جولائی کو آپ کشمیر کے فسادات کے سلسلے میں سری نگر بھی تشریف لے گئے۔

گول میز کانفرنس کا حشر پہلے ہی سے معلوم تھا۔ تمام حجت مقصود تھا۔ چنانچہ گاندھی جی ناکام لوٹے اور جنگ آزادی کی تیاریاں از سر نو ہونے لگیں۔ اس موقع پر مولنا نے قوم پرور مسلم کانفرنس کی جانب سے ایک پرزور بیان شائع کر کے مسلمانوں سے اپیل کی کہ کانگریس جو تحریک عنقریب شروع کرنے والی ہے اس میں تن من دھن سے شامل ہوں۔ ۲۴ جنوری ۱۹۳۲ء کو ہندستان کے مسلمانوں کی ایک کانفرنس لکھنؤ میں منعقد ہوئی جس نے فیصلہ کیا کہ گول میز کانفرنس کے سلسلے میں جو کمیٹیاں یہاں

۱۹۲۹ء سے کانگریس کی تحریک آزادی نے نیا رخ اختیار کیا اب ہندوستان نے یہ اعلان کر دیا کہ مکمل آزادی سے کم پر وہ رضامند نہیں ہو سکتا اور حکومت کو ایک سال کی مہلت دی کہ اگر اس دوران میں مطالبہ آزادی منظور نہیں کیا گیا تو سول نافرمانی شروع کر دی جائے گی۔ حکومت اپنی جگہ اڑی رہی اور اس نے سال کے اندر کوئی اقدام کرنے سے انکار کر دیا۔ اس ایک سال کے عرصے میں کانگریسی حلقے آنے والی تحریک کی تیاریاں کرتے رہے جس میں مولانا شریک رہے۔ جمعیۃ العلماء اور خلافت کمیٹیوں کے علاوہ ایک نیا ادارہ نیشنلسٹ پارٹی کے نام سے وجود میں آیا تھا جس کا پہلا جلسہ الہ آباد میں ابوالکلام آزاد کی صدارت میں ہوا۔ ڈاکٹر انصاری اور تصدق احمد خاں شروانی اس کی روح رواں تھے۔ یہ فرقہ پرستی کے خلاف ایک اور اعلان جہاد تھا۔ نہرو رپورٹ اور دوسرے عوامل کی بنا پر حقوق کی تقسیم کے سوال نے اس وقت خاصی اہمیت اختیار کر لی تھی۔ اس نئی کروٹ کا انسداد کرنا تھا۔ اس لئے ۹ جنوری سنہ ۱۹۳۰ء کو مولانا اور ڈاکٹر انصاری نے ایک مشترکہ بیان اس نیشنلسٹ پارٹی کی جانب سے شائع کیا کہ ”چونکہ مکمل آزادی حاصل کرنے کے لئے جدوجہد شروع ہو چکی ہے اس لئے حقوق کی تقسیم کا سوال پس پشت ڈال دینا چاہیئے۔ لڑائی کے وقت حقوق کی تقسیم کا ذکر، خواہ وہ حقوق کتنے ہی منصفانہ کیوں نہ ہوں نامناسب اور بے محل ہے۔ اس لئے کانگریس کے فیصلہ لاہور کے بعد حالات کا تقاضہ یہ ہے کہ حقوق کی تقسیم کی جگہ آزادی کی لڑائی لے لے“ ۱۳ مارچ سنہ ۱۹۳۰ء کو کانگریس نے لڑائی کا اعلان کر دیا اور ۶ اپریل سے ستیہ گرہ کے پروگرام پر زور و شور سے عمل درآمد شروع ہو گیا۔ ستیہ گرہ کے لئے مولانا نے ہندوستانی عوام کو علی العموم اور مسلمانوں کو علی الخصوص للکارا۔ یہ آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ بنگال، پنجاب اور سرحد ایسے صوبوں تک بھی لاکھوں مسلمانوں نے ستیہ گرہ میں حصہ لیا اور ہزاروں گرفتار ہوئے۔ اب قانون شکنی شروع ہوئی۔ نمک ستیہ گرہ کے سلسلے میں گاندھی جی مئی کے مہینے میں گرفتار ہو گئے۔ چونکہ یہ پہلے سے معلوم تھا کہ گرفتاریوں کا سلسلہ جاری رہے گا اس لئے جب ایک ڈکٹیٹر گرفتار ہو جاتا تھا تو گرفتاری سے پہلے کسی دوسرے کو ڈکٹیٹر مقرر کر جاتا تھا۔ چنانچہ اگست سنہ ۱۹۳۰ء میں سردار پٹیل کی گرفتاری کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد ڈکٹیٹر مقرر ہوئے۔ لیکن کل گیارہ دن کی ڈکٹیٹری کے بعد

صوبوں میں ہنگامی قوانین اور آرڈی نینسوں نے ایک ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ قید خانے بھرے جا رہے تھے، لاٹھی چارج، تازیانے، فائرنگ، نظر بندیاں سیاسی جماعتوں پر پابندیاں اور اُن کا خلافِ قانون قرار دیا جانا روز روز کا دستور بن گیا تھا۔ ہمارے لیڈر کبھی جیل میں جاتے اور کبھی باہر آتے، تحریک چل رہی تھی، اسمبلیوں کا بائیکاٹ بھی جاری تھا۔

لیکن اسی عرصہ میں آئندہ انتخابات کے لئے تیاریاں بھی ہونے لگیں۔ مولانا کو شروع ہی سے قانون ساز جماعتوں کے انتخابات سے دلچسپی نہ تھی۔ اُن کا خیال تھا کہ آزادی کی لڑائی اسمبلیوں میں نہیں بلکہ اسمبلیوں کے باہر لڑی جانا چاہیئے۔ یہ خیال انھیں کا نہیں تھا بلکہ اور بھی بہت سے افراد کا تھا جنھیں بعض لوگ انتہا پسند اور بعد میں بائیں بازو والے کہنے لگے۔ یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ مولانا کبھی باقاعدہ طور سے "بائیں بازو والوں" میں شامل نہیں ہوئے بلکہ اُن کا شمار گاندھی جی کے ساتھیوں اور "دائیں بازو والوں" میں ہی ہوتا رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ دونوں گروہوں کے درمیان ایک درمیانی کڑی تھے اور آپ کی یہ حیثیت برابر قائم رہی۔ آپ نے کبھی بھی کانگریس کے اندر کسی ایک بازو، جتھہ، یا گروہ سے اپنے کو وابستہ نہیں کیا۔ غرض اختلاف کے باوجود مولانا نے انتخابات لڑنے کے لئے کوشش کرنے والوں کو رد کا نہیں کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ آزادی کے لئے اگر یہ محاذ بھی قائم ہو گیا تو کچھ زیادہ بُرا تو نہیں ہے۔ شاید تحریک کو کچھ سہارا ہی ملے گا۔ اس خیال سے مولانا نے انتخابات کے سلسلے میں کسی کوشش اور سعی سے دریغ نہیں کیا بلکہ پٹنہ کے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں پارلیمنٹری اُمور کے لئے جو سب کمیٹی بنائی گئی اس کی ممبری بھی قبول کرلی۔ انتخابات لڑے گئے اور کانگریس کی کامیابی نے مخالفین کو انگشت بدنداں کر دیا۔ یہ کہنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کامیابی میں مولانا کی کوششوں کو بڑا دخل تھا۔

چونکہ پارلیمنٹری محاذ پر تحریک کی بات چل پڑی ہے اس لئے یہ بتاتے چلنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ نے ۱۹۳۵ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس کر دیا۔ اس کے دو حصے تھے، (۱) وفاقی (۲) صوبہ جاتی۔ پہلے صوبہ جاتی حصہ پر عملدرآمد ہونے والا تھا۔ حکومت اور اس کے

ان کا بائیکاٹ کیا جائے۔

مقاطعہ کا پروگرام چلتا رہا۔ ۱۵ر فروری ۱۹۳۲ء کو قائم مقام ڈکٹیٹر سردار سردول سنگھ کوشیر کی گرفتاری پر مولنا آزاد قائم مقام ڈکٹیٹر بنائے گئے۔ پھر ۲۶ر فروری ہی کو آپ پر حکومت نے یہ حکم تعمیل کرایا کہ آپ سول نافرمانی کی تحریک میں ایک مہینے تک کسی قسم کا حصہ نہیں لے سکتے، لیکن بھلا مولنا کب ماننے والے تھے انھوں نے کھلم کھلا خلاف ورزی کی، اور دلی میں نظر بند کر دیے گئے۔ نظر بندی کا سلسلہ یہی تک رہا۔ ادھر رجعت پسند فرقہ وارت کی آگ بھڑکانے میں مصروف تھے ہی کمیونل وارڈ نے لچل مچادی۔ مولنا نے اسکی شدت سے مخالفت کی۔ مولنا محسوس کر رہے تھے کہ فرقہ وارانہ اتحاد بہت ضروری ہے۔ اس لئے انھوں نے رہائی کے بعد اتحاد کے لئے کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی اور اس سلسلے میں اتنا کام کیا کہ صحت برباد کر لی۔ ۱۶ر اکتوبر کی آل پارٹیز مسلم کانفرنس جو لکھنؤ میں منعقد ہوئی تھی اس سلسلے کی اہم کڑی تھی۔ پھر الہ آباد میں ایک اتحاد کانفرنس ہوئی جس میں تمام فرقوں کے زعمار نے ایک مشترک لائحہ عمل بنا بھی لیا لیکن انگریزی حکومت کی شہ پر فرقہ پرست مخالفت کرتے رہے۔ مولنا بھی برابر ان لیڈروں کو بے نقاب کرتے رہے۔

۱۹۳۱ء کے بعد ستیہ گرہ ملتوی ہوتی رہی، مگر گرفتاریاں جاری رہیں تشدد کا دور دورہ بدستور رہا۔ حکومت کی طرف سے عارضی طور سے اپنے مصالح کے ماتحت کبھی کبھی التوائے تشدد ہو جاتا تھا لیکن یہ بہت ہی عارضی ہوتا تھا۔ کانگریس کی تحریک جو اب ایک متوسط طبقے کی ہی تحریک نہیں رہ گئی تھی بلکہ رفتہ رفتہ اشتراکی خیالات کے اثرات کو بھی قبول کرتی جا رہی تھی، کسانوں اور مزدوروں کی تحریک بن چکی تھی بالخصوص یو۔پی میں جواہر لال نہرو، گوبند بلبھ پنت، رفیع احمد قدوائی، تصدق احمد شیروانی، پرشوتم داس ٹنڈن وغیرہ کی قیادت میں عدم ادائگی لگان کی زبردست تحریک ابھر چلی تھی، جس کے اثرات بہار تک پھیل رہے تھے۔ سرحد میں خدائی خدمتگار، خان عبدالغفار خاں کی قیادت میں نہایت ہی جوش وخروش اور ضبط و تنظیم کے ساتھ ایک پُر امن تحریک چلا رہے تھے۔ بنگال کے نوجوان تشدد و عدم تشدد کے خط فاصل کی پروا کئے بغیر سامراج سے برسرپیکار تھے اور ان تینوں

اس یقین دہانی کے بعد کانگریس وزارتیں قبول کر سکتی ہے لیکن جب گورنروں سے اس یقین دہانی کا
مطالبہ کیا گیا تو انھوں نے انکار کیا۔ چنانچہ کانگریس نے بھی وزارتوں کی تشکیل سے انکار کر دیا۔

بہرحال یہ صورت قطعی اور آخری نہیں تھی گفت و شنید کے دروازے بند نہیں ہوئے تھے
اور بالآخر چند مہینوں کے بعد وائسرائے کے ایک توضیحی بیان شائع کر دینے پر کانگریس نے وزارتیں
قبول کر لیں۔ اب کانگریس پر پارلیمنٹری محاذ پر بڑی ذمہ داریاں آگئی تھیں۔ وزیروں کا انتخاب
پالیسی کا تعین، دوسرے انتخابی مسائل۔ ان کے لیے ایک علیحدہ پارلیمنٹری بورڈ قائم کیا گیا
جس کے ممبر مولانا آزاد، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور سردار ولبھ بھائی پٹیل تھے۔ مولانا آزاد کے سپرد
بنگال، بہار، یوپی، سندھ اور صوبہ سرحد کے پارلیمنٹری معاملات تھے۔ اسکے علاوہ مسلمان وزرا
کے انتخاب کے مسئلہ پر اور دوسرے ایسے تمام معاملات پر جن کا تعلق مسلمانوں سے ہو مولانا کی رائے
ضرور لی جاتی تھی اور اسکی قدر کی جاتی تھی۔

اس دور میں کئی اہم امور آپ نے بحسن و خوبی انجام دئے۔ صوبہ سرحد میں کانگریس وزارت کا
قیام اور اسی طرح صوبۂ آسام میں سعداللہ وزارت کے خاتمہ کے بعد مشترکہ کانگریسی وزارت کا قیام آپ ہی
کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ سی۔ پی میں ڈاکٹر کھرے اور صوبائی کانگریس میں اختلاف ہوا اور ڈاکٹر کھرے
نے جماعتی ضبط کی پروا نہ کرتے ہوئے گورنر کا سہارا ڈھونڈھا اور اپنی نئی وزارت قائم کی۔ مولانا کو
اس امر کی تحقیقات سپرد کی گئی۔ ڈاکٹر کھرے مجرم ثابت ہوئے اور انھیں وزارت سے مستعفی ہونا
پڑا۔ پھر کانگریس پارٹی نے پنڈت روی شنکر شکلا کو لیڈر منتخب کیا۔ اس طرح وزارتی محاذ پر موقع پرستی
کی بدولت جو پہلا خطرہ نمودار ہوا تھا اسے مولانا نے بروقت ختم کیا۔ اسی طرح صوبہ سندھ میں کانگریس پارٹی
اور اللہ بخش وزارت کے مابین زمین کا لگان گھٹانے کے مسئلہ پر اختلاف ہو گیا۔ آپ نے وہاں پہنچ کر
اس اختلاف کے سبب کو دور کیا۔ کچھ دنوں بعد سکھر باندھ کے مسئلے پر ان دو جماعتوں میں پھر اختلافات
رونما ہوئے اور مولانا کو ایک بار پھر مسائل کے سلجھانے کی سعی کرنا پڑی۔ ادھر بہار میں کچھ دنوں پہلے
کسانوں اور زمینداروں کے مابین ایک پرشور کشمکش رونما ہوئی تھی۔ بالآخر مولانا ہی کے مساعی سے یہ قضیہ

کانگریس اس کو صوبائی خودمختاری کا نام دیتے تھے لیکن درحقیقت یہ کوئی خودمختاری نہیں تھی اتنے تحفظات
تھے اور گورنر کے خصوصی اختیارات کی فہرست اتنی طویل تھی کہ صوبائی وزارتوں کے اختیارات بے معنی
سے ہوگئے تھے۔ اس آئین کی ہندوستان میں شدید مخالفت ہوئی اور کوئی بھی گروہ، سوائے
مفادات خصوصی رکھنے والوں کے، اس سے خوش نہیں تھا۔ احتجاج پر احتجاج ہو رہے تھے کہ ایسا
آئین ہندوستانیوں پر اُن کی مرضی کے خلاف لادا جا رہا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ صوبوں میں جو انتخابات
ہونے والے تھے اُن سے انکار کرنا بھی ناممکن تھا کیونکہ پھر برطانوی حکومت یہی ڈھنڈورا پیٹتی
جیسے کہ وہ پیدا کرتی تھی کہ چند مختاروں کے علاوہ عامۃ الناس کانگریس کے ساتھ نہیں ہے۔ اس لئے انتخابات
کی مہم میں شرکت پر کوئی خاص اختلاف رائے نہیں تھا البتہ یہ بحث چھڑ گئی کہ آئین کے صوبائی
حصے کے نفاذ کے بعد کانگریس کو صوبوں میں وزارت قبول کرنا چاہیے یا نہیں۔ اس میں اختلاف رائے
اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ خود ورکنگ کمیٹی میں دو رائیں تھیں۔ جواہر لال نہرو مخالفین میں سب سے
نمایاں تھے لیکن موافقین میں بابو راجندر پرشاد اور سردار پٹیل کے ساتھ تھے۔ ۱۹۳۶ء میں
فیض پور کے اجلاس کانگریس میں یہ مسئلہ قطعی طور سے طے نہیں ہو پایا مگر انتخابات سر پر آگئے تھے
اس لئے لوگ انتخابی مہم میں مشغول ہو گئے۔

نتائج کے اعتبار سے یہ مہم شاندار رہی۔ گیارہ صوبوں میں سے چھ صوبوں میں کانگریس
نے اکثریت حاصل کرلی۔ دو اور صوبوں یعنی آسام اور صوبہ سرحد میں اگرچہ کانگریس اکثریت میں
نہیں تھی لیکن اور جماعتوں کے مقابلے میں اس کے ممبروں کی تعداد زیادہ تھی۔ بہرحال چھ صوبوں
میں تو واضح طور سے صورت حال ایسی ہوگئی تھی کہ وہاں کانگریس کے تعاون کے بغیر وزارتیں قائم
ہی نہیں ہو سکتی تھیں، اس لئے وزارتوں کی تشکیل کے مسئلے نے خاص اہمیت اختیار کرلی۔ مارچ
۱۹۳۷ء میں دلی میں منتخب ممبران کانگریس اور زعمائے کانگریس کا ایک کنونشن طلب کیا گیا اور اس
کنونشن میں یہ قرار پایا کہ وزارتوں کے قیام سے پہلے گورنروں سے یہ عہد لیا جائے کہ وہ وزارت کے
کاموں میں ...... وزراء کے مشوروں پر عمل کریں گے اور اپنے تحفظات کا استعمال نہ کریں گے۔

شریک رہے اور جو مشترکہ پالیسی بنی اسکی تشکیل میں مولنٰا کا بڑا ہاتھ تھا۔ یہاں واردھا تعلیمی اسکیم پر غور وخوض کیا گیا۔ اس کے کچھ دنوں بعد مولنٰا نے بہار میں ہندوستانی کمیٹی کے اجلاس کی صدارت بھی فرمائی تھی۔ یہ کمیٹی نے ہندوستانی لغت، قواعد اور زبان کے بارے میں غور وخوض کیا تھا۔ بعد میں یو۔ پی حکومت کی جانب سے عربی اور فارسی زبانوں کے تعلیمی نصاب میں مناسب تغیر وتبدل کرنے کے لئے بھی ایک کمیٹی مولنٰا ہی کی صدارت میں قائم ہوئی تھی۔ اس طرح ہندوستان کی وزارت تعلیم کا بار سنبھالنے کے بہت پہلے، اس وقت بھی جب آزادی صرف ایک خواب کی حیثیت رکھتی تھی، مولنٰا نے ہندوستان کے تعلیمی مسائل سے گہری اور عملی دلچسپی لینا شروع کردی تھی۔ آنے والے واقعات کی پرچھائیاں پہلے ہی سے نظر آنے لگتی ہیں!

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ ہم سرسری طور پر کانگریس کو جماعتی طور سے اور کانگریسی لیڈروں کو اندرونی طور سے جن مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اس کا تذکرہ کر رہے تھے اور یہ دکھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ مولنٰا نے کس طرح جماعتی اتفاق اور ملکی اتحاد کو برقرار رکھنے کے لئے لگاتار کوششیں کیں۔ اس میں شک نہیں کہ اتحاد ان کا محبوب ترین نعرہ تھا اور اس نعرہ کو عملی شکل دینے کے لئے وہ کوئی قربانی بڑی نہیں سمجھتے تھے۔ اس عرصہ میں پرانی قیادت اور نوجوان قیادت کے مابین ایک رسہ کشی جاری تھی۔ نئی قیادت میں لوگ عام طور سے بائیں بازو سے تعلق رکھتے تھے مگر نظریات میں بہت سے فروعی مسائل بھی تھے۔ نئی قیادت کے لیڈر پنڈت نہرو، سبھاش چندر بوس اور جے پرکاش نرائن وغیرہ تھے لیکن یہ سب کسی ایک کڑی میں منسلک نہیں تھے۔ پنڈت نہرو، مولانا آزاد کے بعد دونوں جماعتوں کے درمیان ایک پل سا نظر آنے لگتے تھے۔ سبھاش چندر بوس کے خیالات سراسر باغیانہ تھے اور وہ اگرچہ اشتراکیت کی بات چیت کرتے تھے لیکن ان کی اشتراکیت آمریت سے بھی صلح کر لیتی تھی۔ جے پرکاش نرائن کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے روح رواں تھے۔ اس کے علاوہ بنگال میں اشتمالیوں اور دہشت پسندوں کے بھی کچھ گروہ تھے، کچھ آزاد قسم کے مزدوروں، کسانوں، نوجوانوں اور طالب علموں کے بھی ادارے تھے اور کچھ آزاد خیال کانگریسی بھی تھے جو کانگریس کی پرانی قیادت سے بیزار تھے۔ ہری پورہ کانگریس کے لئے

طے ہوا۔ اسی طرح بہار میں سیاسی قیدیوں کی رہائی کے مسئلہ نے نازک صورت حال اختیار کرلی تھی سیاسی قیدیوں نے ہزاری باغ جیل میں بھوک ہڑتال کر رکھی تھی اور کانگریس وزارت کے خلاف ایک عام بےچینی پیدا ہوچلی تھی۔ مولانا کی مداخلت کی بدولت بھوک ہڑتال ختم ہوئی۔ سرحد میں بھی فروری ۱۹۳۸ء میں وہاں کی صوبہ کانگریس کمیٹی اور وزارت کے مابین اختلافات رونما ہوگئے تھے۔ آپ پشاور تشریف لےگئے اور دونوں گروہوں کے مابین مصالحت کراکے اتحاد و اتفاق کی فضا پیدا کرائی۔ ۱۹۳۸ء ہی میں لکھنؤ میں تحریک مدح صحابہ و تبرا چل پڑی اور شیعوں اور سنّیوں میں اس مسئلے میں اختلافات اتنے بڑھے کہ آپس میں کشت و خون کی نوبت پہنچ گئی اور تحریک کے سلسلے میں دس بارہ ہزار افراد جیل گئے۔ باہمی سمجھوتے کی ہر کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ پھر مولانا خود بہ نفس نفیس لکھنؤ تشریف لائے اور طرفین کے زعماء و علماء سے گفت و شنید کرکے سب سے پہلے تو ایجی ٹیشن بند کرایا۔ مصالحت فوری طور پر تو نہیں ہوسکی، لیکن اُن کی کوششوں کی وجہ سے فضا میں سکون ضرور پیدا ہوگیا کیونکہ مولانا مسئلہ کی نزاکت کے باوجود دونوں جماعتوں میں احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے اور اگر کوئی ایسا تھا جو دونوں کے مابین مصالحت کی گفتگو کرسکے تو وہ انھیں کی ذات تھی۔

بنگال میں سیاسی نظربندوں کی رہائی کا مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کرگیا تھا۔ سارے صوبے میں ایک عام بےچینی تھی۔ گاندھی جی نے اس مسئلہ کے حل کی طرف توجہ کی اور بنگال پہنچے۔ وہاں وزرائے بنگال اور گورنر بنگال سے گفت و شنید ہوئی جس میں مولانا نے بھی حصہ لیا اور اس گفت و شنید کے نتیجہ میں ہزاروں قیدیوں اور نظربندوں کی رہائی عمل میں آئی۔ بنگال میں صوبہ کانگریس کمیٹی کے جھگڑے بھی اُٹھ کھڑے ہوئے اور شدت اختیار کرتے جاتے تھے۔ مولانا کی کوششوں سے سبھاش چندر بوس اور بدھان چندر رائے کے درمیان مصالحت کی گفتگو شروع ہوئی۔

پارلیمنٹری محاذ پر اور بھی چند امور پیش آئے۔ چنانچہ مئی ۱۹۳۸ء میں بمبئی میں تمام کانگریسی صوبوں کے وزرائےاعظموں کی ایک کانفرنس ہوئی۔ اس کانفرنس میں مزدوروں اور کسانوں کے مسائل، زراعتی اُمور، تعلیمی اور سماجی بہبودی وغیرہ کے بارے میں ایک مشترکہ پالیسی کی تشکیل کی گئی۔ تمام مذاکرات میں مولانا

بڑے بڑے مسائل تو اقتصادی اور سماجی تھے، اگر ان میں اُلجھنیں ہوتیں تو پھر نفاق کے لئے میدان کہاں ملتا، غریبی، تنگدستی، بے کاری، مرض۔ یہ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی میں امتیاز کہاں کرتے تھے؟ اس لئے فرقہ وارانہ جماعتیں جان بوجھ کر نشستوں، ملازمتوں، وزارتوں کے جھگڑے لے کر کھڑی ہوجاتی تھیں۔ خلیق الزماں وغیرہ کی وزارت سے مایوسی نے انھیں اور ان کے ہمنواؤں کو اور زیادہ شدت سے فرقہ پسند بنا دیا۔ ایک موقع پر مولانا نے اُنھیں کانگریس وزارت میں شمولیت پر آمادہ بھی کر لیا تھا۔ مولانا کا خیال تھا کہ اس شمولیت سے فرقہ پرستوں کا زور ٹوٹ جائے گا۔ وقتی طور سے شاید ایسا ہو بھی جاتا لیکن کانگریس وزارتیں جو زرعی اصلاحیں اور سماجی قوانین بنا رہی تھیں اُس کے پیش نظر راجہ محمود آباد، راجہ پیرپور، راجہ سلیم پور اور دوسرے لیگی لیڈروں کو اس سے کون روک سکتا تھا کہ وہ اور نمائشی لیڈر پیدا کرکے فرقہ پرورانہ نعرے لگوائیں اور فضا میں تکدر پیدا کرائیں۔ اب تو اُن کو ایک نادر موقع یہ ہاتھ لگا تھا کہ کانگریس کئی صوبوں میں برسر اقتدار تھی۔ اس لئے اس پر فرقہ پرستی کا الزام تراشنے لگے۔ نوکر شاہی اور سامراجی طاقت اُن کی پشت پناہی پر تھی۔ فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا کرانا اور پھر کانگریس کو مورد الزام گردانا، یہی اُن کا بہترین مشغلہ رہ گیا تھا۔ ان لوگوں نے پیرپور کمیٹی بنائی اور جھوٹے سچے الزاموں کی ایک فہرست تیار کر دی۔ بنگال کے وزیر اعظم مسٹر فضل الحق نے یہ بھی الزام تراشا کہ کانگریسی اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں پر بہت ظلم کئے گئے۔ مولانا نے مسٹر فضل الحق کو چیلنج کیا کہ "وہ ایسے کسی بھی ایک کانگریسی صوبے کا نام بتائیں جہاں مسلمانوں کو تنگ کیا گیا ہو اور اگر ان کے لگائے ہوئے الزام صحیح ثابت ہوئے تو میں انھیں یقین دلاتا ہوں کہ مسلمانوں کی ساری شکایتیں دور کرانے کی کوشش کی جائیگی لیکن میری یہ صاف رائے ہے کہ یہ الزام سراسر بے بنیاد ہیں" مولانا سے زیادہ واقعات کو کون جان سکتا تھا۔ کانگریس پارلیمنٹری بورڈ کے ایک ممبر کی حیثیت سے وہ تمام معاملات اُن کے سامنے پیش ہوتے تھے جس میں فرقہ واریت کا شائبہ بھی ہوتا ہو۔ جو مولانا کی افتاد طبیعت سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگر انھیں یقین ہو جاتا کہ کہیں کوئی ناانصافی ہوئی ہے تو وہ فوراً اُس کا انسداد کراتے۔ وہ جھجکنے اور ڈرنے والوں میں نہیں تھے۔ یہ بات اب راز نہیں ہے کہ انھوں نے صاف صاف اعلان

سُبھاش بابو کی صدارت کے بعد اس کشمکش نے زور پکڑنا شروع کیا۔ خود ہری پورہ میں پہلے مولانا کا نام صدارت کے لئے پیش ہوا تھا لیکن چونکہ سبھاش بابو نے انتخاب لڑنے کا ارادہ ظاہر کیا، اسلئے مولانا نے اپنا نام واپس لے لیا۔ ایک بار جب دلّی کے اے۔ آئی۔ سی۔ سی کے اجلاس میں سُبھاش بابو صحت کی خرابی کی بنا پر شرکت نہ کر سکے تو مولانا ہی نے صدارت کی۔ بہر حال قدیم و جدید کی کشمکش جاری رہی، اگرچہ ابھی تک واضح گروہ نہیں بن پائے تھے۔

کانگریس کا اگلا اجلاس تری پورہ میں ہونے والا تھا اور صدر کے انتخاب کا مسئلہ سامنے آ گیا تھا۔ ہائی کمان آپ کو صدر بنانا چاہتا تھا اور آپ نے منظوری بھی دیدی تھی لیکن بعد میں صحت کی خرابی کی بنا پر آخر میں آپ نے معذوری ظاہر کی۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے مجبور ہو کر ڈاکٹر پٹابھی سیتا رامیہ کا نام صدارت کے لئے تجویز کیا۔ اس تجویز کے محرکین میں مولانا بھی تھے۔ ورکنگ کمیٹی کے ارکان نے سُبھاش چندر بوس سے درخواست کی کہ وہ الکشن نہ لڑیں اور انتخاب کو بلا مقابلہ ہو جانے دیں لیکن وہ اس پر رضامند نہ ہوئے اور بالآخر پہلی مرتبہ کانگریس کی صدارت کے لئے ایسا اہم بالشان الکشن ہوا۔ اس میں سُبھاش چندر بوس کامیاب ہوئے۔ گاندھی جی نے ڈاکٹر پٹابھی سیتا رامیہ کی شکست کو اپنی شکست قرار دیا اور اسے اپنی پالیسی پر عدم اعتماد کا ووٹ سمجھے۔ ہائی کمان کے بارہ ممبروں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا۔ ان میں مولانا آزاد بھی شامل تھے۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے جس طرح سیتا رامیہ کی صدارت میں کوشش کی تھی اس کے بعد ان کا ہار جانا، ان کی شکست ہی تھی۔ لیکن گاندھی جی اور ملک کے تمام اہم لیڈروں کے استعفیٰ سے ملک میں ہلچل سی مچ گئی اور مصالحت کی کوششیں ہونے لگیں۔ چنانچہ تری پوری میں مصالحت کی ایک ناکام کوشش بھی ہوئی۔

یہاں سلسلۂ بیان کو روک کر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس عرصہ میں مسلم لیگ نے ایک نئی زندگی حاصل کر لی تھی۔ پہلے تو چھوٹے چھوٹے مسئلوں پر الجھن ہوئی۔ مثلاً یو۔ پی میں مسلم وزیروں میں خلیق الزماں اور نواب اسمٰعیل کو لیا جائے یا نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگ ہو یا دوسری فرقہ وارانہ جماعتیں ان کے سامنے کوئی بڑے مسائل تھے ہی نہیں۔ وہ تو چھوٹے ہی چھوٹے مسائل پر فتنہ و فساد برپا کرتی رہتی تھیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب فرقہ دارانہ کشید گی نقطۂ عروج پر پہنچ گئی تھی اور نتیجے میں ایک آزاد مسلم مملکت کی حیثیت سے پاکستان کا مطالبہ کیا جانے لگا تھا۔"

اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے ماتم نشینِ ہندوستان کے جذبات، بالخصوص مسلمانانِ ہند کے جذبات کی کیا خوب ترجمانی کی ہے کہ:-

"ہم نے کیا کچھ اُن کا دل نہ دُکھایا لیکن اس وقار کے پتلے نے کبھی کسی کے خلاف ایک جملہ نہ کہا۔ سب گزر جاتا تھا اور وہ اسکی پروا کبھی نہ کرتے تھے۔ لیکن کلمۂ حق کہنے میں انھوں نے کبھی دریغ نہیں کیا۔ مولانا کم آمیز تھے لیکن کمرے میں بیٹھ کر سب کے ساتھی تھے۔ جو بات ہم کہنا چاہتے تھے اور نہ کہہ سکتے تھے اُسکے کہنے کی جرأت مولانا ہی میں تھی۔ صدر جمہوریہ ہند نے صحیح کہا کہ "وہ قلم جس سے موتی بکھرتے تھے، بجلیاں بھی چمکتی تھیں اور وہ ہونٹ جس سے پھول برستے تھے چنگاریاں بھی نکلتی تھیں۔ سچ کو روشن کرنے اور باطل کو دبانے کے لئے وہ آج ہمارے درمیان موجود نہیں لیکن مشعل باقی ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ اس سے روشنی لیں۔"

سابق صدر کانگریس، یو۔ این، ڈھیبر نے مختصر سے لفظوں میں سب کچھ کہہ دیا:-

"گاندھی جی نے ہندو فرقہ پرستی کے خلاف اور مولانا مرحوم نے مسلم فرقہ پرستی کے خلاف جس طرح محاذ آرائی کی وہ آئندہ نسلوں کے لئے ایک زندہ مثال ہے کہ جب انسان عزم اور تہیہ کے ساتھ کسی مقصد کی طرف چل پڑتا ہے تو اُس راہ میں کیسی کیسی کٹھن منزلوں سے ہنستا کھیلتا گزر جاتا ہے۔"

یہ تو خیر ہندوستانِ عزیز کی عزیز ہستیاں تھیں انھیں ان الفاظ میں اعتراف کرنا ہی چاہیئے تھا لیکن یہ مولانا کی حق و صداقت پرستی کا کرشمہ ہے کہ پاکستان کے ممتاز عالم اور صحافی مولانا غلام رسول مہر نے بھی

کردیا تھا کہ وہ ایسے مسئلہ پر استعفیٰ تک دینے کے لئے تیار ہیں۔ اگر مسلم لیگ کی الزام تراشی میں ذرا بھی اصلیت کو دخل ہوتا تو وہ ضرور ثبوت مہیا کرتی اور کم از کم مولانا کو مستعفی ہی کرادیتی۔ لیکن وہاں تو مقصد ہی ہنگامہ آفرینی تھا اور برطانوی حکومت کی ہاں میں ہاں ملا کر یہ ثابت کرنا تھا کہ کانگریس پر مسلمانوں کو اعتماد نہیں ہے۔ اسلئے مسلم لیگی عناصر اس آگ کو بھڑکاتے اور ملک کی فضا کو بد سے بدتر بناتے رہے۔ خود مولانا کی ذات کے خلاف ایک مہم شروع کردی۔ مولانا کلکتہ میں نماز عید کی امامت کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ مسلم لیگیوں نے امامت کے خلاف مہم شروع کردی۔ مسئلہ عید کمیٹی کے سامنے پیش ہوا اور اس نے فیصلہ کیا کہ مولانا ہی نماز پڑھائیں گے۔ لیکن مولانا اپنی ذات کی بنا پر مسلمانوں میں اختلاف پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ انکی جنگ اُصولی تھی اور اس میں ذاتیات کو دخل نہیں تھا۔ اس لئے عید کمیٹی کے فیصلے کے باوجود آپ نے امامت سے علیحدگی اختیار کی۔ اس سے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی اکثریت کو سخت رنج پہنچا۔ لیکن آپ اپنے فیصلے پر قائم رہے۔ مسٹر جناح نے مولانا کو کانگریس کا "شو بوائے" کہا۔ مسلم لیگی پلیٹ فارم اور پریس میں مولانا کے خلاف ایک طوفان بدتمیزی برپا کیا گیا، علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبا نے اسٹیشن پر آپ کے سامنے اخلاق سوز مظاہرے کئے لیکن یہ کوہِ سکون و متانت اپنی جگہ غیر متزلزل رہا اور اس نے اپنے لئے جو راہ متعین کرلی تھی اُس سے سرمو تجاوز نہیں کیا۔ صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجیندر پرشاد نے بالکل برحق فرمایا کہ

> "وہ (مولانا) ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے۔ اپنے ہم مذہبوں کی تلخ و ترش تنقیدوں کے درمیان بھی وہ ایک غیر متزلزل چٹان کی طرح جمے رہے۔ ذرا بھی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اس کا فطری نتیجہ یہ تھا کہ ملک کے ہر طبقے میں اُن کو یکساں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ تمام پیچیدہ اور اُلجھے ہوئے مسائل کو حل کرنے کے لئے اُن سے مشورہ کیا جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ بے خوف، بلا جھجک، غیر جانبدارانہ اور ٹھوس مشورہ دیتے تھے۔ ۱۹۴۰ء میں دوبارہ کانگریس کے صدر منتخب ہونے پر انھوں نے ہماری توقع کے عین مطابق غیر معمولی سوجھ بوجھ، فہم و فراست اور حب الوطنی کا ثبوت دیا۔

فسخ باب مقاصد کا ذریعہ سمجھ لیا ہو۔ لیکن انھیں پیش نظر مقاصد کیلئے استقامت وعزیمت کی راہ میں ہر دلعزیزی کی متاع عظیم بھی قربان کرنی پڑی اور وہ جس شے کو حق نہ سمجھتے تھے اس سے بال برابر بھی ادھر اُدھر نہ ہوئے۔ یہ قربانیاں ذکر و بیان میں بہت دل پسند معلوم ہوں لیکن اس پر عمل سہل نہیں۔ نظیری کیا خوب کہہ گیا ہے ؎

نیست آساں بر صفت آتش زدن

می نماید گر چہ از پروانہ خوش"

ایسا نہیں ہے کہ مولانا نے ہمعصروں کی دست درازیوں اور چیرہ دستیوں پر خاموشی کسی خوف سے اختیار کی ہو۔ خوف کو تو وہ کبھی اپنے قریب نہیں آنے دیتے تھے بلکہ اس عظیم الشان صبر و سکوت میں اُن کے سوچے سمجھے ہوئے اصول کو دخل تھا۔ چنانچہ انھوں نے ایک مشہور عالم دین کو جنھوں نے مولانا کی تفسیر سورۂ فاتحہ پر مناظرانہ رنگ میں ایرادات کئے تھے، لکھ بھیجا تھا کہ :-

"سنہ ۱۹۱۰ء سے میں نے جن باتوں کا عہد کیا ہے اُن میں سے ایک یہ ہی کہ ہر اُس شخص کو جو مناظرانہ طرق پر میرے خلاف کچھ لکھے گا نہ تو جواب دوں گا، نہ اُسکی شکایت سے اپنے نفس کو آلودہ کروں گا"

اسی طرح پنجاب کے ایک سیاست داں نے ایک بیان میں کچھ ایسی باتیں کہیں جو مولانا کے نزدیک بالکل بے اصل تھیں، اس سلسلے میں مولانا نے مولانا غلام رسول مہر کو ایک خط میں لکھا کہ :-

"اگر میری طبیعت کا وہ انداز ہوتا جو اُس وقت تھا جب الہلال نکالتا تھا تو یہ ایسا صریح کذب ہے کہ نہیں معلوم کسی عام بیان میں میرے قلم سے کیسے الفاظ اُس شخص کی نسبت نکل جاتے۔ لیکن اب میرا حال دوسرا ہے۔ کوئی شخص کتنے ہی قبیح فعل کا مرتکب ہو۔ یقین کے ساتھ اُسے پبلک میں بُرا کہنا پسند نہیں کرتا ہمیشہ ایسے موقعوں پر اپنا نفس سامنے آجاتا ہے۔

کھلے دل سے اعتراف کیا کہ :-

"اُن کی زندگی میں استقامت کی ایک اور نادر مثال ملتی ہے، جب ہم قوموں کی اکثریت نے ان کے سیاسی مسلک سے اختلاف کیا، میرے علم کے مطابق وہ اپنے لئے ۱۹۱۲ء میں جو راہ عمل طے کر چکے تھے اس پر مدت العمر بے خوف لومۃ لائم قائم رہے، بیچ میں اکثر ایسے مرحلے آئے کہ بڑے بڑے دعویداران عزم و ہمت کے قدم بھی لڑکھڑا گئے، انھوں نے اپنا مسلک بدلنے کے لئے معقول دلائل بھی فراہم کر لئے، لیکن مولانا کے نزدیک صحیح، مفید اور بہترین راستہ وہی تھا جو انھوں نے ۱۹۱۲ء میں اختیار کیا تھا۔ اس سلسلے میں انھیں بیشمار قربانیاں کرنی پڑیں، کم و بیش سولہ ۱۶ سال قید و بند میں گزارے، اُن کے نہایت اہم دینی و علمی مشاغل کو سخت نقصان پہنچا۔ وہ مسائل معاش بھی بالکل تباہ ہو گئے جو انھوں نے اپنی طبیعت کے ذوق کے مطابق اختیار کر لئے تھے اور جن میں وہ سب سے زیادہ کامیاب تھے۔ لیکن ان تمام قربانیوں سے گراں بہا قربانی یہ تھی کہ اُن کی ہر دلعزیزی کی متاع عظیم جل کر راکھ کا ڈھیر بن گئی۔ وہ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بدولت شباب ہی میں ہمہ گیر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ وہ جس طرف نکلتے تھے لوگ اپنی آنکھیں اُن کے لئے بچھانے پر آمادہ رہتے تھے اور یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہ ہوگا کہ اُن کے لئے مسلسل و متواتر عقیدت کی گرم جوشیوں کا اظہار ہوتا رہا وہ کسی مسلمان رہنما کو نصیب نہ ہوئیں اور یہ غیر معمولی ہر دلعزیزی انھیں اُس وقت حاصل تھی جب اُن کی عمر بارہ ۱۲ اور تیس ۳۰ کے درمیان تھی۔ خاص طور پر قابل ذکر امر یہ ہے کہ اُن سے محبت و عقیدت کا ملاّ بے غرضانہ تھی یعنی وہ اُن رہنماؤں میں نہ تھے جنھیں مختلف گروہوں نے صاحب اختیار و اقتدار

باہر نکلے تاکہ مندر میں جا کر اُن کے آگے سر بسجود ہوں۔ بیشک شملہ ڈیپوٹیشن کے تماشے کے بعد اس کا آخری پارٹ کھیلا گیا اور اس کا نام "لیگ" رکھا گیا لیکن اگر تم ایک برف خانہ بنا کر اس کا نام آتشکدہ رکھ دوگے تو کیا برف کی سِل آگ کا انگارہ ہو جائے گی؟ اگر تم ایک کھلونے کا پتلا لے کر اُس کے سینے کے پاس کی کل کو انگوٹھے سے دباؤ گے تاکہ اپنے دونوں ہاتھ ہلا کر تالی بجائے تو کیا اس تماشے سے وہ انسان کا بچّہ سمجھ لیا جائیگا؟ نادانو! چُپ کیوں ہو؟ مجھ کو جواب دو! شاید آج تک کسی قوم نے پالیٹکس کی ایسی صریح تذلیل و توہین نہ کی ہوگی جیسی کہ چھ سال تک تم نے کی۔ تم نے، اے چاندی اور سونے کے پوجنے والو، تم نے کی۔ تمہارا وجود یکسر سیاست کی تحقیر اور تمہارے اعمال اُس کی معزز پیشانی پر ایک کلنگ کا ٹیکہ ہیں۔ تم نے غلامی کا ایک بُتکدہ بنایا اور اُس کا نام سیاست کی مسجد رکھا۔ تم نے سجدہ کا سر جُھکایا اور قوم کو دھوکا دیا کہ ہم عزت کا سر بلند کر رہے ہیں، تم دلدل میں اپنے پاؤں ڈال کر کود رہے تھے تاکہ اور خسف و غرق ہو لیکن قوم کو کہتے تھے کہ ہم میدانوں میں دوڑ رہے ہیں۔ تم خود گمراہ تھے۔ پر اس پر بس نہ کی اور پوری قوم کو گمراہ کرنا چاہا۔

"سوال چھت کا نہیں بلکہ ان اینٹوں کا ہے جو بنیاد میں رکھی گئی ہیں۔ یہ بحث فضول ہے کہ دیوار کا کیا حال ہے۔ دیکھنا یہ ہو کہ بنیاد تو ٹیڑھی نہیں ہے۔ پالیٹکس ایک آگ ہے جو خود بھڑکتی ہے اور پھر بھڑکائی جاتی ہے۔ وہ برف کا گلاس نہیں ہے جو کسی سرد مہر ساقی کی بخشش پر موقوف ہو۔ اولین گمراہی یہ تھی کہ برسوں کی موت کے بعد زندگی کی کروٹ لی بھی تو اپنی اُمنگ، اپنے جوش اور اپنی کسی قوت کے اعتماد پر نہیں بلکہ محض کسی کے اشارۂ چشم

میں چونکہ ٹھتا ہوں کہ اگر بُرا ہی کہنا ہے تو اپنے نفس کو کیوں بُرا نہ کہوں"۔

اس سے مولانا کے بلند مرتبہ، اُن کی نفس کشی، ان کی ذاتی رزم آرائی سے نفرت، اُن کی اصول دوستی، اُن کی دروغ دشمنی اور ان کی حق آگاہی پر کتنی روشنی بیک وقت پڑ جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ مسٹر جناح اور ان کے ساتھی کھلم کھلا مولانا پر مطاعن کی بارش کرتے رہے اور چھوٹی طبیعتوں والے تو گالی گلوج سے بھی باز نہیں آئے لیکن تقریباً چالیس برس کی قوم پروری کی طویل تاریخ میں مولانا کے زبان یا قلم سے ایسا کوئی جملہ، کوئی لفظ نہیں نکلا جو تہذیب و متانت کے خلاف ہو۔ ہاں جب اصول کی جنگ چھڑی تو مولانا نے دلائل و براہین کے دریا بہا دیے اور واقعہ یہ ہے کہ ایسے لمحوں میں اندازِ گل افشانیِ گفتار دیکھنے اور سننے ہی سے تعلق رکھتا تھا۔

چنانچہ اسی زمانے میں یہ اصولی بحث چھڑ بھی گئی۔ یہ دو قومی نظریے اور اقلیت و اکثریت کی بحث تھی۔ یہ سوال پہلے سے چل رہا تھا اور مولانا نے صاف لفظوں میں مسلم لیگ کے بارے میں بیسوں برس پہلے ہی علی الاعلان کہہ دیا تھا کہ:۔

"مسلمانوں نے اس (پالٹیکس کو) معصیت سمجھ کر کنارہ کشی کی اور جب شروع بھی کی تو شیطان نے سمجھایا کہ گورنمنٹ کے آگے سجدہ کریں یا اُس کے آگے بھیک مانگنے کے لئے روئیں اور مانگیں بھی تو اشرفی نہیں، چاندی سونا نہیں، لعل و جواہر نہیں، بلکہ تانبے کا ایک زنگ آلود ٹکڑا یا سوکھی روٹی کے چند ریزے۔

بیشک مدتوں کے بعد بند ٹوٹے، جس کو کفر کہا تھا اُس کے ثواب و طاعت ہونے کا فتوے دینا پڑا۔ لیکن کیونکر؟ اپنی قوت سے، اپنے دماغ سے، اپنی ہستی اور اپنی روح سے نہیں بلکہ ع

ان ہم بسعی غمزۂ کردم شکارِ دوست

پہلے جن کے حکم سے گمنامی کے غاروں میں چھپے تھے، اب انھیں کے حکم سے

میں خشیتہ الٰہی اور اعمال حسنہ سے پیدا ہوتی ہے ......

"بہت سے لوگ ہیں جو یہاں تک ہمارے ساتھ آگئے ہیں کہ مسلمانوں کو بھی یہی نصب العین (آزادی) اپنے لئے تجویز کرنا چاہیئے مگر مشکلات راہ سے گھبراتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شراب کڑوی ہے، نشہ و سرور کے انتظار میں حلق و دہان کون دبرباد کرے؟ لیکن اب ہم اُن سے کیا کہیں کہ کوئی گھونٹ حلق سے نیچے اُترا ہی نہیں۔ کسی طرح منھ بنا کر ایک جرعہ اتار لیجئے پھر پوچھیں گے کہ کڑوی ہے یا میٹھی؟

"اے اخوان غفلت شعار، نہیں معلوم اب تک آپ کس وہم میں پڑے ہیں؟ یہ شغل سیاست ہے، مشہد آزادی و حریت ہے۔ اگر آپ مشکلوں سے گھبراتے ہیں تو آپ کے لئے بہت جگہ پھولوں کی سیج ہے۔ یہ آپ سے کس کمبخت نے کہا ہے کہ اس خارزار میں قدم رکھئے؟ یہاں آیئے گا تو قدم قدم پر کانٹے ملیں گے، ہر لمحے مصائب کا نزول ہوگا۔ آپ مشکلات سے گھبرا رہے ہیں حالانکہ یہاں تو جانوں اور زندگیوں کی قربانی کا سوال درپیش ہے۔ یہاں ہوس پرستوں کا گزر نہیں۔ اس میدان کے مرد وہ سرفروشان الٰہی اور مجاہدین حق پرست ہیں جن کے سر گردنوں پر نہیں ہتھیلیوں پر رہتے ہیں ......"

"یاد رکھئے کہ ہندوؤں کے لئے ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنا داخل حب الوطنی ہے مگر آپ کے لئے ایک فرض دینی اور داخل جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ آپ کو اللہ نے اپنی راہ میں مجاہد بنایا ہے اور جہاد کے معنی میں ہر وہ کوشش داخل ہے جو حق اور صداقت اور انسانی بند غلامی و استبداد کے توڑنے کے لئے کی جائے۔ آج جو لوگ ملک کی فلاح اور آزادی کے لئے اپنی قوتوں کو صرف کر رہے ہیں یقین کیجئے کہ وہ بھی مجاہد ہیں اور ایک ایسے

اور جنبشِ دستِ دعوت پر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پالٹیکس غلامی کی ایک دوسری شکل بن گیا اور راہِ مقصود سے باز رہنے کے لئے ایک کھلونے کا کام دینے لگا۔ پھر اس کے بعد ساری قوت اس پر صرف کی جانے لگی کہ گورنمنٹ سے مراعات طلب کی جائیں اور جس طاقت کو گورنمنٹ کے مقابلے میں خرچ ہونا تھا اُسکو ہندؤوں کے مقابلے میں صرف کیا جائے۔ یہ اُس خمار کے لئے ترشی کا ایک پورا جرعہ ثابت ہوا۔ اصل شے قوم کا یہ محسوس کرنا ہے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہے نہ کہ کسی لکڑی کے سہارے، لیکن مراعات کی طلب جب پیدا ہو گی خواہ اُس کا کچھ ہی نام رکھا جائے، یقیناً اپنی قوت کی جگہ محض معطی کے احسان و کرم پر اعتماد ہو گا۔ بیشک مسلمانوں کو اپنے حقوق قومی کے تحفظ سے غافل نہیں ہونا چاہیئے، لیکن ساتھ ہی اصلی سعی اسکی ہونی چاہیئے کہ درخت اپنی جگہ پر مضبوط ہو تم درختوں کے سائے میں آرام و راحت لیتے ہو، لیکن کبھی اس پر غور کیا ہے کہ تمھارے باورچی خانے میں کون سی شے جلتی ہے؟ وہ بھی درخت ہے لیکن جو درخت اپنی قوتِ نشوونما سے محروم ہو جاتا ہے اُس کو کاٹ کر چولھے ہی کے حوالے کیا جاتا ہے۔ پس زندگی صرف قوت میں ہے اور اعتماد کی جگہ دل ہی نہ کسی کی چوکھٹ۔

"ہندو مسلمانوں کا سوال بھی ایک بازیگر کا کھیل ہے اور بدبختی سے ناچنے والے ناچ رہے ہیں۔ فوج میں پھوٹ پڑ گئی ہے اور غنیم مطمئن ہے ....

"ہندو مجارٹی کے عفریت کا خوف بھی اب خدا کے لئے دل سے نکال دیجئے۔ یہ سب سے بڑا شیطانی وسوسہ تھا جو مسلمانوں کے قلوب میں القا کیا گیا۔ طاقت محض تعداد پر نہیں بلکہ اور باتوں پر موقوف ہے۔ اصل شے قوموں کی معنوی قوت ہے جو اُس کے اخلاق، اُسکے کیریکٹر، اُس کے اتحاد اور در اصل ہماری اصطلاح

بیج بو گئے ہیں۔ یہاں مجھے ایک ضمنی سی بحث یاد آ رہی ہے جو مولانا حسین احمد مدنیؒ اور ڈاکٹر اقبالؒ میں چل پڑی تھی۔ اس میں بعد کو علامہ اقبال سہیلؒ بھی شریک ہو گئے تھے۔ سوال یہ تھا کہ "قوم" کا مفہوم کیا ہے۔ کیا "قوم" کی بنیاد مذہب ہے؟ چونکہ یہ لفظ قرآن مجید میں بھی بار بار مذکور ہوا ہے، اس لئے مسلم حلقوں میں اس بحث سے خاصی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ جن لوگوں نے قرآن مجید کا مطالعہ کیا ہے وہ واقف ہیں کہ اس سے ہمیشہ ایک خاص علاقہ یا ملک میں بسنے والے ہی مراد لئے گئے ہیں مثلاً یہ ارشاد کہ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ (یعنی ہم نے ہر قوم میں رسول اُسی کی زبان میں بھیجے) یا وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (یعنی ہم نے ہر قوم میں ہدایت کرنے والے بھیجے) اگر یہاں قوم سے مذہب مراد لیا جائے تو اس کا مفہوم یہ ہو جائے گا کہ ہر مذہب میں رسول اور ہادی آئے جب کہ منشاء قرآن یہ ہے کہ ہر خطے اور قوم میں رسول اور ہادی آئے۔ لیکن مسلم لیگ کا دو قومی نعرہ تعلیم اسلام پر تو مبنی نہیں تھا۔ مذہب کو کبھی بھی اور کہیں بھی بنائے قومیت نہیں مانا گیا۔ پھر ہندوستان ہی میں یہ نعرہ کیوں اُٹھا؟ یقیناً ہمیں مولانا کی اس تاریخی تنقیح سے متفق ہونا پڑے گا کہ اس کی وجہ صرف یہ تھی انگریزی حکومت کے بوئے ہوئے تخم تخریب کی آبیاری یہاں کے مفاد پرست لیڈر کر رہے تھے۔ یہ نئی قوم جو بنائی جا رہی تھی اس کا ایک سرا مغرب میں اور ایک سرا مشرق میں تھا، پھر بھی صرف اتحاد مذہب کی بنا پر اُس کو کھینچ تان کے ایک کیا جا رہا تھا۔ آج مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان ایک دوسرے سے الگ اور ایک غیر فطری اتحاد کی تصویر ہیں، نئے نئے مسائل سے دو چار ہیں اور پنجاب اور بنگال بٹ چکے ہیں۔ یہ برطانوی ساحر کی چالبازیاں ہیں، لیکن اصلی قصوروار برطانوی سیاست داں نہیں بلکہ وہ قائدین ہیں جنھوں نے قصداً یا سہواً اس جال میں پھنسنا گوارا کیا۔ اور وہ یہاں تک کیسے پہنچے؟ وہی خوف اور شبہات کا جال بچھا دیا گیا۔ اقلیت اور اکثریت کا بھوت کھڑا کر دیا گیا۔ جو نقطہ ہائے اتحاد تھے وہ ایک ایک کر کے محو کئے گئے اور معمولی معمولی اختلافات کو ہوّا بنا کے پیش کیا گیا۔ مولانا کا یہ کہنا بالکل درست تھا کہ اگر یہ تیسری طاقت درمیان میں نہ ہوتی تو یہ مسئلہ چشم زدن میں طے ہو جاتا۔ مگر یہ طاقت تو ہر وقت، ہر جگہ موجود تھی، جب ذرا

جہاد میں مصروف ہیں جس کے لئے دراصل سب سے پہلے آپ کو اُٹھنا تھا۔"

مدتوں کے بعد رام گڑھ کانگریس کے صدر کی حیثیت سے جب کہ گنگا وجمنا کا کتنا پانی بہہ چکا تھا اور دُنیا کہاں سے کہاں پہنچ چکی تھی، مولانا مرحوم اُسی طرح اپنی جگہ پر اٹل رہے۔ کانگریس اجلاس رام گڑھ کی صدارت کرتے ہوئے ابوالکلام آزاد نے کہا تھا کہ:۔

(پھوٹ ڈالنے والی پالیسی کے) اس نقشہ میں دو باتیں خاص طور سے اُبھاری گئی ہیں۔ ایک یہ کہ ہندستان میں دو مختلف قومیں آباد ہیں۔ ایک ہندو قوم ہے اور ایک مسلمان قوم ہے۔ اس لئے متحدہ قومیت کے نام پر یہاں کوئی مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کی تعداد ہندؤں کے مقابلے میں بہت کم ہے اس لئے یہاں جمہوری اداروں کے قیام کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے گی اور مسلمانوں کی ہستی خطرے میں پڑ جائے گی۔ میں اس وقت اور زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ میں صرف اتنی بات آپ کو یاد دلاؤں گا کہ اگر اس معاملے کی ابتدائی تاریخ آپ معلوم کرنی چاہتے ہیں تو آپ کو ایک سابق وائسرائے ہند، لارڈ ڈفرن، اور سابق لفٹننٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی (اب یونائیٹڈ پراونسز) سر آکلینڈ کالون، کے زمانے کی طرف لوٹنا چاہیئے۔ برطانوی سامراج نے ہندوستان کی سرزمین میں وقتاً فوقتاً جو بیج ڈالے اُن میں سے ایک بیج یہ تھا۔ اس نے فوراً پھول پتے پیدا کئے اور گو پچاس برس گزر چکے ہیں مگر ابھی تک اُسکی جڑوں میں نمی خشک نہیں ہوئی۔"

یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ بات مولانا نے اُس وقت کہی تھی جب مسلم لیگ "دو قومی نظریے" کا زور و شور سے پرچار کرنے لگی تھی۔ مولانا نے اپنے ہموطنوں اور ہم مذہبوں کو یاد دلایا کہ یہ مسٹر جناح اور اُن کے ساتھیوں کے دماغ کی اُپج نہیں ہے بلکہ لارڈ ڈفرن اور سر کالون نصف صدی پہلے ہی اس کا

مسلم اور ہندو دو قومیں ہیں۔ اور ڈاکٹر مونجے کی طرح کے ہندو کبھی ہاں میں ہاں اس طرح ملاتے تھے کہ مسلمان تو ہندوستان میں صرف مہمان ہیں اور مہمان ہی کی طرح رہ سکتے ہیں۔ یہ وہ ہندو مہاسبھا ہے جو اپنی نیشنلزم کو کانگریس کی نیشنلزم سے بھی افضل گردانتی تھی۔ دونوں ایک ہی تھیلے کے چٹے بٹے تھے اور ایک دوسرے کے شریک کار۔ لیکن ایک واضح فرق تھا۔ تاریخی اعتبار سے مسلم لیگ کا نعرہ زیادہ رجعت پسندانہ اس لئے تھا کہ اُس سے برطانوی سامراج کو شہ مل رہی تھی۔ مولانا آزاد نے رام گڑھ کے خطبۂ صدارت میں اس امر کو واضح کیا کہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی ہم ہندوستانی قومیت کا جزو لاینفک ہیں اور ہمارے اسلامی شعار میں اور متحدہ قومیت میں کوئی خدا واسطے کا بیر نہیں ہے۔ اُن کا یہ اقتباس تاریخی اہمیت اختیار کر گیا ہے، اس لئے اُس کا اعادہ ضروری معلوم ہوتا ہے :۔

"میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثہ میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصّہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اسکی حفاظت کروں۔ بہ حیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی، وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں، میں ہندوستانی کی ایک ناقابل تقسیم، متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اسکی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اسکی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (FACTOR) ہوں۔ میں اپنے اس دعوی سے

آگ بجھنے لگتی تو یہ ہوا دینے کو آگے بڑھتی۔ افسوس یہ ہے کہ نہ صرف مسلمان جو اقلیت میں تھے بلکہ اکثریت والے ہندو بھی اس جال میں گرفتار تھے۔ چنانچہ ہندو فرقہ پرستوں میں مہا سبھا وغیرہ بالکل مسلم لیگ کا کھیل کھیل رہی تھیں۔ اگر مسلمان ذرا متزلزل ہوتے تو یہ ہندو فرقہ پرست آگ بھڑکاتے یا پھر سکھ اور عیسائی فرقہ پرست آگے بڑھتے۔ قوم پروروں کی طرح، فرقہ پروروں کی بھی اپنی برادری الگ تھی۔ ہندو فرقہ پرست، مسلم فرقہ پرست، سکھ فرقہ پرست بظاہر ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے لیکن ایک دوسرے کے مفاد کو اور بالخصوص اپنے مشترک آقا برطانوی سامراج کے مفاد کو تقویت پہنچا رہے تھے۔ جواہر لال نہرو نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں صاف صاف لکھا ہے کہ :-

"برسر عام ہندو اور مسلم فرقہ پرست ایک دوسرے کو کتنا ہی برا بھلا کیوں نہ کہیں، وہ اسمبلی میں اور اسمبلی کے باہر بھی ہر جگہ رجعت پسند قوانین کے پاس کرانے میں حکومت کی مدد کرتے ہیں"۔

آگے چل کر جواہر لال نہرو نے مسلم قوم، یا مسلم نیشن کے بارے میں دو ٹوک بات کہی ہے۔

"پس مسلم نیشن کی بات کرنا ایسا ہے گویا نیشن، یا قوم کی سی کسی شے کا وجود ہی نہیں ہے، صرف ایک مذہبی رشتہ کا وجود ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آج کل کے مفہوم کی قوم کو بڑھنے ہی نہ دینا چاہیئے۔ اس کا مطلب ہے کہ موجودہ تہذیب کو ترک کر دینا چاہیئے اور ہمیں ازمنہ وسطی کے طریقوں کی طرف لوٹ جانا چاہیئے۔ اس کا مطلب ہے یا تو مطلق العنان حکومت یا بیرونی حکومت اور سب سے بڑھ کر اس کا مفہوم ایک ذہن کی جذباتی کیفیت کے سوا اور کچھ بھی نہیں یا پھر ایک ایسی شعوری یا غیر شعوری خواہش ہو جو حقائق اور بالخصوص اقتصادی حقائق کا سامنا ہی نہیں کرنا چاہتی"۔

بہرحال، برطانوی سامراج چاہتا تھا کہ اس قسم کا ایک نیشن وجود میں آئے اور مسلم لیگ ٹھہراتی تھی کہ ہندوستان میں

الگ الگ تھیں، مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے، ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے، مگر انھوں نے مل جل کر ایک نیا سانچہ پیدا کر لیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے، مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں چل سکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔۔ . . . . .

"ہماری اس ہزار برس کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے، وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچہ ڈھل چکا اور قدرت کی مُہر اس پر لگ چکی۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں، مگر اب ہم ایک ہندستانی قوم اور ناقابل تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں۔ علیحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہیئے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیئے۔"

آج یہ سوچنا بے سود سا ہے کہ اگر مولانا کی رائے مسلم لیگ نے مان لی ہوتی تو ہم آج کہاں ہوتے اور تاریخ ہمارے لئے کیا کچھ لکھ چکی ہوتی لیکن مولانا نے شرط بلاغ پوری کر دی۔ انھوں نے مسلم لیگ کو اسکی راہ سے باز رکھنا چاہا۔ جنوری ۱۹۳۸ء میں وہ مسٹر جناح سے بمبئی میں ملاقی ہوئے اور کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین سمجھوتا کرانے کی کوشش کی۔ ۲۸ جنوری کو بمبئی میں گاندھی جی اور مسٹر جناح میں ملاقات ہو بھی گئی اور گفتگوئے مصالحت کا آغاز ہوا لیکن بے نتیجہ رہا۔ مئی میں سبھاش چندر بوس نے، جو اُس وقت صدر کانگریس تھے، پھر مصالحت کی گفتگو کی لیکن مسٹر جناح نے نہایت ہی بے لچک رویہ اختیار کیا بلکہ کانگریسی زعما پر ناروا حملے کرنا شروع کئے۔ اس سے مولانا کو سخت رنج پہنچا اور انھوں نے ۹ جون ۱۹۳۸ء کو ایک بیان شائع کیا کہ "ایسے وقت میں جب کہ لیگ اور کانگریس کے مابین مصالحت کی گفتگو

کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔

"ہندوستان کے لئے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اسکی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے۔ ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہو گئی اور پھر ایک کے بعد ایک کا سلسلہ جاری رہا اور اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی اور اسکی فیاض گود نے سب کے لئے جگہ نکالی۔ انھیں قافلوں میں آخری قافلہ ہم پیروان اسلام کا بھی تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشان راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا اور ہمیشہ کے لئے بس گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملان تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ بہتے رہے لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔ جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا اُسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پُرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا......

"تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعہ پر گزر چکی ہیں۔ اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعویٰ رکھتا ہے جیسا دعویٰ ہندو مذہب کا ہے...

"ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک ملی جلی تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامان سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ چکی ہو۔ ہماری بولیاں

معتدلین کو بھی باغی اور غیر وفادار کہتے تھے۔ اس زمانے میں حکومت برطانیہ لیگ کو کانگریس کے مطالبات کے مقابلے میں جواباً پیش کرتی تھی (۲) دوسرا دور وہ تھا جب کانگریس کی سیاسی کوششوں اور جد و جہد کی بدولت حکومت برطانیہ نے باقاعدہ کچھ اصلاحیں نافذ کیں اور لیگ نے یہ محسوس کیا کہ دھیرے دھیرے کانگریس اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتی جارہی ہے تو اس نے بھی سیاسی چولا اوڑھا، لیکن سیاسی جد و جہد سے اب بھی الگ رہی۔ مارلے منٹو اصلاحات اور مانٹفورڈ اسکیم کے نفاذ کے دوران یہ بات ثابت ہوگئی کہ لیگ دراصل اس دور میں بھی برطانوی حکومت کے چشم و ابرو کے اشاروں پر چل رہی تھی (۳) تیسرا دور پہلی جنگ عظیم کے بعد شروع ہوتا ہے جبکہ مسٹر جناح نے کانگریس سے الگ ہو کر لیگ کی قیادت سنبھالی تھی۔ لیگ کا خمیر تو بدل نہیں سکتا تھا۔ ایسے ظاہری طور سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ یہ جماعت علی العموم بے حس و حرکت رہتی۔ ہاں جب یہ دیکھتی کہ کانگریس اور حکومت میں کوئی ٹکر ہو رہی ہے یا سمجھوتے کی فضا تیار ہو رہی ہے تو پہلے تو خاموش تماشائی بنی رہتی اور پھر اس سیاسی کشمکش سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتی۔ جب حکومت اور کانگریس کے مابین مذاکرات ناکام رہتے تو مسٹر جناح کوئی بیان دے دیتے کہ چونکہ حکومت اور کانگریس میں مصالحت نہیں ہو پائی اس لئے لیگ کو اظہار رائے کی ضرورت ہی نہیں۔ اسکی ضرورت تو اس وقت ہوتی جب صلح کے آثار صاف نظر آنے لگتے اور پھر فرقہ وارانہ آواز اٹھا کر روڑا اٹکانے کی کوشش کی جاتی۔ اگست ۱۹۴۰ء کی برطانوی پیشکش ہو یا ۱۹۴۲ء میں کرپس کی پیشکش یہی صورت حال پیدا ہوئی۔ گویا آزادی میں جتنی دیر ہوتی اور سیاسی معاملات جب تک الجھے رہتے، لیگ مطمئن رہتی لیکن مصالحت کی فضا تیار ہوتے ہی لیگ آگے بڑھتی اور فرقہ وار مطالبات پیش کرکے الجھنیں پیدا کرتی۔ ظاہر ہے کہ شروع سے آخر تک اس کی یہ حکمت عملی صرف برطانوی سیاست کو فائدہ پہنچا رہی تھی۔

دوسری جنگ عظیم میں صورت حال کچھ بدلی۔ چین اور امریکہ کی حکومتوں کی جانب سے دوران جنگ میں برطانوی سیاست دانوں پر زور ڈالا گیا کہ وہ ہندوستان کے مطالبۂ آزادی کو پورا کرنے کی طرف قدم بڑھائیں۔ دوسری طرف ہندوستان کی بڑی اور بحری فوجوں اور ملازمتوں میں بھی

ہو رہی ہے اور کانگریس اپنے عزیز مقصد ہندو مسلم اتحاد کے لیے اتنا آگے بڑھ چکی ہے، ایک دوسرے پر علانیہ الزام تراشی اور عام جلسوں میں بے کار کے مسائل چھیڑنا زیب نہیں دیتا۔ کم از کم ذمہ دار لیڈروں کو اپنی پوزیشن اور وقت کی نزاکت کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے خیالات ایسے پُرجوش اظہار سے باز رہنا چاہیئے۔ یہ رنج کی بات ہے کہ پچھلے دنوں میں مسٹر جناح کی تقریروں کے جو حصے اخباروں میں شائع ہوئے ہیں اُن میں خلاف توقع طور پر الزام تراشی سے کام لیا گیا ہے۔" مسلم لیگی نقار خانے میں اس شیریں نوا طوطی کی یہ آواز کون سُنتا۔ نومبر ۱۹۳۹ء میں گاندھی جی اور پنڈت نہرو پھر مسٹر جناح سے ملے لیکن ہندو مسلم مسئلہ کا حل نہ نکلا، کیونکہ مسٹر جناح کے خیالات میں اُسی طرح کوئی لچک نہیں تھی جس طرح برطانوی حکومت کے عزائم میں۔ بعد میں بھی گاندھی جی نے مسٹر جناح سے گفت و شنید کی اور حضرات نے بھی مصالحت کی کوشش کی لیکن اب جناح صاحب نے یہ رویہ اختیار کر لیا تھا کہ جب تک پاکستان کا نظریہ کانگریس تسلیم نہیں کر لیتی، اُس وقت تک گفتگو بے کار ہے۔ پاکستان کا تسلیم کر لینا، کانگریس کی طویل تاریخ کے منافی تھا، ہماری تحریک حریت کے عزائم کے خلاف تھا۔ یہ ایسی شرط تھی جس کا پورا کرنا ناممکن تھا۔ جو لوگ پاکستان کے مخالف تھے وہ ہندو ہی نہیں تھے بلکہ تمام قوم پرور مسلمان اور بالخصوص مولانا ابوالکلام آزاد اس کے شدید ترین مخالف تھے۔ وہ صاف دیکھ رہے تھے کہ یہ مسئلے کا حل نہیں ہے بلکہ مسئلے کو اور اُلجھا دے گا اور خلیج پاٹنے کے بجائے اور وسیع کر دے گا لیکن برطانوی نوکر شاہی مسلم لیگ کی شہ پر تھی۔

مولانا آزاد نے اپنی تحریروں اور مذاکرات میں لیگ کی رجعت پروری اور نقصان رساں پالیسیوں کا پردہ برابر فاش کیا۔ اُن کے نزدیک لیگ کی سیاست پر تین دور گزرے تھے (۱) پہلا دور تو وہ تھا جب ۱۹۰۶ء میں لیگ نواب مشتاق حسین کی کوششوں سے وجود میں آئی اور اُس نے برطانوی وفاداری کا بیڑا اُٹھایا اور ہندوؤں اور دوسری غیر مسلم جماعتوں کی اس بنا پر مخالفت کی کہ اُس کے خیال میں اسی طرح "مسلم حقوق" کا تحفظ ہو سکے گا اور ملازمتوں وغیرہ میں مناسب نمائندگی مل سکے گی۔ اسے ہم خالص وفاداری اور فرقہ واریت کا دور کہہ سکتے ہیں، یہ وہ دور تھا جب کہ لیگی سر فیروز شاہ مہتا جیسے

بھی یہ اثر پڑا کہ جناح صاحب میں ضرور غیر معمولی صلاحیتیں ہوں گی جبھی تو گاندھی جی کی سی عظیم الشان شخصیت بھی انھیں کی طرف ہندو مسلم مسئلہ کے حل کے لئے رجوع کرتی ہے۔ میرے خیال میں مولانا کا یہ تجزیہ سرسری سا ہے کیونکہ مسٹر جناح ایک طبقے کے نمائندہ تھے۔ یہ تھا مفاد پرستوں کا طبقہ۔ اس طبقہ کو حکومت کی حمایت حاصل تھی۔ اسی حمایت کی وجہ سے مسٹر جناح کو اہمیت حاصل ہوگئی تھی، کیونکہ وہ جب چاہتے حکومت اور مفاد پرستوں کے تعاون سے آزادی کے پہیے کے آگے رکاوٹ رکھ سکتے تھے اور اس روڑے اور رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے مسٹر جناح سے گفت وشنید ضروری ہو جاتی تھی۔ شخصیات کو سیاست میں دخل ضرور ہے لیکن اقتصادی اور سماجی عوامل ہمیشہ شخصیات سے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ اگر مہاتما گاندھی، مسٹر جناح سے بار بار نہ ملتے اور اُن کو قائد اعظم نہ لکھتے جب بھی مسٹر جناح برطانوی حکومت کے سہارے اہمیت حاصل کئے رہتے۔ بہر حال لاہور رزولیوشن نے جو بعد میں پاکستان رزولیوشن کہا جانے لگا ایک نئی صورت حال پیدا کر دی تھی اور جس وجہ سے بھی ہو مسٹر جناح نے ایک غیر معمولی اہمیت اختیار کر لی تھی۔ ایسا نہیں ہے کہ سب مسلمان لیگی ہو گئے تھے۔ الکشن نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ ملک میں قوم پرور مسلمانوں کی خاصی تعداد ہے۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اپنی کتاب INDIA DIVIDED میں صاف لکھا ہے کہ آزاد مسلمانوں نے لیگ کے مقابلے میں جو انتخابات لڑے اُن سے یہ بات بالکل ہی ظاہر ہو گئی کہ یہ جماعت اتنی ناقابلِ اعتنا نہیں تھی جتنی کہ ظاہر کی گئی تھی۔ جتنے مسلم ووٹ پڑے تھے اُن میں سے بعض صوبوں میں قوم پرور مسلمانوں نے چوتھائی اور بعض صوبوں میں ایک تہائی ووٹ پائے تھے۔ مسلمانوں کی اکثریت والے صوبوں میں تو تیس فیصدی کے قریب ووٹ قوم پروروں نے حاصل کئے تھے۔ یہ ووٹ خالصۃً لوجہ اللہ تھے۔ یہ سوچے سمجھے ووٹ تھے یہ ہندوستان کی آزادی کے حق میں ڈالے گئے ووٹ تھے، جنھیں تہدید، حکومت کی حمایت، مذہبی جنون، زر و گوہر کی بارش اور مفاد پرستوں کی سازش کوئی بھی متزلزل نہ کر سکا تھا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد ایک مذہبی جنون میں بہہ گئی تھی اور دو قومی نظریے کے دلدل میں پھنس گئی تھی۔ مولانا اس کے شدید ترین مخالف تھے، جس کے مزید ثبوت کے لئے صرف اُن کا ایک بیان اور

سیاسی ہمدردیاں رکھنے والے بڑھ رہے تھے اور ایک عام بےچینی نے سارے ماحول کو گھیر لیا تھا۔ اس طرح بین الاقوامی دباؤ اور اندرونی حالات کے تقاضوں نے برطانیہ پر یہ بات پوری طرح واضح کر دی تھی کہ اب کچھ نہ کچھ کرنا ہی چاہیئے اور اُسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ لیگ یا دوسری رجعت پسند جماعتوں کا سہارا لے کر اب زیادہ دنوں تک یہ گاڑی گھسیٹی نہیں جا سکتی تھی، اس لئے اب ایک نئی صورت حال پیدا ہو گئی تھی ۔ اس نئی صورت حال کا مظاہرہ شملہ کانفرنس میں ہو گیا، جب کہ سیاسی سطح پر کانگریس اور حکومت کے مابین مفاہمت کی شکل نکل آئی اور سوال یہ پیدا ہوا کہ "وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل" میں کون کون لوگ لئے جائیں ۔ ظاہر ہے کہ اس میں کانگریس اور لیگ سیاسی جماعتوں کی حیثیت سے اپنے اپنے نمائندے بھیجتی اور کوئی رکاوٹ نہ رہ جاتی ۔ ٹھیک اُس وقت مسٹر جناح نے ایک نہایت ہی ناقابل قبول سوال اُٹھایا کہ لیگ کے سوا اور کوئی جماعت مسلم نمائندہ نہیں بھیج سکتی ۔ گویا جناح صاحب اپنی ہی جماعت کے لئے نہیں بلکہ کانگریس کے لئے بھی یہ فیصلہ کرنا چاہتے تھے کہ کون جائے اور کون نہ جائے ۔ یہ سوال مسٹر جناح نے اُس وقت اُٹھایا جب کہ مولانا آزاد کانگریس کے صدر تھے اور ظاہر ہے کہ کانگریس کی فہرست میں صدر کی موجودگی ضروری تھی ۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ابتدائے وجود سے لے کر انتہا تک لیگ کی ایک منفیانہ پالیسی رہی اور وہی اس کے بقا کی ضامن تھی ۔ بس ایک ہی کام تھا اس کے سامنے اور وہ یہ کہ آزادی کی منزل قریب نہ آنے پائے ۔ جب اُسے بالکل ہی قریب آتے دیکھا تو لیگ والوں نے نئے نئے نعرے ایجاد کرنا شروع کئے ۔ جن میں ایک تو وہی تھا جس کا ابھی شملہ کانفرنس کے سلسلہ میں بیان ہوا ۔ دوسرا اس سے بھی زیادہ نقصان رساں اور دیرپا ثابت ہوا ۔ وہ تھا پاکستان کا نعرہ ۔ اس منزل پر پہنچنے میں کن عناصر کو دخل تھا، اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے لیکن مولانا کا ایک خیال یہ بھی تھا کہ گاندھی جی نے مسٹر جناح کو غیر معمولی اہمیت دے رکھی تھی ۔ وہ بار بار اُن سے مصالحت کی کوشش کرتے تھے اور اگرچہ ان کو مسلم عوام کی اکثریت کی حمایت حاصل نہیں تھی لیکن گاندھی جی کے بار بار مسٹر جناح سے ملنے اور مصالحت کی کوشش کرنے سے مسلم عوام کے دلوں پر

اقتصادی زندگی کی تشکیل میں حصّہ لینے کے حق سے دست بردار ہوجاؤں۔ مجھے تو یہ بزدلی کی صریح نشانی نظر آتی ہے کہ میں اپنی وراثت کو ترک کردوں اور اُس کے ایک ادنیٰ سے جزو پر ہی اکتفا کروں۔

"جیسا کہ بخوبی معلوم ہے مسٹر جناح کی پاکستان اسکیم اُن کے دو قومی نظریہ پر مبنی ہے۔ اُن کا قول یہ ہے کہ ہندوستان میں مذہبی اختلافات کے اعتبار سے کئی قومیں ہیں۔ ان میں سے دو بڑی قومیں، ہندو اور مسلم دونوں کے لئے علٰحدہ قوموں کی حیثیت سے علٰحدہ علٰحدہ ریاستیں بھی ہونا چاہئیں۔ جب ڈاکٹر ایڈورڈ ٹامسن نے مسٹر جناح کی توجہ اس امر کی جانب دلائی کہ ہندوستان کے ہزاروں قصبوں، دیہاتوں اور قریوں میں ہندو اور مسلمان پہلو بہ پہلو رہتے چلے آئے ہیں تو مسٹر جناح نے کہا کہ اس سے اُن کے اختلاف قومیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مسٹر جناح کے نزدیک ہر شہر، قصبہ اور دیہات میں دو قومیں ایک دوسرے کے مقابل صف بستہ ہیں اور انھیں دو ریاستوں میں تقسیم ہی ہوجانا چاہیئے۔

"میں مسئلہ کے تمام پہلوؤں سے قطع نظر کر کے صرف مسلم مفاد کے نقطۂ نظر سے اس کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ میں ایک قدم اور آگے بڑھانا چاہتا ہوں اور کہتا ہوں کہ اگر یہ ثابت کیا جاسکے کہ پاکستان کی اسکیم کسی کسی طرح بھی مسلمانوں کے لئے مفید ہے تو میں ذاتی طور سے اس کو قبول کرنے اور دوسروں سے بھی اس کے منوانے کے لئے آمادہ ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر میں اس اسکیم کا مسلمانوں کے فرقہ وارانہ مفادوں کے نقطۂ نظر سے بھی جائزہ لیتا ہوں تو اسی نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ یہ اسکیم کسی طرح انھیں نو فائدہ پہنچا سکتی ہے اور نہ اُن کے خوف اور شبہ کو دور کرسکتی ہے۔

پیش کروں گا جو انھوں نے ۱۵ اپریل ۱۹۴۶ء کو دیا تھا۔

"مسلم لیگ نے پاکستان کی جو اسکیم بنائی ہے میں نے اس پر ہر پہلو سے غور کیا ہے۔ ایک ہندوستانی کی حیثیت سے میں نے جانچنے کی کوشش کی ہو کر اس کے اثرات بحیثیت مجموعی ہندوستان کے مستقبل پر کیا پڑیں گے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے میں نے یہ پرکھنے کی کوشش کی ہو کہ مسلمانوں کی قسمت پر یہ اسکیم کس طرح اثر انداز ہو گی۔ اسکیم کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ بحیثیت مجموعی صرف ہندوستان ہی کیلئے ضرر رساں نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے لئے علی الخصوص نقصان دہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ اتنے مسائل حل نہیں کرتی ہے جتنے کھڑے کر دیتی ہے۔

"میں صاف کہنا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی اصطلاح ہی سے میرا ضمیر بغاوت کرتا ہے۔ اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ دنیا کے کچھ حصے پاک اور کچھ ناپاک ہیں۔ دنیا کے خطوں کی پاک اور ناپاک میں تقسیم غیر اسلامی ہے اور روح اسلام کے منافی ہو۔ اسلام ایسی تقسیم کو قبول نہیں کرتا۔ خود آنحضرت صلعم کا قول ہے کہ "اللہ نے ساری دنیا کو میرے لئے سجدہ گاہ بنا دیا ہے۔

"اس کے علاوہ ایسا معلوم ہوتا ہو پاکستان شکست خوردگی کا ایک نشان بن گیا ہے اور یہودیوں کے مطالبۂ وطنیت کی مثال کو سامنے رکھ کر وجود میں لایا گیا ہے۔ یہ اس اقرار کے مرادف ہو کہ مسلمان متحدہ ہندوستان میں اپنی جگہ باقی نہیں رکھ سکتے اس لئے وہ ایک گوشہ میں جو اُن کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہو، گوشہ نشینی اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ . . . .

"ایک مسلمان کی حیثیت سے، کم از کم میں ایک لمحہ کے لئے بھی اس بات کے آمادہ نہیں ہوں کہ سارے ہندوستان کو اپنی مملکت سمجھنے اور اسکی سیاسی اور

لیکن، جب عوامی جنون طاری ہو، جب "مذہب خطرے میں ہے" کی آواز بلند کی جارہی ہو، جب صرف ایک منفیانہ نقطۂ نگاہ اپنایا گیا ہو، تو عقل اور دلیل کی بات کون سُنتا ہے؟ مولانا کہتے اور سمجھاتے رہے، تمام قوم پرور مسلمان مخالفت کرتے رہے، گاندھی جی اور کانگریس تقسیم کو روکنے کے لئے ہر ممکن راہ عمل اختیار کرتے رہے، لیکن برطانوی حکومت کی شہ، مفاد پرستوں کی ریشہ دوانیوں، مسٹر جناح کی ضد، اور لیگی لیڈروں کی تنگ نظری نے کوئی دوسرا اور معقول حل سوچنے اور نیا راستہ اختیار کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ بالآخر ملک تقسیم ہو کے رہا اور لوگوں نے دیکھا کہ مولانا کی رائے کہاں تک صائب اور دور اندیشی پر مبنی تھی۔ تقسیم کے طفیل میں قتل و غارت کا جو طوفان اُٹھا، بربریت کا جو ننگا ناچ ہوا، اور جس طرح کنبے اور خاندان تباہ و برباد ہوئے اس کی یاد کم از کم موجودہ نسل کے ذہنوں سے تو بآسانی محو نہیں ہو سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا نے تقسیم کو روکنے کے لئے پوری کوشش کی اور آخر وقت تک کوشش کرتے رہے لیکن مسلم لیگ نے عارضی حکومت کے دوران میں جو رویہ اختیار کیا اُس کے بعد یہ بالکل واضح ہو گیا تھا کہ یہ لوگ کسی مشترکہ اقدام کے لئے ذہنی طور سے تیار نہیں ہیں اور خواہ مخواہ کے روڑے اٹکانا ہی فرض جانتے ہیں۔ جب صورت حال یہ ہو تو اتحاد عمل اور اشتراک کار کی کیا امید رہ جاتی تھی۔ اسی لئے بادلِ ناخواستہ کانگریسی قائدین بھی رفتہ رفتہ تقسیم کے لئے تیار ہی ہو گئے۔ اگر تقسیم کو تسلیم کر کے آزادی کا دن قریب آسکتا اور قومی حکومت کے راستے کی رکاوٹیں دور ہو سکتی تھیں تو دو مصائب میں سے کم تر عیب کو اختیار کرنے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ اسی لئے سردار پٹیل کی طرح کے تقسیم کے زبردست مخالف بھی بالآخر تقسیم پر راضی ہو گئے۔ یہاں تک کہ مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا نے بھی مجبوراً تقسیم کو تسلیم کر لیا۔

تقسیم ہی میں ہندوستان کے سیاسی مسائل کا حل نظر آیا۔ یقیناً یہ ایک بہت بڑا فیصلہ تھا۔ ساری قومی روایت، تاریخی اور جذباتی وابستگی اس فیصلہ کو قبول کرنے سے پس و پیش کرتی تھی۔ فرقہ واریت کے خلاف طویل جنگ بے سود ہو رہی تھی اور دماغ و دل کی دنیائیں ہلی جارہی

" آؤ ہم بالکل غیر جذباتی ہو کر یہ سوچیں کہ اگر پاکستان کی اسکیم پر عمل کیا گیا تو اس کے عواقب کیا ہوں گے۔ ہندوستان دو ریاستوں میں تقسیم ہو جائے گا، جن میں سے ایک میں ہندوؤں کی اکثریت ہو گی اور ایک میں مسلمانوں کی۔ ریاست ہندوستان میں ۲ ½ کروڑ مسلمان چھوٹی چھوٹی اقلیتوں میں سارے ملک کے طول و عرض میں بکھرے ہوئے موجود رہیں گے۔ یو۔ پی میں ۱۷ فی صدی، بہار میں ۱۲ فیصدی، مدراس میں ۹ فیصدی بٹے ہوئے، وہ آج کے ہندو اکثریت کے صوبوں میں آج کے مقابلے میں اور کمزور ہو جائیں گے۔ ان علاقوں میں ہزار دس برس سے وہ وطن بنا کر رہے ہیں اور یہاں انھوں نے مسلم ثقافت و تہذیب کے مشہور مراکز بنائے ہیں۔ جب وہ ایک دن سو کر اٹھیں گے تو یہ دریافت کریں گے کہ اپنے اسی وطن میں وہ غیر ملکی اور بیرونی ہو گئے۔ صنعتی، تعلیمی اور اقتصادی طور سے پسماندہ ہونے کے باعث، وہ ایک ایسے راج کے رحم و کرم پر رہیں گے جو غیر مخلوط قسم کا "ہندو راج" ہی ہو سکتا ہے۔

" دو ریاستیں ایک دوسرے کے مقابل صف بستہ ہو کر ایک دوسرے کی اقلیتوں کے مسئلے کو حل نہیں کر سکتیں، بلکہ بدلے اور انتقام کی فضا پیدا کر کے یرغمال (HOSTAGE) کا ایک مشترک طریقہ رائج کریں گی۔ اس لئے پاکستان کی اسکیم مسلمانوں کا کوئی مسئلہ حل نہیں کرتی۔ جہاں وہ اقلیت میں ہیں وہاں اُن کے حقوق کا اس اسکیم کے تحت تحفظ نہیں ہو سکتا اور پاکستان کے شہریوں کی حیثیت سے انھیں ہندوستانی یا عالمی معاملات میں وہ حیثیت کبھی حاصل نہیں ہو گی جو ہند یونین جیسے عظیم ملک کے شہری کی حیثیت سے حاصل ہو سکتی ہے۔۔۔۔۔۔"

اگر جنگ میں شریک ہوکر آزادی ملے تو وہ اُس کو بھی پسند نہیں کرتے۔ لیکن کانگریس کے ارباب حل و عقد میں مولانا آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو اس کے مخالف تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ سامراج، فسطائیت اور نازیت کا ایک کیمپ بن گیا ہے اور جمہوریتوں کا دوسرا۔ ایسی حالت میں آزاد ہند کو جمہوریتوں کا ساتھ دینا چاہیے، لیکن اگر ہندوستان کے پاؤں میں غلامی کی بیڑیاں پڑی رہیں تو ظاہر ہے کہ جنگ کے مساعی میں ساتھ دینا ان بیڑیوں کو اور مضبوط بنانا تھا۔

لیکن یہاں ابھی امکانات پر سوچا ہی جا رہا تھا کہ ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور وائسرائے نے ہندوستان کو رائے عامہ کے استصواب کے بغیر ہی جنگ میں جھونک دیا۔ اس کے بعد آرڈیننس وغیرہ بنا دئے گئے اور صوبوں کی محدود خود مختاری محدود کر دی گئی۔ چنانچہ ۸ — ۱۵ ستمبر ۱۹۳۹ء کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں ایک طویل تجویز پیش ہوکر پاس ہوئی:-

"اگر جنگ کا مقصد موجودہ صورت حال کو برقرار رکھنا اور سامراجی مقبوضات، نوآبادیات اور خصوصی مفادات و مراعات کا باقی رکھنا ہے تو ہندوستان کو اس جنگ سے کوئی سروکار نہیں ہو، لیکن اگر جمہوریت اور عالمی جمہوری نظام کے قیام کا سوال ہے تو ہندوستان قدرتی طور پر دلچسپی رکھتا ہے ... آج آزادی ناقابل تقسیم ہے اور سامراجی بالادستی کو برقرار رکھنے کی جو کوشش بھی دنیا کے کسی حصے میں ہوگی اس سے لامحالہ نئی تباہی آئے گی۔"

اس تجویز میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا گیا بلکہ گفت و شنید کا دروازہ کھلا رکھنے کے لئے پہلے برطانوی حکومت سے مقاصد جنگ کے اعلان کا مطالبہ کیا گیا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ جمہوریت اور نظام نو کے بارے میں برطانیہ کیا چاہتا ہے اور خود ہندوستان پر اس جمہوریت اور نئے نظام کا کہاں تک اطلاق ہوتا ہے۔ کیا ہندوستان میں بھی سامراج کا خاتمہ ہوگا اور آزاد حکومت قائم ہوگی۔ تجویز میں کہا گیا تھا:-

تھیں لیکن اس راہ کے علاوہ کوئی اور راہ نہیں رہ گئی تھی کیونکہ آزادی کے لئے بڑی سے بڑی قیمت بھی دینا گوارا تھا۔ کانگریس نے خطرہ مول لیا اور بدرجہ مجبوری خطرہ مول لیا۔ مولانا نے بھی ایک ضبط پسند رکن کانگریس کی حیثیت سے اس جماعتی فیصلہ کو قبول کیا۔ اُن کے دل میں کانٹا ضرور کھٹکتا رہا۔ پھر بھی وہ اُن لوگوں میں نہیں تھے جو دل کی اس کھٹک کو رائی کا پہاڑ بناتے۔ یہ بالکل ہی غیر جمہوری طریقہ ہوتا۔ جب جمہور نے ایک فیصلہ، بادل ناخواستہ ہی سہی، ملک کے مفاد آزادی کو پیش نظر رکھتے ہوئے کرلیا تو مولانا نے بھی اس فیصلہ کے آگے سر جھکایا۔

ملک کی تقسیم سے پہلے، جیسا کہ میں شروع میں بھی اشارہ کرچکا ہوں حکومت برطانیہ نے گفت وشنید کا ایک باب آغاز کیا تھا۔ چونکہ یہ دور مولانا کی صدارت کانگریس کا دور تھا اس لئے گفت وشنید کو کامیابی سے آگے بڑھانے کی ذمہ داری مولانا ہی کے سر پر آپڑی۔ ایک طرف برطانیہ کے بہترین سیاسی دماغ تھے اور دوسری طرف مولانا۔ اس جگہ مولانا کی سیاسی سوجھ بوجھ، اصابت رائے اور قوت فیصلہ کی داد نہ دینا ناممکن ہے کہ انھوں نے مذاکرات میں تن تنہا حصہ لیا اور کانگریس اور ملک کے نقطۂ نظر کو اس انداز سے پیش کیا کہ مخالف اور موافق سب لوہا مان گئے۔ یہاں تفصیلات میں جانے کا تو موقع نہیں ہے لیکن یہ گفت وشنید جس پس منظر میں شروع ہوئی اُس کا اعادہ ضروری ہے۔

سنہ ۱۹۳۹ء ہی میں جنگ کے بادل منڈلانے لگے تھے اور کانگریس نے اجلاس تریپورہ (مارچ ۱۹۳۹ء) میں برطانیہ کی اُس خارجی پالیسی سے علیحدگی کا اعلان کردیا تھا جس کے ماتحت برطانیہ ہمیشہ فسطائی طاقتوں کا ساتھ دیتا رہتا تھا اور جمہوریتوں کا گلا گھونٹتا تھا۔ کانگریس فسطائیت اور شہنشاہیت دونوں سے بیزار اور امن وآزادی کی ہوا خواہ تھی۔ گاندھی جی عدم تشدد کے حامی تھے اور ساری دنیا کے جنگ دشمن اُن کی طرف نظریں جمائے تھے۔ گاندھی جی اس بات پر بار بار زور دیتے تھے کہ ہندوستان کو جنگ میں شریک نہ ہونا چاہیئے۔ وہ تو یہاں تک کہتے تھے کہ

بھی مولینا کے کہنے پر ورکنگ کمیٹی سے فوری طور پر علیحدہ نہیں ہوئے۔

اگست ۱۹۴۰ء میں برطانیہ نے گفت وشنید کی طرف پہلا جھجکتا قدم اُٹھایا اور وائسرائے نے مولینا کو اس مسئلہ پر گفتگو کرنے کے لئے بلایا کہ وائسرائے کی اگزیکیوٹیو کاؤنسل میں توسیع کردی جائے اور کانگریس بھی شریک حکومت ہوجائے۔ مولینا نے اپنے معاونین کار کے استمزاج کے بغیر ہی یہ پیشکش ٹھکرادی کیونکہ کانگریس کے مطالبۂ آزادی اور کاؤنسل کی توسیع میں زمین وآسمان کا فرق تھا۔

یہاں سلسلۂ واقعات کو باقی رکھنے کے لئے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ گاندھی جی اس کے پہلے وائسرائے سے مل چکے تھے اور اس کے بعد بھی وائسرائے سے ملے۔ لیکن اُن کا مقصد ہی اور تھا۔ وہ یہ کہنے جاتے تھے کہ برطانیہ اسلحوں کے بجائے روحانی طاقت سے جرمنی کا مقابلہ کرے۔ انھوں نے برطانوی پبلک کے سامنے ایسی تجویز بھی دوبار رکھی۔ لیکن جنگ کے دوران میں ہتھیار ڈالنے کی بات کون سُنتا!

وائسرائے کی تجویز سے یہ ظاہر ہوگیا تھا کہ اس وقت برطانیہ آزادی کی بات ہی نہیں کرنا چاہتا۔ اس لئے جنگ میں تعاون وعدم تعاون کی بحث صرف نظری رہ گئی تھی اور اب کسی نئی تحریک کی بات سوچی جانے لگی تھی کیونکہ جب دنیا اُتھل پتھل ہورہی ہو تو کوئی زندہ سیاسی جماعت ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی نہیں رہ سکتی۔ مسئلہ یہی تھا کہ ہندوستان کو اُسکی مرضی کے خلاف جنگ میں کیوں جھونک دیا گیا۔ اس پر کانگریس کی دونوں ہی جماعتیں متفق تھیں کہ یہ صریحی زیادتی ہے۔ اس لئے اس کے خلاف احتجاجاً مہاتما گاندھی نے "انفرادی سول نافرمانی" کا آغاز کیا۔ مولینا اس تحریک میں بصر بذاتہ نہیں لے پائے تھے کیونکہ وہ اس تحریک کو چلانے میں مصروف تھے لیکن حکومت کب چوکنے والی تھی۔ وہ پنجاب سے واپس آرہے تھے کہ الٰہ آباد اسٹیشن پر گرفتار کرلئے گئے۔ گرفتاری کے وقت مولینا نے "انفرادی ستیہ گرہی بننے سے پہلے ہی گرفتاری کے مخصوص اعزاز" پر سپرنٹنڈنٹ پولیس کا شکریہ بھی ادا کیا تھا۔ گرفتاری کے بعد دو برس کی سزا ہوگئی۔

جنگ اور نازک صورت اختیار کرتی گئی۔ جون ۱۹۴۱ء میں جرمنی نے روس پر حملہ کردیا

"اعلان کی کسوٹی دراصل حالات موجودہ میں اُس پر عملدرآمد ہی ہے
کیونکہ حال ہی سے آج کے اقدامات کی تشکیل اور مستقبل کی تعین ہوگی......
خطرہ بڑھتا جارہا ہے اور تشدد اور تشدد کے خطرات کا سایہ ساری دنیا پر
پھیل چکا ہے۔ اگر اسے روکا اور ختم نہ کیا گیا تو زمانۂ سابقہ کی ساری قیمتی
وراثت برباد ہو کر رہ جائیگی۔ اس بھیانک خطرے کا یورپ اور چین میں سدِ باب
کرنا ہے لیکن اس کا اُس وقت تک خاتمہ نہیں ہوگا جب تک کہ اس کے بنیادی
اسباب یعنی فسطائیت اور سامراج کا خاتمہ نہیں کیا جاتا اور اس مقصد کے حصول
کے لئے ورکنگ کمیٹی اپنا پورا تعاون دینے کو تیار ہے"

اسی نازک زمانے میں کانگریس کی صدارت کا چناؤ ہوا اور مولینا آزاد ایم، این، رائے کے مقابلے میں منتخب ہو گئے اور نئی ورکنگ کمیٹی بنی جس میں جواہرلال بھی شامل ہوئے جو سبھاش بوس کے استعفے کے بعد ڈاکٹر راجندر پرشاد کی ورکنگ کمیٹی سے الگ رہے تھے۔ شمولیت جنگ کے مسئلے پر ورکنگ کمیٹی کے ممبران میں اختلافات بڑھتے گئے۔ شروع میں مولینا کے ساتھ جواہرلال نہرو، سردار پٹیل، راج گوپال آچاریہ اور خان عبدالغفار خاں تھے لیکن ڈاکٹر راجندر پرشاد، آچاریہ کرپلانی اور شنکر راؤ دیو، گاندھی جی کے ہمخیال تھے۔ جولائی ۱۹۴۰ء میں پونہ میں اے، آئی، سی، سی کے اجلاس میں دو رزولیوشن پاس ہوئے۔ ایک میں اعلان کیا گیا کہ حصول آزادی کے لئے کانگریس عدم تشدد ہی کے طرزِ کار کو اپنائے رہے گی۔ دوسری تجویز میں کہا گیا تھا کہ جمہوریت اور نازیت کی جنگ میں ہندوستان کی جگہ جمہوری کیمپ ہی میں ہے لیکن جب تک آزادی نہ ملے، ہندوستان کا جنگی مساعی میں تعاون ناممکن تھا۔ لیکن اس سے معاملات طے نہیں ہوئے بلکہ بالخصوص دوسرے رزولیوشن کے پاس ہو جانے پر گاندھی جی کے ہمخیال ممبران کانگریس نے اپنا استعفے ہی مولینا کے پاس بھیجدیا۔ صرف جواہرلال نہرو، آصف علی، راج گوپال آچاریہ اور ڈاکٹر محمود، مولینا کے ہمخیال رہ گئے۔ لیکن چونکہ فوری طور پر جنگ میں بھی شرکت کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا اس لئے استعفیٰ بھیجنے والے ممبران

اس کا یقین دلایا جائے کہ ہندوستانی نمائندوں کو آزادانہ اور ذمہ دارانہ کام کرنے کا موقع ملے گا تو برطانوی تعاون کی پیشکش کانگریس کے لئے قابل قبول ہوگی۔ چیانگ کائی شیک کے اس کہنے پر کہ دوران جنگ میں سو فیصدی ذمہ داری دینا تو شاید برطانیہ کے لئے ممکن نہ ہو، مولینا نے کہا کہ "اصل سوال جنگ کے خاتمہ کے بعد آزادی کا ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے اور عملاً اس کے بروئے کار آنے کا یقین ہو جائے تو دوران جنگ کے لئے ایسی شکل نکل سکتی ہے جو برطانیہ اور ہندوستان دونوں کے لئے قابل قبول ہو"۔

چیانگ کائی شیک ایک اہم اتحادی نمائندے اور چار بڑوں میں شامل تھے۔ خود ہندوستان میں وہ حکومت ہند کے مہمان تھے۔ اُن کا آنا جس مقصد سے تھا وہ برطانوی حکومت کے علم میں تھا، اس لئے چیانگ کائی شیک نے ساری گفتگو ضرور ہی برطانیہ کے کانوں تک پہنچائی ہوگی اور میرا خیال ہے کہ اس گفتگو سے کافی برکت پھیلی، کیونکہ دنیا کو معلوم ہو گیا کہ اگرچہ مہاتما گاندھی عدم تشدد کے فلسفے سے دم بھر کے لئے بھی دست بردار نہیں ہو سکتے، لیکن کانگریس من حیث الجماعت بشرطہا و شروطہا مساعی جنگ میں حصہ لینے سے گریز نہیں کرے گی۔ اب برطانوی پروپیگنڈے کے لئے اتحادی کیمپوں میں بھی گنجائش نہیں رہ گئی اور اسی لئے وہ کانگریس سے گفت و شنید کا آغاز کرنے پر مجبور ہوئی۔ غالباً جو چیز اور بھی معاون ہوئی وہ یہ تھی کہ برطانوی مدبّر، سر اسٹیفورڈ کرپس، آغاز جنگ کے بعد ہندوستان آئے تھے اور یہاں کے مختلف قائدوں سے ملے تھے جس میں مولینا بھی شامل تھے۔ اُس وقت بھی یہ امر معلوم تھا کہ مہاتما گاندھی اس بات پر کسی طرح رضامند نہیں تھے کہ ہندوستان جنگ میں شریک ہو۔ لیکن مولینا آزاد، پنڈت نہرو اور دوسرے قائدین کا یہ خیال بھی عام ہو چکا تھا کہ اگر ذمہ داری حقیقی طور پر دی جائے تو ہندوستان مساعی جنگ کو آگے بڑھانے میں پورا حصہ لے گا۔ کرپس نے مولینا سے براہ راست یہ سوال کیا تھا کہ کیا مہاتما گاندھی جی کی مخالفت کے باوجود کانگریس نہرو۔ آزاد طرز خیال اپنائے گی۔ مولینا نے یقین دلایا تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔ غرض اندرونی اور بیرونی طور پر ضرور ایک ایسی فضا تیار ہو گئی تھی جس میں برطانوی رجعت پسندوں کے لئے مزید حیلہ بازی ممکن نہیں تھی۔

اور ۱۹۴۱ء ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ جاپان نے پرل ہاربر پر دھاوا بول دیا۔ اب امریکہ بھی براہ راست جنگ میں آ گیا اور حقیقی معنوں میں عالمگیر جنگ ہو گئی۔ جاپان کو ابتدا میں جلد جلد کامیابیاں ہوئیں اور سنگاپور اور ملایا کی فتح کے بعد برما کے آزادی سے محروم ہو جانے کا مطلب یہ ہو گیا تھا کہ جنگ خود ہندوستان کی سرحدوں تک آ پہنچی تھی۔ صدر روزولٹ نے برطانیہ پر زور ڈالنا شروع کیا کہ ہندوستان سے معاملات طے کر کے ہندوستان کے عوام کو بھی مساعی جنگ میں تہہ دل سے شریک ہونے کا موقع دے۔ خود برطانیہ نے خطرہ کو محسوس کیا ہی ہوگا۔ یہ بھی معلوم ہو کہ چینی لیڈر بھی ہندوستانی آزادی کے خواہاں تھے۔ بہر حال، جو بھی محرکات رہے ہوں، حکومت نے مولینا اور پنڈت جواہر لال نہرو کو دسمبر ۱۹۴۱ء میں رہا کر دیا۔

اسی دوران میں ایک اور اہم واقعہ رونما ہو چکا تھا۔ سبھاش چندر بوس جو جنگ کی ابتدا ہی سے مساعی جنگ کی کھلم کھلا مخالفت کی پاداش میں قید و بند کے مصائب جھیل رہے تھے یکایک ہندوستان سے خفیہ طور پر نکل گئے اور جرمنی اور جاپان سے آزادیٔ ہند کی مہم چلانے لگے۔ اُن کی غیبت کا پتہ پہلے پہل ۱۹۴۱ء کے یوم آزادی کو چلا۔ مارچ ۱۹۴۲ء سے تو انکی تقریریں برابر براڈکاسٹ ہونے لگیں۔ جرمنی، جاپان اور اٹلی سے ہندوستانی میں نشریات بڑے التزام سے ہونے لگے۔ ملک میں ایک طرف گرفتاریوں اور ظلم و تشدد کا سلسلہ جاری تھا اور دوسری طرف سبھاش بوس کی کارگزاریاں اور خود جنگ کی نوعیت نے مل جل کے ہندوستان کے عوام کو برطانیہ سے بیحد متنفر کر دیا تھا اور خود کانگریس میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو برطانیہ کی شکست تک کا تصور کرنے لگا تھا۔ امریکہ متاثر تھا ہی، چین جو ہمارا اہم سرحدی بھی تھا کچھ اور بھی متاثر ہوا۔ چنانچہ چیانگ کائی شیک اور جنرلسمو کی اہلیہ فروری ۱۹۴۲ء میں ہندوستان آئے اور یہاں کے ارباب بست و کشاد سے ملے۔ ان کی گفت و شنید سے یہ اندازہ ہوا کہ اُن کے خیال میں خاتمۂ جنگ کے بعد ہندوستان کو آزادی مل جائیگی۔ البتہ اُن کے نزدیک مکمل آزادی کی بجائے ڈومی نین اسٹیٹس پہلے قبول کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں تھا۔ مولینا آزاد اور پنڈت نہرو مخصوص طور سے جنرلسمو چیانگ کائی شیک سے ملے۔ مولینا نے صدر کانگریس کی حیثیت سے کہا کہ اگر دوران جنگ میں ڈومینین اسٹیٹس مل جائے اور

پتہ چلتا ہے کہ کانگریس کافی آگے جانے کو تیار ہوگئی تھی اور اس میں پنڈت نہرو کا بہت بڑا حصہ تھا کیونکہ وہ اس جنگ کے فسطائیت دشمن پہلو کو بخوبی دیکھ اور سمجھ رہے تھے۔ مگر برطانیہ کے رجعت پسند ہندوستان کو باقاعدہ ذمہ داریاں دیتے ڈرتے اور ہچکچاتے تھے اور چرچل کا خیال تو معلوم ہی تھا کہ وہ "سلطنت برطانیہ کے کریا کرم کی صدارت کرنے کے لئے وزیراعظم نہیں ہوئے تھے"۔ غرض مذاکرات ناکامیاب رہے لیکن مولینا نے اس خوبی سے بات چیت کو آگے بڑھایا تھا کہ کوئی تلخی پیدا نہ ہونے پائی[1]۔

جن اُمور پر ہند و برطانیہ میں اختلاف ہوا تھا اگرچہ اس کا تعلق براہ راست برطانوی پس وپیش سے تھا لیکن اُس میں صوبوں کی علیحدگی کا سوال بھی آگیا تھا۔ کانگریس کسی حصہ کو یونین میں اُسکی مرضی کے خلاف رکھنا نہیں چاہتی تھی، لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ حالات ایسے پیدا کیے جائیں کہ مختلف علاقے اور حصے باہم دگر مل کر رہنے اور وحدت قومی کو باقی رکھنے کی بات سوچیں۔ کرپس کی پیشکش کے مان لینے کے معنی یہ تھے کہ ایسا موقع ملے بغیر پہلے ہی سے انھیں حق علیحدگی دیدیا جائے۔ آپس میں مل جل کر کام کرنے کا کوئی موقع نہ دینا، یہاں کے رجعت پسندوں اور تقسیم پروروں کو گڑبڑ پیدا کرنے کی آزادی دینے کے مرادف تھا۔ بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ آزادی کے راستے میں صاف یہی روڑا ہے کہ مسلم لیگ کا مطالبہ پاکستان مان نہیں لیا جاتا۔ ان میں راج گوپال اچاریہ آگے آگے تھے۔ انھوں نے تو اپنے اس اختلاف کو پبلک بھی بنادیا اور مدراس کانگریس لیجسلیچر پارٹی میں اس مفہوم کا رزولیوشن بھی پاس کردیا کہ اگر حق علیحدگی کا تسلیم نہ کرنا، قومی حکومت کی تشکیل میں مانع ہے تو اسے بلا تامل تسلیم کرلینا چاہیے کیونکہ دو شروں میں یہ کمتر شر ہے"۔ مولینا نے اس پر صدر کانگریس کی حیثیت سے راج گوپال آچاریہ سے باز پُرس کی۔ وہ اپنی رائے پر اَڑے رہے اور بالآخر ورکنگ کمیٹی سے مستعفی بھی ہوگئے۔ بہرحال اُن کی طرزِ فکر کے لوگ کانگریس میں کم ہی تھے کیونکہ اپریل کے آخر میں الہ آباد میں جو اے، آئی، سی، سی[2] کا اجلاس منعقد ہوا۔ اُس میں ورکنگ کمیٹی کے فیصلے کی تصدیق کردی گئی۔

---

[1] غلامی اور علیحدگی [2] آل انڈیا کانگریس کمیٹی۔

غرض، مارچ ۱۹۴۲ء میں حکومت برطانیہ کی جانب سے سر اسٹیفورڈ کرپس ہندوستان آئے اور اپنے ہمراہ برطانوی کابینہ کی تجویزیں بھی لائے۔ ۲۹ / مارچ ۱۹۴۲ء کو مولانا آزاد اور کرپس کے درمیان پہلی ملاقات ہوئی۔ کرپس کی لائی ہوئی پیشکش کا خلاصہ یہ تھا کہ دوران جنگ میں موجودہ وائسرائے کونسل مستعفی ہو جائے گی اور اس کی جگہ خالص ہندوستانی کاؤنسل بنے گی جس کو ہندوستان کی سیاسی پارٹیاں تشکیل دیں گی، برطانوی حکومت یہ اعلان کرے گی کہ جنگ کا خاتمہ ہوتے ہی ہندوستان کی آزادی کے مسئلہ پر غور ہوگا۔ ویسے ایک آئین ساز اسمبلی کو مستقبل کے بارے میں ایسا آئین تیار کرنے کے اختیارات دینے کا بھی ذکر تھا جس کے ماتحت ہندوستان کے مختلف صوبوں کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ چاہے ہندیونین میں شامل ہوں چاہے علیحدہ رہیں۔ مولانا نے ورکنگ کمیٹی کا اجلاس طلب کیا تھا اور یہ اجلاس مذاکرات کے خاتمہ تک جاری بھی رہا۔ ۲۹ / مارچ سے ۱۰ / اپریل تک گفت وشنید ہوتی رہی۔ شروع سے ایک بنیادی مسئلہ یہ اُٹھ کھڑا ہوا تھا کہ یہ کاؤنسل ایک کابینہ کی طرح کام کرے گی یا نہیں، یعنی وائسرائے کو صرف ایک آئینی سربراہ کی حیثیت ہوگی یا اس سے زیادہ؟ ضمنی طور پر یہ سوال بھی اہم بن گیا تھا کہ ممبر دفاع کے اختیارات کیا ہوں گے؟ کیا دفاع کی ساری ذمہ داری کمانڈر انچیف پر ہوگی اور اگر ہوگی تو دفاع کی پالیسیوں کی تشکیل وغیرہ میں اور جنگی مساعی کو آگے بڑھانے میں ممبر دفاع شریک مشورہ رہے گا یا نہیں؟ خود انڈیا آفس کا سوال بھی تھا کہ سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کو وہی اہمیت حاصل ہوگی جو کامن ویلتھ سکریٹری کو ہے یا اُس کے عملی اختیارات کا سایہ بدستور کاروبار حکومت پر پڑتا رہے گا؟ پہلی ملاقات کافی امید افزا تھی اور اسٹیفورڈ کرپس نے مولانا کے ذہن پر یہ نقش چھوڑنا چاہا تھا کہ دوران جنگ میں تفصیلی آئینی تبدیلیاں تو ممکن نہیں ہیں لیکن عملی طور پر یہ حکومت اُسی طرح چلے گی جیسے آئینی جمہوری حکومتوں کو چلنا چاہیے، یعنی اصلی اختیار کابینہ کے پاس ہوگا جس کے مشوروں پر وائسرائے، کمانڈر انچیف اور انڈیا آفس سبھی چلیں گے لیکن بعد میں خود وائسرائے کے رجعت پسند مشیروں اور رجعت پسند برطانوی سرکار کے دباؤ میں آکر کرپس کو رنگ بدلنا پڑے اور "چنیں وچناں" میں بات چیت ہونے لگی۔ اس کی جو تفصیلات سامنے آئی ہیں اُن سے

مولانا کو یہ خط لکھ کر بھیجا کہ دونوں میں اختلافات اتنے بڑھ گئے ہیں کہ دونوں کا ایک ساتھ مل کر کام کرنا ناممکن ہوگیا ہے اور یہ خط پاکر مولانا استعفیٰ دینے پر تیار ہوگئے۔ لیکن پھر سردار پٹیل نے گاندھی جی پر زور ڈالا کہ معاملات کا اس حد تک جانا بالکل ہی نامناسب ہے۔ مہاتما گاندھی کی یہ خصوصیت تھی کہ جب وہ یہ محسوس کر لیتے تھے کہ بڑھا ہوا قدم پیچھے ہٹا لینا چاہیئے تو وہ پس وپیش نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ دوسرے ہی دن صبح کو انھوں نے مولانا کو بتایا کہ وہ اُس خط کو واپس لینا چاہتے ہیں۔ عظمت کردار کی یہ نمایاں مثال تھی جو گاندھی جی نے پیش کی۔ چونکہ اختلافات اصولی تھے اس لئے صفائی بھی جلد ہوگئی۔ بہرحال یہ طے ہوگیا تھا کہ تحریک چلانا ہی پڑے گی اور باقاعدہ بحث ومباحثہ کے بعد ورکنگ کمیٹی نے رزولیوشن پاس کیا جو بعد میں "ہندوستان چھوڑو تجویز" کے نام سے مشہور ہوا۔ اس رزولیوشن میں صاف لفظوں میں کہا گیا تھا کہ جب تک برطانوی اقتدار کا ہندوستان سے خاتمہ نہیں ہوتا اُس وقت تک مسائل حل نہیں ہوسکتے۔ اگرچہ یہ رزولیوشن سابقہ تجویزوں کے مقابلے میں ذرا گرم تھا پھر بھی اسکی تشکیل اس نوعیت سے کی گئی تھی کہ اگر حکومت تعاون کا ہاتھ بڑھانا چاہے تو کانگریس بھی آگے بڑھ سکتی تھی۔ آخری فیصلہ ۷ راگست کو ہونے والے کل ہند کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں ہونا تھا۔

۱۴ر جولائی اور ۷ راگست کے مابین تین ہفتے کا وقفہ تھا اور اگر حکومت برطانیہ میں عملی دوراندیشی ہوتی تو وہ نتائج مابعد کو بچا سکتی تھی اور گفت وشنید کا آغاز کرکے مسائل کو سلجھانے کی کوشش کرسکتی تھی۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں ہندوستان میں بھی اور برطانیہ میں بھی حکومت کی باگ ڈور رجعت پسندوں اور تقسیم پسندوں کے ہاتھ میں تھی اس لئے مصالحت کے دروازے جو پہلے ہی سے بند ہوچکے تھے اس رزولیوشن کے پاس ہوجانے کے بعد اور بھی زور سے بند کرلئے گئے۔ حد یہ ہے کہ میرا بہن کو (سابق مس سلیڈ، ایک برطانوی امیرالبحر کی صاحبزادی) جو بھولا بھائی ڈیسائی کے کہنے پر وائسرائے سے ملنا چاہتی تھیں، مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔ وائسرائے نے ملنے سے انکار کردیا اور اُن کے پرائیویٹ سکریٹری بھی ملے تو انھوں نے حکومت کا یہی منشا ظاہر کیا کہ حکومت ایسی جماعت کے کسی نمائندے سے بات بھی نہیں کرنا چاہتی جو بغاوت کی بات کرتی ہو۔ یہ بات عیاں ہوگئی تھی کہ امتحان دار ورسن پھر سر پر آگیا ہے لیکن کوئی بھی نہیں جانتا تھا

اسی زمانے میں ہندوستان پر جاپانی حملے کا خطرہ بڑھ گیا تھا اور حکومت یہ تیاریاں کرنے لگی تھی کہ اگر ایسا حملہ ہو تو وہ کس نظم کے تحت پسپا ہوگی۔ یہاں تک کہ حملہ ہو جانے کے بعد پُلوں کو اُڑانے اور کارخانوں وغیرہ کے برباد کر دینے کے منصوبے بھی بنائے گئے۔ ملک میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو جاپانی فتوحات سے خوش تھا۔ کانگریس نے صاف صاف بتا دیا تھا اور مولینا نے الہ آباد کے اجلاس کُل ہند کانگریس کمیٹی میں کھلے طور پر اعلان کر دیا تھا کہ جاپانی حملہ آوروں کا مقابلہ کیا جائے گا کیونکہ ایک کی غلامی سے نکل کر دوسرے کی غلامی میں جاتے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ لیکن پھر بھی کچھ لوگوں کا دماغ ناصاف تھا۔ اس کی مزید وضاحت ضروری تھی اور خود حملہ کے خطرے کا مقابلہ کرنے کی تیاریوں کا سوال تھا۔ لیکن یہ سب سوال ثانوی حیثیت اختیار کرنے لگے کیونکہ کرپس مشن کی ناکامی سے ہندوستانیوں کے دل و دماغ کو شدید ضرب پہنچی تھی اور لوگ غم و غصہ میں جوابی کارروائی کی تیاریاں کرنے لگے تھے۔ خود کانگریس کے لئے بھی یہ ناممکن تھا کہ مذاکرات کی ناکامی کے بعد ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہے۔ مہاتما گاندھی بھی اب ایک عوامی تحریک کے آغاز کے بارے میں سوچنے لگے تھے اور انھوں نے "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک کا ایک خاکہ اپنے ذہن میں تیار بھی کر لیا تھا۔

۵ر جولائی ۱۹۴۲ء کو جب ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے لئے مولینا واردھا پہنچے تو گاندھی جی نے پہلے پہل مولینا سے "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کا تذکرہ کیا۔ ویسے تو شروع جنگ سے وہ تحریک چلانے کے خواہشمند رہے تھے لیکن گاندھی جی اس وقت کسی تحریک کے لئے آمادہ نہیں تھے اور اب جب گاندھی جی تحریک چلانے کی بات سوچنے لگے تو ابوالکلام آزاد پس و پیش میں پڑ گئے کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ جب جاپان ہندوستان کے دروازے پر دستک دے رہا ہو اُس وقت حکومت برطانیہ کسی تحریک کو برداشت نہیں کرے گی اور سب لیڈر جیلوں میں بند کر دئے جائیں گے اور پھر خدا جانے تحریک کیا رنگ اختیار کرے۔ مہاتما جی کے بعض رفقا کا خیال یہ تھا کہ دشمن کے دروازے پر موجود ہونے ہی کی وجہ سے شاید حکومت برطانیہ کوئی عاجلانہ اقدام نہ کرے اور تحریک کو باقاعدہ اور منظم طور پر چلانے کا موقع مل جائے۔ ان اختلافات نے یہاں تک طول کھینچا کہ گاندھی جی نے

جنگ کا نقشہ بدلتا جا رہا تھا اور اب تحادیوں کو اپنی فتح سامنے نظر آ رہی تھی۔ اس لئے اب برطانیہ یہ عذر بھی پیش نہیں کر سکتا تھا کہ جنگ نازک دور میں ہے اور ہندوستانیوں کے شانوں پر جنگ کی ذمہ داریاں نہیں رکھی جا سکتیں۔ اس کے علاوہ اب برطانیہ کے لئے امریکہ کے مشوروں کو ٹھکرانا ناممکن ہو گیا تھا اور صدر روزولٹ کو ہندوستانی عزائم سے جو دلچسپی تھی اُن کا بھی ذکر ہو چکا ہے۔ غرض تمام حالات نے مل ملا کر لارڈ ویول، وائسرائے ہند کے سفر انگلستان کے لئے مئی ۱۹۴۵ء میں فضا ہموار کی۔ وہاں سے واپسی پر شملہ کانفرنس کی تیاریاں ہونے لگیں اور جون میں مولانا رہا کر دئے گئے اور ساتھ ہی اور ممبران ورکنگ کمیٹی بھی۔ ان لوگوں کی رہائی کا مقصد یہ تھا کہ شملہ کانفرنس میں شمولیت کا موقع دیا جائے۔

اس گرفتاری اور رہائی کے مابین مولانا آزاد دو زبردست سانحوں سے دوچار ہو چکے تھے۔ ایک تو آپ کی رفیقۂ حیات کی وفات اور کچھ دنوں کے بعد آپ کی ہمشیرہ کا انتقال۔

بہرحال، رہائی کے فوراً بعد ہی نئی سیاسی چہل پہل شروع ہو گئی۔ ۱۴۔ جون کو سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا، مسٹر ایمری نے دارالعوام میں اعلان کیا کہ ہندوستان کو ایک آزاد ملک کی حیثیت سے جنگ کے بارے میں فیصلہ کرنے کا پورا موقع دیا جائے گا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اب کی بار کانگریس اور مسلم لیگ سے حکومت بنانے کو کہا جا رہا ہے اس لئے کانگریس کو اختیار ہوگا کہ وہ کسی کو بھی (جس میں مولانا آزاد شامل ہیں) اپنا نمائندہ منتخب کرے۔ اس سے پتہ چل رہا تھا کہ برطانوی حکومت کے رویہ میں کچھ تبدیلی آئی ہے۔ آزاد کی رہائی کے دوسرے ہی دن اُن کو وائسرائے کی جانب سے گول میز کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ مسئلہ ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش ہوا اور مولانا کانگریس کی جانب سے نمائندہ منتخب ہوئے۔ یہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اگرچہ سیاسی امور میں برطانوی حکومت اور کانگریس کے درمیان فاصلہ کم ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا لیکن مسٹر جناح نے یہ رویہ اختیار کیا کہ صرف وہی مسلمان لئے جائیں جنھیں مسلم لیگ نامزد کرے اور دوسری کوئی جماعت مسلمانوں کو نامزد نہ کرے۔ اس طرح کانفرنس ناکام ہو گئی۔ جناح صاحب مسلمانوں کی جماعت مسلم لیگ کے صدر تھے اور اس کوشش میں تھے کہ کانگریس کو بھی وہ اُسی فرقہ وارانہ سطح پر لے آئیں۔ وہ یہ جانتے تھے کہ کانگریس اپنی قدیم روایات اور اپنے

کہ سامراجی تشدد کا ننگا ناچ کس نہج سے ہونے والا تھا۔ آخر کار ۷ اگست بھی آگئی اور "ہندوستان چھوڑو" تجویز پیش ہو کر ۸ اگست کی شام کو پاس ہو گئی۔ یہ رزولیوشن ورکنگ کمیٹی کے رزولیوشن سے بھی زیادہ زوردار تھا۔ حکومت نے تمام انتظامات پہلے ہی سے مکمل کر لئے تھے۔ ۹ اگست کی صبح کو مہاتما گاندھی اور ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبران اور صوبوں کے لیڈر بھی گرفتار کر لئے گئے۔ گاندھی جی اور مسز نیڈو کو آغا خاں پیلس، پونا میں اور مولینا آزاد اور دوسرے ممبران ورکنگ کمیٹی کو قلعہ احمد نگر میں قید کر لیا گیا۔ میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ "ہندوستان چھوڑو" تحریک نے سارے ملک میں ایک برقی رو دوڑا دی تھی اور واقعہ یہ ہے کہ بغاوت کے لئے فضا تیار تھی۔ یکایک لیڈروں کی گرفتاری اور پھر شدید تشدد کے مظاہروں نے تحریک کا رخ ہی موڑ دیا۔ گاندھی جی اور کانگریس اس کو بالکل ہی عدم تشدد کے اصولوں پر چلانا چاہتے تھے لیکن جب وحشیانہ ظلم و ستم کے شعلے حکومت نے بھڑکا دیئے تو کانگریس لیڈروں کی عدم موجودگی میں تحریک بھی تشدد کے راستے پر جا پڑی۔ بنگال، بہار، یو۔پی اور بمبئی میں تحریک کا بڑا زور رہا۔ جو کچھ ہوا وہ ابھی تک حافظوں میں تازہ ہے اور اس کے اعادہ کی ضرورت اس لئے بھی نہیں ہے کہ یہ زمانہ آزاد کے قید و بند کا زمانہ ہے۔

اس عرصہ میں چند واقعات ایسے ضرور ہیں کہ اُن سے جیل کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے بھی متاثر ہونا ناممکن تھا۔ ۱۹۴۳ء کے آغاز میں مہاتما گاندھی نے اپنی نظر بندی ہی میں ۲۱ دن کے برت کا اعلان کیا۔ گاندھی جی کی صحت اس زمانے میں کافی گر گئی تھی۔ پھر بھی حکومت نے انھیں رہا نہیں کیا۔ گاندھی جی یہ امتحان جھیل گئے۔ لیکن وہ بہت ہی کمزور ہو گئے تھے اور اسی بنا پر اُن کو ۱۹۴۴ء میں رہا بھی کر دیا گیا۔ مسز نیڈو بھی علالت کی بنا پر رہا ہو چکی تھیں۔ گاندھی جی نے رہائی کے چند ہی دنوں بعد ایک طرف تو جناح صاحب سے خط و کتابت شروع کر دی اور دوسری طرف انھوں نے نیوز کرانکل کو ایک بیان بھی دیا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ اگر ہندوستان آزاد ہو جائے تو وہ مساعی جنگ میں حصہ لے سکتا ہے۔ گاندھی جی ہندوستان کی آزادی کے لئے اپنے طرز فکر میں تھوڑی سی عملی لچک پیدا کر لیا کرتے تھے۔ آزادی اُن کے محبوب ترین مقاصد میں تھی بالکل اسی طرح جیسے اور روحانی اور اخلاقی اقدار کا حصول!

ہوتے رہے۔ بالآخر ۱۶رمئی کو کابینہ مشن نے اپنی تجاویز پیش کیں جس کے ماتحت مرکزی حکومت کے پاس صرف دفاع، امورِ خارجہ اور رسل رسائل کے اختیارات رہنے والے تھے۔ یہ خود مولانا آزاد کی پیش کردہ تجویز تھی جسے کانگریس کی پوری حمایت حاصل تھی۔ لیکن کابینہ مشن نے سارے ملک کو تین علاقوں میں تقسیم کر دیا۔ (ا)۔ (ب)۔ (ج) علاقہ (ب) میں پنجاب، سندھ، سرحد اور برطانوی بلوچستان شامل تھے۔ یہ مسلم اکثریت کا علاقہ تھا۔ علاقہ (ج) میں بنگال اور آسام تھے، جہاں مسلمانوں کی خفیف سی اکثریت تھی۔ اگرچہ ہند کے علاقوں میں تقسیم کانگریس کو ناپسند تھی لیکن کابینہ مشن کی تجویز میں وحدتِ ہند کو وفاقی شکل میں باقی رکھا گیا تھا۔ مسلم لیگ نے تھوڑے تامل کے بعد اسے منظور کر لیا کیونکہ جناح صاحب کے لفظوں میں اس سے زیادہ ملنا ناممکن تھا۔ کانگریس نے بھی ۶رجون کو کابینہ مشن کی تجویز سے اتفاق کا رزولیوشن پاس کر دیا، اگرچہ علاقائی تقسیم کے علاوہ اس تجویز میں عارضی حکومت کی جو تجویز مشن نے پیش کی تھی اُس سے کانگریس متفق نہیں تھی۔ مشن کی تجویز میں آئین ساز اسمبلی کی تشکیل بھی شامل تھی۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس منعقدہ ۶رجولائی ۱۹۴۶ء میں کابینہ مشن کی تجویز منظور کر لی گئی اور یہیں سے پنڈت جواہر لال نہرو کی تازہ صدارت کانگریس کا آغاز ہوا۔ اس میں شک نہیں ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۶ء تک کا وقفہ ہماری تاریخ آزادی میں بیحد اہم رہا ہے اور اس ساری مدت میں مولانا آزاد صدر کانگریس رہے اور جیسا کہ میں ابھی مختصراً بتا چکا ہوں اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان تمام اہم واقعات کی تشکیل میں جس کی آخری کڑی کابینہ مشن کی تجویزوں کی منظوری تھی مولانا آزاد کا کتنا زبردست حصہ رہا ہے۔

بہرحال مسلم لیگ نے اپنی ۲۷رجولائی ۱۹۴۶ء کی نشست میں کابینہ مشن کی تجویز مسترد کر دی اور ۱۶راگست کو "یومِ راست اقدام" کا اعلان کیا۔ حالات نے ثابت کر دیا کہ یہ "راست اقدام" کلکتہ میں ایک شدید خونریزی کی شکل میں نمودار ہوا۔ استرداد کا سبب لیگ والوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کے اس اخباری بیان کو بتایا جس میں انھوں نے اخباری نمائندوں سے یہ کہا تھا کہ آئین ساز اسمبلی میں کانگریس بالکل کھلے ذہن سے جائیگی۔ مسٹر جناح نے اس کا یہ مفہوم نکالا کہ کانگریس نے صدقِ دل سے

قومی کردار سے کسی شکل میں بھی دست بردار نہیں ہوسکتی لیکن وہ کارواں کا راستہ تو روک ہی سکتے تھے۔ اس کانفرنس میں بھی مولانا نے ایسی بیدار مغزی سے مذاکرات میں حصّہ لیا کہ مسلم لیگ کی بیجا ضد اور وطن دشمن ہٹ دنیا پر واضح ہو گئی۔

سن بیالیس کے اندولن اور بعد کے واقعات نے سارے ملک کی ذہنی ساخت بدل دی تھی۔ خوف و ہراس کی جگہ ایک نئے ارادے اور ہمت نے لے لی تھی۔ اس کا نمایاں ترین پہلو یہ تھا کہ پولیس اور فوج میں جذبۂ قومی از سر نو پھیل گیا۔ آزاد ہند فوج کے مقدمہ اور بحریہ کے جانبازوں کے مظاہرات نے یہ بات برطانیہ پر بالکل صاف کر دی تھی کہ اب ہندوستان کو آزاد کر دینے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا ہے اور چونکہ برطانیہ میں مزدور پارٹی برسر اقتدار آچکی تھی اس لئے وہاں کا حکمران طبقہ ماضی کو بھول جانے اور راز سر نو مسائل کے سُلجھانے کے حق میں تھا۔ یہی وہ جذبہ تھا جو بعد میں پارلیمانی وفد اور کابینہ مشن کی آمد کا باعث ہوا۔

معاملات کو سُلجھانے اور مذاکرات کو فائدہ بخش نتائج تک پہنچانے میں مولانا کو جو ید طولیٰ حاصل تھا۔ اُس کا مظاہرہ ایک بار اور ہوا۔ پنجاب میں مسلم لیگ اور وہاں کا گورنر دونوں کوشاں تھے کہ وہاں لیگ کی وزارت قائم ہو جائے لیکن خضر حیات خاں ٹوانہ اور کانگریس کے مابین مولانا نے مفاہمت کرا دی اور لیگ کی بجائے ٹوانہ اور کانگریس کے تعاون سے غیر لیگی وزارت قائم ہو گئی۔ اس کا سارے ملک نے اعتراف کیا کہ مولانا نے بڑی خوش اسلوبی سے یہ مفاہمت کرائی ہے۔ اسی دوراندیشی کا مظاہرہ آزاد نے کابینہ مشن سے مذاکرات کے وقت بھی کیا۔

مزدور حکومت معاملات کو نئے انداز سے جانچ رہی تھی۔ چنانچہ ۴۶ - ۱۹۴۵ء کے موسم سرما میں ایک پارلیمانی وفد حالات کا جائزہ لینے کے لئے ہندوستان آیا اور مولانا آزاد سے کانگریس کے رویہ اور ملک کے عام رجحانات وغیرہ پر گفتگو کی۔ وفد یہاں سے یہ تاثر لے کر گیا کہ حالات بدل چکے ہیں اور بھارت کو پابہ زنجیر رکھنا اب ناممکن ہے۔ پھر کابینہ مشن، جو سر اسٹیفورڈ کرپس، لارڈ پیتھک لارنس اور مسٹر اے، وی الگزانڈر پر مشتمل تھا، ۲۹ مارچ کو وارد ہندوستان ہوا۔ مذاکرات کافی دنوں تک

مشورے کرتے رہے۔ پھر قیل وقال کے بعد ۵؍ اکتوبر کو لیگ نے عارضی حکومت میں شمولیت کا فیصلہ کیا اور دس دن کے بعد اپنے نمائندوں کے ناموں کا اعلان کیا۔ جس میں جوگیندر ناتھ منڈل کا بھی نام شامل تھا۔ کانگریس کی مخالفت کے جوش میں لیگ یہ بھی بھول گئی کہ اپنی پیدائش سے اُس دن تک یہی چلاّتی آئی تھی کہ وہ مسلمانوں کی نمائندہ ہے اور ایک بار کانگریس تک سے یہ اعتراض کر چکی تھی کہ اُسے مسلم نمائندوں کے نامزد کرنے کا حق نہیں ہے۔ ع بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست۔

لیگ کے تبدیلِ فیصلہ کے بعد، ایک برائے نام مشترکہ عارضی حکومت وجود میں آئی۔ برائے نام اس لئے کہ لیگ یہاں صرف روڑے اٹکانے کے خیال سے آئی تھی۔ راجہ غضنفر علی نے تو صاف صاف کہا تھا کہ "ہم عارضی حکومت میں پاکستان کی لڑائی لڑنے جارہے ہیں"۔ جو محکموں کی تقسیم ہوئی اُس میں مالیات کا محکمہ لیگ ہی کو مل گیا۔ اس طرح لیاقت علی خاں کو، جو وزیر مالیات تھے، یہ موقع ملا کہ وہ اُن محکموں کی کارروائیوں میں روڑے اٹکائیں جن کے ممبر کانگریسی تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی اشتراک نہیں تھا بلکہ جان بوجھ کر اختلافات کے بہانے ڈھونڈنا تھا۔ مولانا آزاد کا بعد میں یہ خیال ہوگیا تھا کہ اگر مالیات کا صیغہ خود کانگریس اپنے پاس رکھتی تو یہ صورت حال پیدا نہ ہوتی۔ میرے خیال میں یہ معاملات کو بہت زیادہ آسان بنا کے پیش کرنا ہے۔ کوئی بھی اہم محکمہ لیگ کے پاس ہوتا تو اسی قسم کے اختلاف پیدا کرتے۔ یہ تو ایک کھُلی ہوئی حقیقت تھی ہی کہ کابینہ کے جلسوں کے پہلے لیگی ممبران لیاقت علی خاں کے ساتھ علیٰحدہ مشورے کیا کرتے تھے۔

لارڈ ویول چونکہ چاہتے تھے کہ کابینہ مشن پلان کامیابی سے چلے اور مولانا آزاد اور اُن کے ہمنوا جن کا خیال تھا کہ یہی پلان وحدت ہند کو باقی رکھ سکتا ہے، اب بھی اس کوشش میں تھے کہ لیگ اور کانگریس کے مابین جو خلیج بڑھتی جارہی تھی اُس کے دونوں کناروں کا فاصلہ کسی طرح کم کیا جائے۔ مسٹر اٹیلی، وزیر اعظم انگلستان بھی اس مسئلہ میں دلچسپی لے رہے تھے۔ چنانچہ انھوں نے نومبر کے آخر میں لارڈ ویول اور کانگریس اور لیگ کے نمائندوں کی ایک نشست لندن میں بلائی۔ کانگریس اور پنڈت جواہر لال نہرو شروع میں اس کے لئے تیار نہیں تھے۔ بالآخر لارڈ ویول نے ابوالکلام ہی کو وسیلہ بنایا

مشن کی تجویزوں کو منظور نہیں کیا ہو بلکہ وہ آئین ساز اسمبلی میں اپنی اکثریت سے اس تجویز کی بنیادی باتوں کو مسترد کر دے گی۔ مولانا کی کوششوں سے ورکنگ کمیٹی نے اس کے بعد ایک تجویز پاس کی جس میں یہ کہا گیا کہ کابینہ مشن کی تجویز کو کانگریس نے غیر مشروط طور پر مانا ہی۔ اُسے اُس کے بعض حصوں سے اختلاف ضرور تھا، لیکن اب جب اُس نے ایک تجویز ذمہ دارانہ طریقے پر مان لی تو وہ اُس پر قائم رہے گی۔ لیکن زندگی میں مسٹر جناح پہلی بار راست اقدام کی باتیں سوچنے لگے تھے، انھوں نے تجویز مسترد کر دی۔ "راست اقدام" کی جو شکل کلکتہ میں ہوئی یا نواکھالی اور بہار وغیرہ میں جو کچھ ہوا اُسکی ذمہ داری سے فرقہ پسندوں کا فرار ممکن نہیں ہی۔ بنگال میں اُس وقت سہروردی وزیر اعظم تھے لیکن فوج یا پولیس نے فسادات کے فرو کرنے میں کوئی حصہ نہیں لیا کیونکہ اُن کو احکام یہ تھے کہ "آمادہ رہو مگر اقدام نہ کرو"۔

بہر حال مسٹر جناح نے آخری وقت انکار اس لئے کیا تھا کہ اُن کے خیال میں برطانوی حکومت اُن کی روڑے اٹکانے والی پالیسیوں کی اس وقت بھی حسب دستور زبردست موافقت کرے گی۔ لیکن یہ خیال غلط فہمی پر مبنی تھا۔ بین الاقوامی اور ملکی حالات نے ایسی شکل اختیار کر لی تھی اور جنگ کے بعد کی دنیا ایسے راستوں پر چل رہی تھی کہ برطانیہ خود یہ چاہنے لگا تھا کہ ہندوستان کا آزاد تعاون اُسے جس قدر جلد مل سکے اچھا ہے۔ اس لئے اب کے لیگ کو شکریہ ادا کرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ اور چونکہ کانگریس نے کابینہ مشن کی تجویز کو کلیتہً مان لیا تھا، اس لئے وائسرائے نے ۱۲ اگست کو جواہر لال نہرو سے وزارت قائم کرنے کو کہا۔ جواہر لال نہرو نے اتمام حجت کے لئے مسٹر جناح کو دعوت دی کہ وہ حکومت کی تشکیل میں ہاتھ بٹائیں اور پھر دونوں کے مابین ایک ملاقات بھی ہوئی۔ لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آخر، پہلی عارضی حکومت کی تشکیل کی ذمہ داری تنہا کانگریس پر عائد ہوئی جس نے مولانا آزاد، سردار پٹیل اور ڈاکٹر راجندر پرشاد پر مشتمل ایک بورڈ بنا دیا تھا۔ اس بورڈ نے کابینہ کے ممبران کا انتخاب کیا۔ مسلم ممبروں میں آزاد خیالات رکھنے والوں کو لیا گیا۔ مولانا آزاد سے بھی شامل ہونے کو کہا گیا لیکن انھوں نے باہر ہی رہنا مناسب سمجھا۔

لارڈ ویول شکست ماننے والوں میں نہیں تھے۔ پھر "راست اقدام" کے بعد حالات نے جو صورت اختیار کر لی تھی اُس کو بھی پیش نظر رکھ کر انھوں نے مسٹر جناح سے گفتگو کا آغاز کیا اور مولانا آزاد سے بھی

نہ ہو سکا۔ تقسیم کیلئے بھی فضا ہموار ہو رہی تھی۔ لیگ کے ممبران حکومت کے اندر ایسا رویہ اختیار کئے ہوئے تھے کہ مشترکہ عمل ناممکن ہو رہا تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس صورت حال سے پورا فائدہ اُٹھایا۔ اور خود حالات نے کانگریسی ممبران کو بھی اس پر آمادہ کرنا شروع کیا کہ وہ تقسیم کو ایک ضروری شر "ان کر قبول کریں۔ چنانچہ سردار پٹیل اور پنڈت جواہر لال نہرو نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ اب تقسیم کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ گیا ہے۔ خود مولانا آزاد کی روایت کے مطابق انھوں نے کانگریس کے ان دونوں قائدین کو تقسیم کے خلاف ازسرِنو آمادہ کرنا چاہا لیکن یہ حضرات لیگ کو مستقل طور سے ہندوستان کے مستقبل کے راستہ کا روڑا بنائے رکھنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ اب مولانا نے باپو کی امداد چاہی۔ پہلے تو انھوں نے بھی تقسیم سے اختلاف کیا۔ لیکن بعد میں جب غالباً انھیں لیگ کے رویہ کا باقاعدہ علم ہوا اور انھوں نے دیکھا کہ یہ صورت حال جتنے ہی جلد ختم ہو اچھا ہے، تو مجبوراً وہ بھی تقسیم پر راضی ہو گئے۔ اس عرصے میں مولانا آزاد برابر اس بات کی کوشش میں تھے کہ کابینہ مشن پلان کو منظور کر لیا جائے اور وہ اس سلسلے میں کئی بار لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملے بھی۔ لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن پہلے ہی سے فیصلہ کر چکے تھے۔ اب سوال اُن کے سامنے صرف یہ رہ گیا تھا کہ ہندوستان کی تقسیم کس طرز پر ہو۔ اسی سلسلے میں پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا بھی سوال اُٹھا۔ اس پر بھی وائسرائے کا دماغ صاف تھا۔ وہ واضح تجویزیں بنا چکے تھے اور اب برطانوی حکومت سے منوانے کے لئے لندن جا رہے تھے لیکن وہ ایسا ظاہر کرتے تھے کہ گویا اُن کے پاس کوئی واضح نقشہ موجود نہیں ہے۔ اس لئے مولانا نے اُن سے اُن کی روانگی لندن کے پہلے ایک آخری ملاقات اس خیال سے کی کہ شاید وہ وائسرائے کو کابینہ مشن پلان کے لئے آمادہ کر سکیں لیکن حالات کا فیصلہ مولانا کے خوابوں اور آرزوؤں کے خلاف ہو چکا تھا۔ لندن سے تقسیم کا پلان منظور ہو گیا۔ ۳۰ رمئی کو وائسرائے لندن سے واپس آئے، ۲ رجون کو انھوں نے کانگریس اور لیگ کے نمائندوں سے بات کی اور ۳ رجون کو ایک قرطاس ابیض شائع کر دیا گیا جس میں نئی تجویزیں (یعنی ہندوستان اور صوبوں کی تقسیم کی تجویزیں) شامل تھیں۔ اُسی دن ورکنگ کمیٹی میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا اور پہلی مرتبہ سرحد کا

اور انھوں نے پنڈت جی کو رضا مند کیا۔ چنانچہ پنڈت جی، مسٹر جناح اور لارڈ ویول لندن گئے۔ وہاں علاقوں کی تقسیم میں آسام کو بنگال کے ساتھ شامل کئے جانے کے مسئلہ پر اختلاف ہوا۔ کانگریس کا کہنا تھا کہ آسام کو شروع سے علاقہ (ج) میں شامل ہونے یا نہ ہونے کا حق ہونا چاہیئے۔ مسٹر جناح کا کہنا یہ تھا کہ وہ علاقہ (ج) کا آئین بن جانے کے بعد ہی الگ ہو سکتا تھا۔ ۶ر دسمبر کو برطانوی کابینہ نے ایک اعلانیہ جاری کر کے لیگ کے نظریہ کی تائید کر دی، لیکن لیگ کی اس سے کب تشفی ہونے والی تھی۔ اختلافات جاری رہے اور لیگ نے آئین ساز اسمبلی کا مقاطعہ جاری رکھا۔ اس منزل تک پہنچنے کے بعد مولانا آزاد کو حکومت کا رکن بنانے کی کوششوں کی تجدید ہوئی اور بالآخر مہاتما گاندھی اور پنڈت جی کے اصرار پر مولانا نے ممبر برائے تعلیمات ہونا منظور کر لیا اور ۱۵ر جنوری ۱۹۴۷ء کو انھوں نے عہدہ کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

لیگ کی پوزیشن عجیب وغریب ہوگئی تھی۔ وہ حکومت کے اندر تھی مگر آئین ساز اسمبلی کے باہر۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا یہ صورت حال باقی رکھی جائے؟ اس پر مسٹر اٹیلی اور لارڈ ویول میں اختلاف رائے ہوگیا۔ اٹیلی کا یہ کہنا تھا کہ برطانیہ کو ہندوستان سے ہٹنے کی ایک تاریخ مقرر کر دینا چاہیئے۔ ویول کا کہنا تھا کہ فرقہ وارانہ مسئلے کو حل کئے بغیر انتقال طاقت نہ کرنا چاہیئے۔ اختلاف نے ایسی شکل اختیار کی کہ ویول کو مستعفی ہونا پڑا۔ ویول کی روانگی کے وقت آزاد نے ایک بیان جاری کیا جس میں ویول کی خدمات کو سراہا۔ یہ ایک کھلا ہوا راز ہے کہ اُن کا یہ اقدام اُن کے دوسرے ساتھیوں کو خوش نہیں معلوم ہوا۔

۲۴ر مارچ ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے وائسرائے کے عہدہ کا چارج لیا۔ وہ انتقال اختیارات کی آخری تاریخ ۳۰ر جون ۱۹۴۸ء کا فیصلہ بھی اپنے ساتھ لائے تھے۔ امکانات یہی ہیں کہ برطانیہ نے تقسیم کا بھی فیصلہ کر لیا تھا اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن لندن سے اس کے احکامات بھی لیکر وارد ہند ہوئے تھے۔ حق تو یہ ہے کہ خود کابینہ مشن کی تجویزوں میں تقسیم کے جراثیم موجود تھے لیکن ایک دھندلی سی امید کی کرن بھی نظر آرہی تھی کہ شاید ایک وفاقی وحدت پر سمجھوتہ ہوجائے۔ مگر ایسا

سے لئے وہ اپنے میں لچک پیدا کر لیتے تھے لیکن اصول کے معاملہ میں وہ قدم پیچھے ہٹانا کم جانتے تھے۔ اتنی ہی دور قدم ہٹا سکتے تھے جہاں تک اُن کا تخیُّل و تصوّر ان کا ساتھ دے۔ اس طرزِ عمل نے اُن میں لچک تو کم کر ہی دی تھی بعض اوقات داخلی عناصر سے کلیتہً کنارہ کش ہو کر وقت کے تقاضوں کے مطابق خارجی اسباب کا فیصلہ کرنے میں بھی جھجک ہوتی تھی۔ کم از کم وہ ذہنی طور پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ تقسیم کے مسئلہ میں یہی ہوا۔ لیکن یہ ماننا پڑیگا کہ تمام اختلافات کے بعد اور لچک کی کمی کے باوجود، وہ ضدّی نہیں تھے۔ تقسیم کو روکنے کے لئے اُنھوں نے ہر ممکن کوشش کی لیکن جب یہ دیکھ لیا کہ حالات کی رو بدل چکی ہو اور اب مڑتے ہوئے طوفانی دھارے کے رُخ کا موڑنا اُن کے بس سے بالکل ہی باہر ہو تو انھوں نے بادلِ ناخواستہ نئے حالات کے مقابلے کے لئے اپنے کو آمادہ اور تیار بھی کر لیا۔ ۱۴ر جون ۱۹۴۷ء کی کل ہند کانگریس کمیٹی میں اُن کی تقریر اس پر گواہ ہے کہ انھوں نے تقسیم کے رزولیوشن کی تائید بڑے ہی ذہنی کرب اور قلبی اذیت کے ساتھ کی، لیکن کی۔ انھوں نے تقسیم کو سانحہ بتایا اور قوم کی سیاسی ناکامی پر محمول کیا۔ لیکن اُن کو یہ بھی صاف نظر آرہا تھا — اور اُن سے زیادہ کس کو نظر آتا — کہ کانگریس نے اور خود انھوں نے اس تقسیم سے ملک کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کر لی تھی اور اب تقسیم ناگزیر تھی۔

یہ مولینا کے کردار کا ایک خاص پہلو ہے۔ مخالفتیں انھوں نے اکثر کیں۔ خود مہاتما گاندھی سے مخالفت ہوئی جیسا کہ انھوں نے اپنی ایک غیر مطبوعہ تقریر کے مسوّدے[۱۵] میں لکھا ہے :-

"غرضیکہ اس طویل مدت میں ز ۱۹۱۳ء سے ۱۹۴۷ء بہت سے موقعے آئے کہ ہم میں اور اُن میں اختلاف ہوا اور کشمکش تک نوبت پہنچی۔ انھوں نے اور ہم نے دونوں ہی نے اپنی اپنی جگہ اس کو محسوس بھی کیا لیکن اس پوری زندگی میں کوئی ایسا وقت نہیں آیا کہ ہمارے دلوں کا رُخ پھر گیا ہو۔ ایسے ایسے اختلاف کے باوجود اُن کی عظمت کی جو رسّی ہماری گردنوں میں پڑی ہوئی تھی ہم کبھی اُس سے باہر نہ ہو سکے۔"

---

۱۵ یہ مسودہ الجمعیۃ کے "آزاد نمبر" میں شائع ہو گیا ہے۔

سوال سامنے آیا جہاں مسلم اکثریت کے باوجود کانگریس کی حکومت تھی اور بالآخر یہ طے پایا کہ صوبہ سرحد میں استصواب کرالیا جائے۔ ۱۴ر جون کو کل ہند کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں تقسیم کی تجویز کثرت آراء سے پاس ہوگئی۔ اس کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تمام انتظامات مکمل کرنے میں بے انتہا عجلت دکھائی اور تین مہینہ کی قلیل مدت میں تقسیم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ساری تیاریاں کرکے ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان اور ۱۵ر اگست کو ہندوستان میں برطانوی اقتدار کا خاتمہ ہوا۔

اس طرح آزادی کا آغاز ہوا۔ وہ آزادی جس کی تعمیر و تشکیل میں مولینا کا زبردست حصہ رہا ہے، البتہ تقسیم کے وہ سب سے بڑے دشمن تھے۔ انور صابری نے تقسیم کے بارے میں مولنا کے وہ خیالات نقل کئے ہیں جو انھوں نے تقسیم کے قبل ظاہر کئے تھے:۔

> ”بٹوارہ قدرتی ہو یا غیر قدرتی اس بحث میں نہ پڑو۔ نیتِ فرنگ اس کے حق میں ہے۔ شاید وہ کامیاب ہوجائے۔ یہ فساد اُس بڑے فساد کا پیش خیمہ ہے جو موہومہ تقسیم کے بعد ہوگا۔ تم لوگ مٹ جاؤ مگر کوشش کرو کہ یہ حادثۂ خونیں اور اس کے اسباب تخلیق کامران و بامراد نہ ہوں۔ اسلام کے نزدیک یہ جغرافیائی حدود، دوائرِ رحمت کی وسعتوں کے خلاف ہیں .... انسانیت، محبت و اخوت کی محتاج ہے۔ یہی ایک طرزِ عمل نسلی تفریقوں کو انس و مواخات کے قالب میں ڈھال سکتا ہے۔“

مولینا کے خطرات صحیح ثابت ہوئے اور اسی باعث تقسیم کو روکنے کے لئے وہ آخر تک لڑتے رہے۔ اس مخالفت میں انھوں نے مسلمانوں میں اپنی ہر دلعزیزی کھودی اور خود اپنے ہمراہیوں اور ساتھیوں سے بھی وقتی انحراف مول لیا تھا۔ اُن کے لئے یہ ان کا اصول اوّلین بن گیا تھا کہ ہندوستان کے اتحاد کو ہر قیمت پر باقی رکھا جائے وہ اس کے لئے یہاں تک آمادہ ہوگئے تھے کہ اگر اس سے آزادی کی تاریخ کچھ دنوں کے لئے ٹل بھی جائے تو مضائقہ نہیں ہے۔ جذباتی اعتبار سے منطق ان کے حق میں تھی، لیکن واقعات کی منطق ان کے مخالف تھی۔ وہ اپنی گوشہ نشینی، کم آمیزی، خوش اعتقادی، صفائے ضمیر، عزم مصمم اور یقین کامل کی بناپر کبھی اپنی رائے پر سختی سے اڑ بھی جاتے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ معاملتوں اور مفاہمتوں

بھی محسوس کر رہے تھے۔ اس وقت انتقال اختیارات میں اس بات کو بھی بڑا دخل تھا کہ مزدور پارٹی برطانیہ میں برسرِ اقتدار تھی۔ اگر مولانا کی رائے کے مطابق کابینہ مشن پلان کے پیچھے اس بات کا انتظار کیا جاتا کہ وقت گزرنے کے بعد لیگ کے رویہ میں تبدیلی ہو جائے گی تو اس کا بھی امکان تھا جیسا کہ فی الحقیقت ہوا بھی کہ مزدور پارٹی کی بجائے رجعت پسند پارٹی دوبارہ حکومت پر قابض ہو جائے اور حالات بدل جائیں۔ عارضی حکومت میں لیگ نے اپنے رویہ سے یہ ظاہر بھی کر دیا کہ تعاون کے لئے وہ بالکل ہی تیار نہیں ہے۔ پھر آخر کس امید پر موجودہ موقع کو ہاتھ سے جانے دیا جاتا۔ یہ ضرور ہے کہ تقسیم کو تسلیم کر لینے کے لئے کانگریس کو بہت سے عزیز جذبات کی قربانی کرنی پڑی، لیکن یہ قربانی ناگزیر تھی۔ آخر اسی ناگزیری کی بنا پر ہی تو مولانا نے بھی تقسیم اور اس کے تمام نتائج کو عملی طور پر تسلیم کیا۔

تقسیم کے پہلے فرقہ وارانہ جذبات بے حد برانگیختہ ہو چکے تھے اور پاکستانی بنگال، بہار اور پنجاب وغیرہ میں فسادات کی ابتدا ہو گئی تھی۔ تقسیم نے اس آگ پر گھی اور تیل کا کام کیا۔ شعلے اور بھڑکے اور بھڑکے، یہاں تک کہ تقریباً تمام شمالی ہندوستان اور وسطی ہندوستان اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ بربریت کا ننگا ناچ ہوا۔ انسان حیوان بن گئے تھے بلکہ حیوانوں سے بھی بدتر تھے۔ اور افسوس یہ ہے کہ یہ سب مذہب کے نام پر ہو رہا تھا، گویا قتل و غارت، بے حیائی اور ناموس ریزی کا بھی کوئی مذہب ہو۔ نتیجہ میں مغربی پاکستان تو غیر مسلموں سے تقریباً خالی ہو گیا۔ لیکن ہندوستان کے مسلمان اور مشرقی پاکستان کے ہندو اتنی کثیر تعداد میں تھے اور سارے علاقے پر اس طرح پھیلے ہوئے تھے کہ ان کو ناگزیر طور پر بڑی تعداد میں انھیں علاقوں میں رہنا تھا۔ مولانا نے اس موقع پر بھی سنجیدہ رویہ اختیار کیا جیسا کہ اُن کا خاصہ تھا۔ وہ یہ کہہ سکتے تھے کہ "دیکھا نہ، میں کہتا تھا کہ تقسیم کا یہ نتیجہ ہوگا۔ اب میں کیا کروں؟ جاؤ اور اپنے اعمال کی سزا بھگتو۔" انھوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ وہ انھیں مسلمانوں کے بے حد ہمدرد بن گئے جنھوں نے مولانا کی ذاتی تذلیل میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا تھا۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ میں مسلمانوں کی ایک کل جماعتی کانفرنس ہوئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو آئندہ پیش آنے والے واقعات کو غیر جذباتی طور پر سمجھنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ اس موقع پر مولانا ہی کا مقولہ قابلِ نقل ہے:۔

اسی طرح سردار پٹیل، پنڈت جواہر لال نہرو، پرشوتم داس ٹنڈن، مولنا محمد علی، حکیم اجمل خاں ڈاکٹر کھرے، مولنا عبدالباری، مولنا ظفر علی خاں سے بھی اختلافات ہوئے۔ یہ سب رفیق کار تھے۔ رفقائے کار میں اختلاف رائے کا ہونا ناممکنات سے نہیں ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ ہر بار سردار پٹیل کی رائے غلط اور مولنا کی صحیح ہی رہتی ہو۔ عملی دنیا میں ہی نہیں بلکہ علمی دنیا میں بھی اختلافات ہوتے ہیں۔ جو بات اہم ہے وہ اختلافات کی نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ اختلافات رائے کے باوجود، راہ عمل میں لوگ ساتھ رہتے ہیں یا نہیں۔ جن لوگوں سے بنیادی اختلافات تھے، جیسے مولنا محمد علی، مولنا ظفر علی، ڈاکٹر کھرے وغیرہ، ان کا ساتھ ہی نہ رہ سکا لیکن فروعات میں اختلاف، اتحاد مقصد کے منافی نہیں ہے اسی لئے سردار پٹیل اور پنڈت نہرو سے فروعی اختلافات کے باوجود تمام اہم مسائل میں اتفاق رائے رہا اور ساتھ مل کر کام کرتے رہے۔ تقسیم کے مسئلے کو لے لیجئے۔ اختلاف تھا اور شدید اختلاف لیکن مولنا نے اتحاد و تعاون کا راستہ ترک تو نہیں کیا۔ یہی اصل چیز ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ بعض اوقات یہ اختلافات انفرادی رجحانات کی وجہ سے بھی نمودار ہو جاتے تھے۔ ان میں ذاتی پسند و ناپسندیدگی کو بھی دخل ہوتا تھا۔ کبھی نقطہ ہائے نظر میں فرق اس لئے بھی نمایاں ہوتا کہ کوئی یہ سمجھتا کہ اشخاص کو راضی کر لینے سے تحریک کا رخ بدل سکتا ہے، لیکن اس کی نظر اس بات پر نہیں رہتی تھی کہ اب تحریک عوامی قبول کی اس منزل پر پہنچ چکی ہے جہاں افراد کی رضامندی و نارضامندی سے زیادہ اثر نہیں پڑ سکتا۔ بعض اوقات اس شک میں خود مولنا بھی مبتلا ہو جاتے تھے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اپنی کم آمیزی کے باعث عوامی تحریکات کی دور رسی کا صحیح اندازہ فوراً کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ اس کی تلافی اُن کی بے پناہ ذہانت اور کانگریس کے عوامی کردار سے ہو جاتی ہے لیکن بعض اوقات اس اندازہ میں وقت بھی لگتا تھا۔ بہرحال ان اختلافات کو رائی کا پہاڑ بنانا مناسب نہیں ہے۔ خود مولنا نے انھیں غیر معمولی اہمیت کبھی نہیں دی بلکہ وہ اصل نتائج پر نظر رکھتے تھے اور "گذشتہ را صلواۃ" کے مقولے پر عمل کرتے تھے۔

اب اسی تقسیم کے مسئلہ کو لے لیجئے۔ یقیناً مولنا شدت سے اس کے اثرات بد کو محسوس کرتے تھے اور مخالفت کرتے تھے۔ دوسرے بھی اس احساس میں شریک تھے لیکن وہ غلامی کے طویل اثرات بد کو

ہوں اُس کے پیش کرنے میں میں نے کوئی کمی نہیں کی۔ میں کسی کے دل کو تو بدل نہیں سکتا اور کسی کے سر میں نیا دماغ تو رکھ نہیں سکتا۔ میں جو کچھ کر سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ جس چیز کو میں صحیح سمجھتا ہوں اُن کے سامنے رکھ دوں..... جہاں تک فرقہ پرستی کا تعلق ہے یہ ایک دروازے سے نہیں آئی بلکہ کئی دروازوں سے آئی ہے تو اب یہ سب دروازے بند ہونے چاہئیں۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان جس کی آزادی کا ہم ستر برس سے خواب دیکھ رہے تھے برباد نہ ہو اور بربادی کے کسی نئے دروازے میں نہ گھس جائے تو ہمارا فرض یہ ہو جاتا ہے کہ جس دروازہ سے یہ فرقہ پرستی آئی ہے اُسی دروازے کو بند کر دیں اور اُسے ختم کر دیں"۔

چنانچہ مولانا کی تشخیص کے مطابق کانفرنس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ مسلمانوں کو کسی علیحدہ سیاسی تنظیم کی ضرورت نہیں ہے اور وہ مسلم لیگ جس کے خلاف مولانا نے زندگی بھر جہاد کیا تھا، مُردہ ہو کر رہ گئی۔ اس کے دیکھنے کے لئے ملک کو بڑی قربانی دینی پڑی لیکن انجام بخیر ہوا۔ اگرچہ جنوبی ہند میں لیگ کی ایک شاخ اب بھی باقی ہے مگر اسکی نوعیت بالکل ہی بدل چکی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بعض ذہنوں میں شکوک اب بھی باقی تھے۔ پُرانے قسم کے لیگی سمجھتے تھے کہ اُن کے خوابوں کا پاکستان ان کی حالت سدھارے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ اَن ہونی بات تھی اور بہت جلد ان کو معلوم ہو گیا کہ "خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم"۔ لیکن اُن کی اس ذہنی کیفیت کے باعث ملک میں ایک ایسا طبقہ بھی اُبھرا جسے مسلمانوں کی وفاداری پر شک ہونے لگا۔ یہ حالات کا فطری نتیجہ تھا۔ اس وقت سابق مسلم لیگی بیحد سراسیمہ و پریشان ہوئے اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اپنی وفاداری کا کس طرح ثبوت دیں۔ انھوں نے اپنی اس سراسیمگی کا اثر عام مسلمانوں میں بھی پھیلانا چاہا۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اگست ۱۹۴۸ء کے یوم آزادی کے موقع پر مولانا نے دلّی کے اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ

"میرے پاس مسلمانوں کے خطوط آتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ اگرچہ ہم حکومت ہند کے

"آپ لوگ مجبور ہیں لیکن میری راہ میرے لئے چھوڑ دیجئے اور جہاں جارہا ہوں جانے دیجئے۔ آج نہیں کل بتاؤں گا کہ حقیقت کیا ہے؟ خدا کا ہاتھ سب سے بہتر فیصلہ کرنیوالا ہے اور مستقبل سے بڑھ کر کوئی جج نہیں ہے۔ عنقریب کھل جائے گا کہ میں کس راہ پر تھا اور آپ کہاں جارہے تھے اور وہ مقلب القلوب اپنے بندوں کے دلوں کو میرے لئے کھولتا ہے یا آپ کے لئے؟ البتہ جن دلوں کو خدا اپنے نور ہدایت کے لئے چُن لیتا ہے اُن میں اور تم میں یہی فرق ہے کہ وہ آج جس چیز کو دیکھتے ہیں تم کل دیکھو گے۔ اس معاملہ میں دیکھو! جلسے میں صرف میں ہی ایک مجرم تھا جس نے مخالفت کی اور سب خاموش رہے یا سرشاریِ نفاق سے جھومتے رہے۔ لیکن آج سیکڑوں ہیں جو سر پیٹ رہے ہیں۔ پھر یہ کیا ہے؟ کیا یہ ایک الٰہی نشانی نہیں ہے جو حقیقت کے چہرے کو بے نقاب کررہی ہے اور بتلا رہی ہے کہ کس کی زبان اللہ کے ہاتھ میں ہے جو اُس سے کہلواتا ہے اور کس کے دل نفس کے قبضے میں ہیں جو انھیں ہلنے نہیں دیتا۔ پھر کیا کوئی آنکھ ہے جو دیکھے، کوئی کان ہے جو سُنے اور کوئی دماغ ہے جو سوچے!"

لیکن مولانا نے گمراہوں کو جو اُس وقت اپنی ناکامی اور مایوسی کے احساس سے زخمی ہورہے تھے، نفرت بھرے انداز میں ٹھوکریں نہیں لگائیں۔ یقیناً وہ بہت سے سانحات وحادثات جو تقسیم کے بعد پیش آئے اسکی ذمہ داری فرقہ وارانہ سیاست، بالخصوص لیگی سیاست پر تھی اور لکھنؤ میں جو اجتماع ہوا تھا اُس میں اس کا پورا موقع تھا کہ مولانا طعن وتشنیع کے نشتر تیز کرتے لیکن یہ موقع اصلاح حال کا تھا اور پُرانے زخموں کو اُدھیڑنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا۔ اس لئے مولانا نے ہمدردانہ تلقین کی اور بھٹکے ہوئے لوگوں کو صحیح راستہ دکھایا اپنے خطبہ میں آپ نے کہا کہ

"جو حل میں آپ کو بتاسکتا ہوں وہ میرے لئے بہت پُرانا حل ہے جو ۳۹۔ ۴۰ برس پہلے میں آپ سب کے سامنے رکھ چکا ہوں ..... جو مشورہ میں دے سکتا

کانگریس کے ادارہ میں پنجاب، سندھ و سرحد کے علاقے کے مسائل کی مدتوں سے دیکھ بھال کرتے آئے تھے اس لئے سب سے زیادہ وہ اس علاقہ کے سانحات سے متاثر ہوئے۔ اُن کے یہاں ہمیشہ اس علاقے کی کانگریس کے ارباب حل وعقد کا جم غفیر رہتا تھا۔ بحالی کے کام میں انھوں نے ہمیشہ گہری دلچسپی لی اور حکومت کے اندر اور باہر اس کے لئے برابر کوشاں رہے کہ پنجاب و سندھ وغیرہ کے لوگوں کو پھر سے بسانے کا کام جلد از جلد انجام پا جائے۔ یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ فسادات دلّی کے بعد جب گاندھی جی نے اپنا آخری برت رکھا تو برت توڑنے کی شرطوں میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ جو لوگ ہجرت کر کے چلے گئے ہیں وہ پھر سے لاکر بسائے جائیں لیکن مولینا نے اس سے اختلاف کیا اور کہا کہ جو لوگ ایک بار بے گھر ہو کر دربدر کی زندگی کے شدائد برداشت کر چکے ہیں اور اب کسی طرح انھیں سر ٹکانے کی جگہ مل پائی ہے تو انھیں پھر سے اُجاڑنا اور اس جگہ بھیجنا جہاں یہ بھی پتہ نہیں کہ اُن کے ساتھ کیا سلوک ہوگا نہ مناسب ہے اور نہ قابل عمل ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح انھوں نے پنجاب وغیرہ کے مہاجرین کے بارے میں گاندھی جی سے سفارش کر کے ان کی بحالی کے کام کو آگے بڑھایا۔ بہت سے ادیب اور شاعر جو پنجاب وغیرہ سے یہاں چلے آئے تھے اُن کی بحالی میں بھی مولینا نے بڑا حصہ لیا۔ لیکن مولینا یہ محسوس کر رہے تھے کہ ہجرت کے سلسلے کو جلد از جلد ختم ہو جانا چاہیئے کیونکہ اس کے باقی رہنے سے ایک انتشاری اور غیر یقینی کیفیت بھی باقی رہے گی۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے ۱۹۴۸ء میں انھوں نے مسلمانوں کے ایک عظیم الشان اجتماع کے سامنے دلّی میں ایک یادگار تقریر کی۔ انھوں نے کہا:۔

"....... تمھیں یاد ہے! میں نے تمھیں پکارا، تم نے میری زبان کاٹ لی میں نے قلم اُٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر لئے، میں نے چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں کاٹ دیئے۔ میں نے کروٹ لینی چاہی اور تم نے میری کمر توڑ دی، حتّیٰ کہ پچھلے سات برس کی تلخ نوا سیاست جو تمھیں آج داغ جدائی دے گئی ہے اس کے عہد شباب میں بھی میں نے تمھیں خطرے کی شاہراہ پر جھنجھوڑا، لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف اعراض کیا بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کر دیں۔

وفادار ہیں اور بار بار اپنے تعاون کا یقین دلاتے ہیں پھر بھی ہم پر شک کیا جاتا ہے۔

"میرا جواب صرف ایک ہے۔ تم ایک منٹ کے لئے اس سوچ میں مت پڑو کہ دوسرا تمھارے متعلق کیا خیال رکھتا ہے، بلکہ اپنے دلوں کو ٹٹولو۔ اگر دل میں کوئی کھوٹ نہیں ہو تو تمھیں کسی کے کہنے کی پروا نہ کرنی چاہیئے۔ اپنے معاملہ کو صاف رکھو۔ بار بار صفائی پیش کر کے اپنی وفاداری کی قیمت نہ گھٹاؤ۔"

عام مسلمانوں اور ہندوؤں پر تقسیم کے بعد بڑا ہی کڑا وقت پڑا تھا۔ نوزائیدہ پاکستان میں ہندو اور سکھ اور ہندوستان کے بعض علاقوں کے مسلمان قیامت انگیز واقعات سے گھبرا کر بڑی تعداد میں ترک وطن کرنے لگے تھے۔ مسلمانان دلی کا بھی یہی عالم تھا۔ بقول حافظ محمد ابراہیم اس وقت سے پہلے مولینا نے ان خطرات کو محسوس کر لیا تھا:۔

"اُن (مولنا) کی نظریں نتائج تقسیم کے جگر خراش نقشے دیکھ رہی تھیں اور مستقبل میں بلند ہونے والی کروروں ماتم و فریاد کی صداؤں کو وہ یوں محسوس کر رہے تھے جیسے آج ہی ان کا سکوت ٹوٹتا ہے۔

"تنہا مسلمانوں کی بربادی و تباہی کا تصوّر انھیں بےچین نہیں کر رہا تھا بلکہ وہ ضرب تقسیم میں آنے والی پوری آبادی کے اُجڑنے کا یقین دل میں لئے مجسم اضطراب بن رہے تھے۔ یوں تو اُن کی زندگی کا سینہ ہزاروں بار آلام و غم کا گھوارہ بنا، لیکن پلکیں دل کی ترجمانی کا شرف حاصل نہ کر سکیں لیکن ۱۹۴۷ء میں پیش آنیوالے حوادث عبرت نما کے دور اندیشانہ احساس سے کبھی کبھی خون دل کا گوہر شفاف آنکھوں تک آ ہی جاتا تھا۔

"یہ ایسا صدمہ تھا جو اندر ہی اندر انھیں گھلاتا رہا اور عزم و ارادہ کے بل پر چلنے والی جسمانی مشین بھی اُسے برداشت کرتے کرتے تھک گئی۔"

لیکن ایسا نہیں تھا کہ غم کے اس شدید احساس نے اُن کی رگ عمل میں خون کی روانی کم کردی ہو۔ وہ

ہیں یا نہیں ؟ ہراس کا موسم عارضی ہے ۔۔۔۔۔

" یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے اس پر غور کرو ۔۔۔۔۔۔ آخر کہاں جا رہے ہو، کیوں جا رہے ہو ؟ یہ دیکھو مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے جمنا کے کنارے تمھارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم ہو کہ تمھیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے ۔۔۔۔ عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تمھارا جوش و خروش بیجا تھا اُسی طرح آج یہ تمھارا خوف و ہراس بھی بیجا ہے ۔ مسلمان اور بزدلی، مسلمان اور اشتعال، ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے ۔ سچے مسلمان کو نہ کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے ۔۔۔۔۔۔۔ ہوائیں آتی ہیں اور گزر جاتی ہیں ۔ یہ صرصر سہی لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں، ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلا کا موسم گزرنے والا ہے ۔ یوں بدل جاؤ جیسے تم پہلے کبھی اس حالت میں نہ تھے ۔

" عزیزو ۔ تبدیلیوں کے ساتھ چلو ۔ یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لئے تیار نہ تھے بلکہ اب تیار ہو جاؤ ۔ ستارے ٹوٹ گئے لیکن سورج تو چمک رہا ہے، اُس سے کرنیں مانگ لو اور اُن اندھیری راہوں میں بچھا دو جہاں اُجالے کی سخت ضرورت ہے ۔

" میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسہ سے وفاداری کا سرٹیفکٹ حاصل کرو اور کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمھارا شعار رہا ہے ۔ میں کہتا ہوں جو اُجلے نقش و نگار تمھیں اس ہندستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آ رہے ہیں وہ تمھارا ہی قافلہ تھا ۔ انھیں بھلاؤ نہیں، انھیں چھوڑو نہیں، اُن کے وارث بن کر رہو اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لئے تیار نہیں

---

(۱) مسلمانوں کے جس اجتماع میں یہ تقریر ہوئی وہ جامع مسجد دہلی میں منعقد ہوا تھا

"سچ پوچھو تو میں اب ایک جمود ہوں، ایک دورافتادہ صدا، جس نے وطن میں بھی رہ کر غریب الوطنی کی زندگی گزاری ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو مقام میں نے پہلے دن اپنے لئے چن لیا تھا وہاں میرے بال و پر کاٹ لئے گئے ہیں، یا میرے آشیانے کے لئے جگہ نہیں رہی بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے امن کو تمھاری دست درازیوں سے گلہ ہے، میرا احساس زخمی ہے اور میرے دل کو صدمہ ہے۔ سوچو تو سہی تم نے کون سی راہ اختیار کی ؟ کہاں پہنچے اور کہاں کھڑے ہو؟ .... میں نے تم سے کہا تھا کہ دو قومی نظریہ حیات معنوی کیلئے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے، اس کو چھوڑ دو۔ یہ ستون جن پر تم نے بھروسہ کیا ہے نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں لیکن تم نے سنی ان سنی کر دی....... انگریز کی بساط تمھاری خواہش کے برخلاف الٹ دی گئی اور راہنمائی کے وہ بت جو تم نے وضع کئے تھے وہ بھی دغا دے گئے......... میں تمھارے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا اور تمھارے اضطراب میں مزید اضافہ میری خواہش نہیں لیکن اگر کچھ دور ماضی کی طرف پلٹ جاؤ تو تمھارے لئے بہت سی گرہیں کھل سکتی ہیں.........

"یہ ٹھیک ہے وقت نے تمھاری خواہشوں کے مطابق انگڑائی نہیں لی بلکہ اس نے ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی اور یہی وہ انقلاب ہے جس کی ایک کروٹ نے تمھیں بہت حد تک خوفزدہ کر دیا ہے...... پچھلے سات برس کی روداد دہرانے سے کوئی خاص فائدہ نہیں اور نہ اس سے اچھا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ البتہ ہندوستان کے مسلمانوں پر جو ریلا آیا ہے وہ یقیناً مسلم لیگ کی غلط قیادت کی فاش غلطیوں کا ہی نتیجہ ہے...... اب ہندوستان کی سیاست کا رخ بدل چکا ہے۔ مسلم لیگ کے لئے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اب یہ ہمارے اپنے دماغوں پر منحصر ہے کہ ہم کسی اچھے انداز فکر میں بھی سوچ سکتے

پورا کر سکے ۔ اسی کے ساتھ انھوں نے علوم و فنون کی ترقی کے لئے بھی کوششیں کیں ۔ للت کلا اکادمی سنگیت اکادمی اور ساہتیہ اکادمی کا قیام اس کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ وہ آزاد ہندوستان میں ادب و ثقافت کی نشاۃ ثانیہ کو کس قدر اہم سمجھتے تھے ۔ غیر ملکوں میں طلباء کا بھیجنا اور وہاں کے طلباء کا ہندوستان آنا، یہ اُس نئی ثقافتی تحریک ہی کے مظاہر تھے جس کی بناء مولانا نے ڈالی تھی ۔

مولانا کی ایک اور خواہش تھی کہ مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید سے ہندوستان کے تعلقات دوستانہ اور برادرانہ قائم ہوں اور استوار بنیادوں پر قائم ہوں۔ اس سلسلے میں مشرق وسطیٰ کے بعض ملکوں میں مولانا سفارت کے سلسلے میں تشریف بھی لے گئے اور خاطر خواہ نتائج پیدا ہوئے ۔ تمام اسلامی ممالک میں آپ کو عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا اور آپ کی زندگی سے وہاں کی سیاست سبق لیتی تھی۔ شروع ہی سے مولانا کا خیال تھا کہ عالم اسلامی کی غلامی اور زیردستی کا خاتمہ اُسی وقت ہوگا جب ہندوستان آزاد ہو جائےگا اور مولانا یہ دیکھنے کو زندہ رہے کہ ہندوستان کی آزادی نے کس طرح اسلامی ممالک کی آزادی کے لئے بھی راستہ کھول دیا۔ چنانچہ مولانا کی وفات پر تمام عالم اسلامی کے قائدین نے یک زبان ہو کر خراج عقیدت پیش کیا۔

الحق یعلوا ولا یعلیٰ ۔ خود پاکستان (جس کے ابتدائی ہوا خواہوں اور بانیوں نے مولانا کے حق میں دشنام طرازی ہی اپنا دستور و معمول بنا لیا تھا) اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہوا کہ مولانا کی ذات فقید المثال تھی ۔ پٹھان لاہور، نے اُن کی موت پر لکھا کہ

> "ان کی موت ایک عظیم انسان ہی کی موت نہیں، ایک فقید المثال ادارہ کی موت ہے ۔ ایشیا کا سب سے بڑا مسلمان ہمیشہ کی نیند سو گیا ۔ ایک قافلہ جو نصف صدی سے بے راہ تھا مسافروں کو گم شدہ منزلوں کا پتہ دیتے ہوئے تاریخ کی شاہراہ پر چل رہا تھا ایکا ایکی موت کی وادیوں میں داخل ہو گیا"۔

امروز کراچی نے لکھا کہ :۔

> "مولانا آزاد کا اُٹھ جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے ۔ یہ ایک سانحۂ عظیم ہے۔

تو پھر تمھیں کوئی طاقت نہیں بھگا سکتی ۔ آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے ہم اسکے لئے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔"

مولینا نے اپنی اس تقریر کے ذریعے، زخموں پر نمک پاشی کئے بغیر، کیسے اشاروں اور کنایوں میں تمام سیاسیات کا عطر نچوڑ کے رکھ دیا اور کس طرح اُن کو یہ بتایا کہ فرقہ واریت ہی کا راستہ سیدھا اور سچا ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ اس نظریہ کو کوئی خوف یا لالچ سے اپنائے بلکہ وہ اس پر بار بار زور دے رہے تھے کہ عقل کا یہی راستہ ہے اور تاریخ اسی کو درست مانتی اور سمجھتی ہے۔ مولینا واقف تھے کہ اکثر لوگوں کے دلوں میں دو قومی نظریہ گھر کر گیا ہے۔ وہ خوفزدہ وفاداری سے نقصان ہی پہنچائیں گے فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ کیونکہ چودھری خلیق الزماں کی طرح کے لیڈر حلف وفاداری لینے کے بعد بھی، پاکستان بھاگ گئے تھے۔ اور بھی چوٹی کے لیڈر تھے جن کی جائے جگہ منطقی طور پر ہندوستان میں ہونی چاہئے تھی جیسے ظہیر الحسن لاری، لیاقت علی خاں، رضوان اللہ، چندریگر، راجہ محمود آباد، حسین امام۔ وہ سب یہاں کے مسلمانوں کو اُن کے حال پر چھوڑ کر جا چکے تھے اور وہاں سے وقتاً فوقتاً ہمدردی کے بیانات جاری کر کے اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ عہدہ برآ ہونا تو خیر ناممکن تھا، لیکن ان سے یہاں کے مسلمانوں کی وفاداری کے راستہ میں رکاوٹ پیدا ہونے کا احتمال ضرور بن جاتا تھا۔ مولینا اس قسم کی مشکوک وفاداری سے مطمئن نہیں ہو سکتے تھے۔ اسی لئے انھوں نے کھُل کر اعلان کیا کہ اگر مسلمانوں کے دلوں میں سچائی ہے تو انھیں اس ملک کو اپنا ملک سمجھ کے اسکی تعمیر میں حصہ لینا ہوگا اور یہی ایک راہ تھی، جو ٹھیک اور درست تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ آزادی کے حصول کے بعد تعمیری پروگرام کی سب سے زیادہ اہمیت تھی اور مولینا جس حکومت کے رکن تھے، وہ ایک عظیم الشان تعمیری منصوبے کے ماتحت کام کر رہی تھی۔ اس دور میں شور و شغب کی ضرورت نہیں تھی۔ تقریر و تحریر کی زلزلہ خیزیوں کی حاجت نہیں تھی بلکہ خاموش اور سنجیدہ تفکر اور بے لوث عمل کی ضرورت تھی۔ اسی لئے خود مولینا نے ایسی ہی تعمیری خاموشی اور عمل کو اپنایا۔ وزارت تعلیم میں انھوں نے اپنے سامنے دو باتوں کو پیش نظر رکھا۔ ایک یہ کہ تعلیم عام ہو اور دوسرے ایسی ہو جو آزاد ملک کی ضرورتوں کو

مولانا کو خود بھی اپنے اس مقام بلند کا پورا پورا احساس شروع ہی سے تھا چنانچہ اُنھوں نے "الہلال" میں تحریر فرما دیا تھا:-

"یاد رکھئے کہ دنیا میں صرف سچائی اور خلوص ہی میں زندگی ہے۔ خلوص کبھی ضائع نہیں جاتا اور سچائی کبھی نہیں مرتی۔ اگر میرے دل میں سچائی کا ایک ذرہ بھی موجود ہے تو میں ایک ایسی طاقت، ایک ایسی زندگی، ایک ایسی غیر فانی ہستی ہوں جو کبھی مٹ نہیں سکتی۔"

شاعر نے بھی یہی بات کہی تھی ؎

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اس لئے نہیں کہ دنیائے علم و کمال اُجڑ گئی، اس لئے نہیں کہ ملت اسلامیہ کا ایک عظیم فرزند اس سے چھن گیا، اس لئے نہیں کہ ایک جید ادیب و صحافی رخصت ہو گیا بلکہ اس لئے کہ ایک ایسا دانائے راز ہم سے جدا ہوا ہے جو کہیں صدیوں میں پیدا ہوتا ہے .... ہماری سیاسی تاریخ میں مولینا کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سیاست کو جذباتیت کا شکار نہیں ہونے دیا بلکہ اسکو سنجیدگی اور متانت سے روشناس کرایا .... ایثار و قربانی، تدبر و تحمل اور عقیدے کی مضبوطی کا جو معیار انھوں نے قائم کیا وہ رہتی دنیا تک مشعل ہدایت رہے گا۔"

روزنامہ جنگ کراچی نے کہا کہ

"غیر ملکی حکمرانوں کے عظیم سیاسی و نظریاتی دباؤ کو دور کرنے میں مولینا آزاد نے جو تاریخی کردار انجام دیا ہے اُس کی مثال دوسرے چند ہی افراد سیاسی میں مل سکتی ہے"۔

روزنامہ تسنیم لاہور نے اعتراف کیا کہ

"مسلمانوں کی بیداری میں انھوں نے جو حصہ لیا ہے اُس میں کوئی مسلمان رہنما بھی اُن کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ انھوں نے اُس وقت یہاں دعوت حق کا نعرہ بلند کیا جب کہ مسلمان رہنماؤں کا ایک طبقہ انگریزوں کی اطاعت کو قرآن و سنت سے ثابت کرتا تھا اور غلامی پر قناعت کرنے کو فلاح دارین کا ذریعہ گردانتا تھا .... مولینا نے مسلمانوں کو بتایا کہ مسلمان غلام رہ کر زندہ رہنے کے لئے پیدا نہیں ہوا ہے۔ غلامی اور اسلام دو متضاد چیزیں ہیں اور انگریزوں سے نجات حاصل کرنا اُن کا محض قومی فریضہ ہی نہیں بلکہ دینی فریضہ بھی ہے۔"

مولانا نے نمایاں حصہ نہ لیا ہو۔

ان کا راستہ دشوار راستہ تھا۔ انھیں پھولوں پر سے نہیں بلکہ کانٹوں سے ہو کر گزرنا پڑا، قید و بند کی مصیبتیں سہنی پڑیں اور سب سے بڑھ کر اپنے ہی ابنائے وطن اور ارباب ملت کے سب و شتم کا شکار ہونا پڑا لیکن اس کوہ استقامت میں جنبش نہیں ہوئی اور مولینا نے اپنے لیے جو راہ عمل ۱۹۱۲ء میں طے کر لی تھی اس پر وہ آخر دم تک قائم رہے۔ ایسے لوگ روز روز کہاں ہوتے ہیں ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

حضرات! آج یہ عظیم الشان ہستی ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکی ہے لیکن اسکی زندگی کے کارنامے آج بھی ہمارے لیے مشعل ہدایت ہیں۔ کاش ہم کو یہ توفیق عطا ہو کہ ان کے بتائے ہوئے راستوں پر پامردی سے چل سکیں۔ اس سیمنار کا انعقاد اسی خیال سے کیا گیا تھا کہ ہم ان کے پیغام کو موجودہ نسل تک پوری وضاحت سے پہنچا سکیں۔ مجھے خوشی ہے کہ جو علماء اور فضلاء وقت کی تنگی کے باوجود ہماری دعوت پر یہاں آکر سیمنار میں شریک ہوئے انھوں نے اپنے خطبوں اور مقالوں سے مولینا کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا۔ میری یہ خواہش ہو گی کہ یہ مقالے ایک کتابی صورت میں بھی جمع کیے جائیں تاکہ وہ لوگ بھی جو اس سیمنار میں شریک نہیں ہو سکے ہیں اس سے استفادہ حاصل کریں۔

کارکنان سیمنار نے یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ آئندہ بھی اس قسم کے سیمنار منعقد کیے جائیں۔ کشمیر کو مولینائے مرحوم کی ذات سے خاص عقیدت رہی ہے اور ہم تو اس پر فخر کریں گے اگر ہمیں اس طرح کی خدمتیں کرنے کا موقع آئندہ بھی ملتا رہے۔ لیکن مولینا کی ہمہ گیر شخصیت کسی ایک خطے یا ریاست کی چہار دیواری میں مقید ہو کر نہیں رہ سکتی۔ ان کا پیغام عام تھا اور سارے ہندوستان کے لئے تھا اس لئے ہم سے جو کچھ ہو سکے گا وہ تو ہم کریں گے ہی لیکن میں ڈاکٹر کیسکر صاحب سے بالخصوص یہ گزارش کروں گا کہ وہ آل انڈیا ریڈیو پر بھی اس قسم کے اجتماع کرائیں۔ آج جب کہ صوبائی، علاقائی اور لسانی تنگ نظریاں پھر بڑھتی ہوئی نظر آ رہی ہیں اور رجعت پسند ان وطن دشمن رجحانات کو ہوا دے

وداعی تقریر

جناب بخشی غلام محمد صاحب وزیر اعظم صدر جشن بہار کشمیر

جناب ڈاکٹر کیسکر صاحب اور حاضرین!

میرا اس وقت کوئی تقریر کرنے کا ارادہ نہیں تھا، میں تو ایک سامع کی حیثیت سے اور مولینا کے ایک ادنی عقیدت مند کی حیثیت سے اس سیمنار کے آخری اجلاس میں شریک ہوا تھا لیکن زیدی صاحب نے میری تقریر کا اعلان کرکے مجھے اس بات پر مجبور ہی کر دیا ہے کہ میں کچھ نہ کچھ کہوں۔ یہاں آپ حضرات ایسے صاحبان نظر موجود ہیں جنھوں نے مولانائے مرحوم کی حیات اور ان کے کارناموں کا گہرا مطالعہ کیا ہے وہاں میری لب کشائی کچھ عجیب سی معلوم ہو رہی ہے۔ میں تو مولینا کے بارے میں جب کچھ کہنے کا ارادہ کرتا ہوں تو یادوں کا ایک طوفان دماغ میں امنڈ آتا ہے اور آواز شدت غم سے گلوگیر ہونے لگتی ہے۔ میں یہ سوچتا ہی رہ جاتا ہوں کہ کیا کہوں اور کن الفاظ میں کہوں۔

حق تو یہ ہے کہ ایسی جامع الصفات ہستی جس کے آستانے پر نہ صرف ہندستان بلکہ ساری دنیا کے دانشور اور ادیب، علمائے دین اور صحافی، سیاست داں اور خطیب آج عقیدت اور محبت سے سر جھکاتے ہیں۔ اس کے بارے میں چند لفظوں میں کچھ کہنے کی کوشش کرنا دریا کو کوزے میں بند کرنے سے کم نہیں ہے۔ وہ غیر معمولی ذہن اور قوت ارادی لے کر آئے تھے۔ تیرہ چودہ برس کے سن میں نہ صرف یہ کہ دستار فضیلت آپ کے سر پر باندھ دی گئی بلکہ آپ تفسیر و فقہ و حدیث و منطق وغیرہ علوم کا درس بھی دینے لگے۔ پندرہ برس کے سن میں اخبار کے ایڈیٹر ہوئے اور ابھی پورے بیس برس کے بھی نہ ہوئے تھے کہ ہندستان کے سیاسی، علمی اور صحافتی پلیٹ فارموں پر آپ کے نام کی دھوم مچ گئی۔ اس کے بعد کم و بیش نصف صدی تک آپ ہندستان کی سیاسیات پر ایک عظیم قائد کی حیثیت سے چھائے رہے۔ یہ زمانہ ہماری تحریک آزادی کا اہم ترین دور رہا ہے اور اس میں کوئی بڑی تحریک اور کوئی اہم مرحلہ ایسا نہیں تھا جس کی تشکیل اور ترویج میں

اختتامیہ

جناب ڈاکٹر بی۔ وی کیسکر صاحب وزیر اطلاعات و نشریات، حکومت ہند

حضرات!

آج اس سیمینار کے دوران میں جو یہاں ایک ہفتہ سے ہو رہا تھا مولانا مرحوم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر جو پُر از معلومات اور بصیرت افروز تقریریں اور مباحثے ہوئے ہیں ان سے بلا شبہ ان کی گوناگوں اور ہمہ جہات شخصیت پر بھرپور روشنی پڑی ہے۔ جیسا کہ ہمارے بیشتر مقرروں نے بتایا جس میدان میں بھی مولانا نے قدم بڑھائے ان کے ہاتھ رہا۔ یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ایک عظیم رہنما تھے۔ میں ان سب کے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا، آپ نے یہاں تفصیل سے ان پر بحث کی ہے۔ مجھے تو صرف یہ کہنا ہے کہ ایسی ہی جامع صفات و کمالات کی حامل شخصیتیں حقیقی معنوں میں عظیم قائد اور رہنما بنتی ہیں۔ قائد صرف سیاست داں ہی نہیں ہوا کرتے۔ اگر کوئی شخص واقعی ملک کا قائد بننا چاہتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی عظیم ہو اور مولانا انھیں معنوں میں عظیم تھے۔ ہندوستان میں بڑے بڑے قائد گزرے ہیں۔ ہندو بھی، مسلمان بھی۔ ان میں سے بیشتر کا اپنا علیحدہ میدان تھا جس میں وہ یگانہ تھے۔ لیکن ان میں سے چند ہی ایسے تھے جو اس پائے کے قائد کہے جا سکتے ہیں جس پائے کے مولانا تھے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ زندگی کے مختلف شعبوں میں عظمت کے مالک تھے اور اگر وہ چاہتے تو اپنے مخصوص میدان میں بھی ویسا ہی مستقل نقش قائم کرتے جیسا سیاسیات یا عام قومی زندگی میں انھوں نے قائم کیا۔ یقیناً مولانا کا شمار اس ملک کے ان عظیم رہنماؤں میں ہو جنھوں نے ہمیں ایک مخصوص انداز فکر عطا کیا اور ایسی شاہراہ پر چلایا جس پر گامزن ہو کر ہم نے آزادی حاصل کی اور جنھوں نے ایک نئے اور عظیم ملک کی بنیاد رکھی۔

اس موقع پر میں ان علمی بحثوں میں نہیں پڑنا چاہتا جو آج اٹھائی گئیں مثال کے طور پر یہ کہ ایک وقت تھا جب مولانا ایک مخصوص مکتب خیال سے متاثر تھے، پھر بعد میں ان کے افکار و خیالات بدلے

رہے ہیں اسکی ضرورت ہے کہ ہم اپنے ان عظیم قائدین کی زندگیوں سے سبق لینے کی کوشش کریں جنھوں نے اتحادِ قوم و وطن کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی سے بھی گریز نہیں کیا۔ میرے خیال میں مولانا آزاد کا سب سے بڑا پیغام یہی تھا کہ اگر ہمیں ایک قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا، پڑھنا اور ترقی کرنا ہے تو ہمیں تمام چھوٹے چھوٹے اختلافات کو ایک دم بھول جانا پڑے گا۔ اختلافات کہاں نہیں ہوتے۔ نظریوں کا ٹکراؤ بھی جمہوریتوں میں لازمی ہے لیکن یہ سب اسی وقت تک مناسب ہو جب تک قومی یگانگت پر آنچ نہ آئے۔ طرزِ فکر، بود و باند اور لباس و آرائش، زبان و آب و ہوا کے چھوٹے موٹے اختلافات پر ناک بھوں چڑھانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ ہمارے قومی کلچر کی رنگا رنگی اور بوقلمونی ہی کے مظاہر ہیں جو کثرت میں وحدت کے جلوے دکھاتے ہیں اور حقیقتاً ہماری قومی عظمت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ صحیح قومیت یہی ہو کہ ہم ان اختلافات کو بیگانوں نہیں یگانوں کی نظر سے دیکھیں اور ان سے ایک قومی لگاؤ محسوس کریں اور انھیں اپنائیں۔ اس کے لئے ہمارے ادب اور کلچر میں روایات موجود ہیں یہ کوئی نیا پیغام نہیں ہے۔ حافظ نے کہا تھا ؂

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ

چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

سیاست کے میدان میں جب اس شعر کو منطبق کیجئے تو اس کا مفہوم اسکے سوا کیا ہوگا کہ اختلافات کو ہوا دینے والے فسانہ پرست اور اتحاد پر جانیں چھڑکنے والے حقیقت پرست ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے قومی آئین نے سکولرڈموکریسی کو اتنی اہمیت دی۔ یہ سیمنار خود ہماری سکولرڈموکریسی کی ایک اچھی مثال ہے آج اس پلیٹ فارم پر اور سامعین کی صفوں میں ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی شمال و جنوب اور مشرق و مغرب کے رہنے والے جمع ہیں اور سب یک زبان ہو کر اس عظیم المرتبت شخصیت کو خراجِ تحسین ادا کر رہے ہیں جو ہمارے ملک میں سکولرڈموکریسی کے اہم نقیبوں میں سے ایک تھا۔

میں آخر میں ایک بار اور عالموں، ادیبوں اور ساتھیوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے اس سیمنار کی کامیابی میں منتظمین کا ہاتھ بٹایا اور دور دراز کے سفر کی زحمتیں برداشت کیں۔ خدا حافظ۔

ملک کی آزادی کے لئے جد وجہد کے ساتھ ساتھ انھوں نے دہری لڑائی لڑی، بیک وقت دو محاذوں پر جنگ کی۔ یہ جنگ وہ اپنے مخصوص پُر وقار انداز میں لڑے، یہی سب سے بڑا نذرانۂ عقیدت ہے جو ہم مولٰنا ابوالکلام آزاد کو پیش کر سکتے ہیں۔ مولٰنا صاحب، جیسا کہ زیدی صاحب نے کہا، کئی دہائیوں تک ہمارے ملک کے مسلم الثبوت لیڈر رہے۔ ہندوستان کے ہر فرقے اور ہر طبقے میں ان کے معتقد اور مداح موجود ہیں۔ یہی انکی عظمت کا ثبوت ہے اور اس کا اعتراف ہی میری سب سے بڑی نذر عقیدت ہوگی۔ میری نظر سے ایک ہندو یا سکھ ایسا نہیں گزرا جو مولٰنا ابوالکلام آزاد کے پاس صلاح و مشورے کے لئے گیا ہو اور غیر مطمئن یا بددل واپس آیا ہو۔ کیا مسلمان کیا ہندو، کیا سکھ غرض سبھی کو ان پر کامل اعتماد اور پورا بھروسہ تھا۔ کسی مسلک کے رہنما کے لئے اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے۔ جب کوئی شخصیت اپنے ملک کے تمام فرقوں میں اس طرح کا اعتماد حاصل کرلے تو وہ حقیقتاً قائد کا وہ درجہ حاصل کر لیتی ہے جس کی ہم سب کو پیروی کرنی چاہیئے اور میرے خیال میں مولٰنا صاحب کا مستقل کارنامہ یہی ہے۔

وہ عظیم نصب العین جو انھوں نے ہمارے سامنے رکھا اور جس کے حصول کے ہم سب آرزومند ہیں اسکی پیروی ہمیں مذہب کی پابندی کرتے اور اپنے فرقے سے وابستہ رہتے ہوئے کرنی چاہیئے۔ جب قومی مسائل درپیش ہوں تو اُس وقت ہمیں فراخدلی کے ساتھ سوچنا اور وسیع نقطۂ نظر اختیار کرنا چاہیئے۔ ہمارے لئے ملک سے وفاداری اتنی ہی ضروری ہے جتنی فرقے اور مذہب سے۔ ملک سے وفاداری اور فرقے یا مذہب سے وفاداری میں کوئی تصادم نہیں ہے کیونکہ یہ ایک ساتھ جیتے اور ایک ساتھ ترقی کرتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ ان میں سے ایک ترقی کرے اور دوسرا ترقی نہ کرے کیونکہ اگر ملک کے کسی فرقے کو خواہ چھوٹا ہو یا بڑا نقصان پہنچے گا تو اس کا اثر ملک پر یقیناً پڑے گا۔ مثلاً ہندوستان کے مسلمانوں کو اگر نقصان پہنچتا ہے تو ہندوستان ترقی نہیں کرسکتا۔ ترقی اسی وقت ممکن ہے جب ہم یہ عالی حوصلگی اور وسیع نقطۂ نظر اپنے اندر پیدا کریں کہ ہمارے ملک کے ہر فرقے اور ہر طبقے کو ایک ساتھ رہنا اور بھائی چارے کی زندگی بسر کرنا ہے۔ بلاشبہ یہ مولٰنا صاحب ہی کا فیض ہے کہ ہم نے اس اندازِ نظر کو قبول کیا ہے۔

ہندوستان میں بڑے بڑے مسلمان رہنما گزرے ہیں جیسے مرحوم حکیم صاحب یعنی حکیم اجمل خاں صاحب،

اور پھر وہ ان پر اٹل ہو گئے۔ ایسا ہو سکتا ہے لیکن یہ صحیح ہے یا غلط یہ ایسی چیز ہے جس کے لئے تفصیلی چھان بین کی ضرورت ہے۔ بہرحال اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ مولنا کی زندگی کا بیشتر حصہ وہ ہے جس میں وہ اس متحدہ قومیت کے نقیب رہے جس میں ہر مذہب و ملت کے لوگ رواداری اور بھائی چارے کی زندگی بسر کریں اور ملک کے اٹل وفادار بنیں۔ یہ اس نظریے سے یکسر مختلف ہے جو اُس وقت "دو قومی نظریہ" کہلاتا تھا اور بعد میں مسٹر جناح جس کے سب سے بڑے علمبردار بن گئے تھے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مسٹر جناح اس "دو قومی نظریے" کے موجد تھے۔ یہ نظریہ تو پہلے ہی عالم وجود میں آ چکا تھا۔ البتہ یہ اس کے بڑے نشان اور مولنا اس کے سب بڑے مخالف تھے اور آخر تک وہ اس پر مضبوطی سے جمے رہے۔ اسکے باعث مولنا کو ہر طرح کی ذلت، تضحیک اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے یہ سب کچھ کسی سیاسی مصلحت اندیشی کی بنا پر برداشت نہیں کیا بلکہ وہ پورے خلوص کے ساتھ اسے صحیح سمجھتے تھے۔ مجھے اس مسئلے اور متعلقہ مسائل پر مولنا سے کئی بار تبادلۂ خیال کا شرف حاصل ہوا اور میں نے محسوس کیا کہ ان کا عقیدہ تھا کہ نہ صرف ہندستان بلکہ دنیا کے تمام ملکوں کے لئے اگر کوئی صحیح راستہ ہے تو یہی ہے۔ دنیا کی تاریخ کا اور نہ صرف یورپ اور امریکہ بلکہ اسلامی ممالک کی تاریخ کا جو وسیع علم انھیں تھا اس نے انھیں پورے طور پر مطمئن کر دیا تھا کہ اگر کوئی ملک موجودہ دور میں پنپنا اور آج کی دنیا میں ترقی کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے واحد اور منطقی راستہ یہی ہے اور ایک آزاد ملک کے شہری کے لئے اس کے سوا دوسرا معقول رویہ ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ محسوس کرتے تھے اور کئی بار انھوں نے مجھ سے اس کا اظہار بھی کیا کہ اگر کل ہم ہندوستان کے لئے دو قومی نظریے کو درست تسلیم کرلیں اور بالفرض اس کا اطلاق بھی یہاں کرنا چاہیں تو دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی ہمیں ایسا ہی کرنا ہوگا۔ پھر نتیجہ اس کا کیا ہوگا؟ اس کا نتیجہ دنیا کی تباہی و ہلاکت کے سوا اور کچھ نہ ہوگا، اس لئے اس کا برقرار رکھنا ہندستان ہی نہیں بعض اسلامی ملکوں کے لئے بھی ممکن نہیں۔ اس کا واحد نتیجہ ایک ملک میں بسنے والے مختلف فرقوں کی تقسیم ہوگی، ایسی تقسیم جو اس ملک کی تاریخ کے کسی نازک مرحلہ پر خانہ جنگی اور استیصال کا سبب بن جائیگی۔ اسی لئے وہ اس نظریے کے مخالف اور اس سے برسر پیکار رہے۔

واضح اور روشن ہوتے جائیں گے۔ ہندوستان اور دنیا کے لئے مولانا نے جو کچھ کیا ہے، جس جس طرح تاریخی شعور ہم میں تجزیہ و تحلیل کی اہلیت پیدا کرے گا وہ سامنے آتا جائے گا۔

ڈاکٹر انصاری، دہ علی برادران۔ لیکن میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان سب میں مولانا ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ وہ صرف ایک عظیم عوامی لیڈر ہی نہیں تھے بلکہ ایک جید عالم اور متحدہ قومیت کے زبردست حامی بھی تھے۔ اسکے علاوہ ان کی ذات اور بھی بہت سے اوصاف و کمالات کی حامل تھی جن پر آپ نے ان مذاکرات کے دوران میں روشنی ڈالی ہے۔ اس لحاظ سے میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ سب سے ممتاز اور منفرد تھے۔ وہ ان چند منتخب ہستیوں میں تھے جنھوں نے حقیقتاً اس ملک کی قومی تحریک کی تشکیل کی حصول آزادی کے بعد ہمیں ایک امتیازی شان بخشی اور ایک ایسے مخصوص راستے پر ہماری رہنمائی کی جس پر ہم سب چل رہے ہیں۔ یہ وہ راستہ ہے جس نے بین اقوامی دنیا میں ہمارے لئے ایک معزز جگہ پیدا کر دی ہے جو کسی اور ملک کو صرف دس سال کی آزادی میں حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ ہندوستان کو آج جو مقام حاصل ہے وہ ہمارے عظیم رہنما اور وزیر اعظم کی بدولت ملا ہے۔ اس میں مولانا کا بھی بڑا حصہ ہے جو ہمارے محبوب رہنما اور وزیر اعظم کے پرانے رفیق، سچے دوست اور شریک کار تھے۔ میرے خیال میں سب سے بڑی نذر عقیدت ان کے لئے یہی ہوگی کہ ہم نہ صرف ہندوستان کی جنگ آزادی کے مجاہد بلکہ آزاد ہندوستان کے بانی اور معمار کی حیثیت سے ان کی یاد دلوں میں تازہ کرتے ہوئے ان کے نقش قدم پر چلیں۔

کانگریس پارٹی جس کے مولانا مسلسل کئی دہائیوں تک لیڈر رہے۔ اس کے ایک کارکن کی حیثیت سے مجھے متعدد بار اُن سے ملنے کا اتفاق ہوا اور سب سے زیادہ جس چیز نے مجھے متاثر کیا وہ بحیثیت انسان ان کی عظمت تھی۔ جب بھی ان سے کوئی ملتا یہ ہرگز محسوس نہ کرتا کہ وہ ایک قائد یا لیڈر کی حیثیت سے مل رہے ہیں۔ ان میں عام انسانوں کی سی انسانیت، ہمدردی اور رواداری تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک برگزیدہ شخصیت کے مالک تھے۔ ان سے ملتے جاتے تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ ہم کسی شاہی دربار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہی وہ قدرتی عظمت، جلال اور شاہانہ انکسار تھا جو ہر شخص کو متاثر کر دیتا تھا۔ لیکن یہ کسی سلطان کا موروثی جاہ و جلال نہیں تھا جو طاقت کے ذریعہ حاصل کیا گیا ہو بلکہ یہ طبعی عجز و انکسار کا نتیجہ تھا۔ مولانا کی وفات نے ہمارے عہد کی ایک عظیم شخصیت ہم سے چھین لی ہے اور اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا ان کے صفات و کمالات